جنوری ۱۹۸۵ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

قیمت سالانہ: چالیس روپے

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراطِ مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" -

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول - اسلام کا نظامِ حکومت - تاریخ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" - تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر -

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا -

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت - [illegible] کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

ایڈیٹر
سعید احمد اکبرآبادی

برہان

معاون ایڈیٹر
عمیدالرحمن عثمانی

سالانہ چندہ
چالیس روپے

قیمت فی پرچہ
تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۵ | ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ مطابق جنوری ۱۹۸۵ء | شمارہ ۱

عمیدالرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

پاکستان میں ریفرنڈم اور ہندوستان میں پارلیمنٹ الیکشن دونوں چند دنوں کے فصل سے آگے پیچھے ہوئے اور دونوں کا نتیجہ وہی نکلا جو ارباب نظر کے نزدیک پہلے سے یقینی تھا، پاکستان میں جو ریفرنڈم ہوا اس کا طریقہ صحیح تھا یا غلط اس بارے میں کافی اختلاف ہے لیکن بہرحال جس طرح بھی ہوا اس کا نتیجہ لازمی طور پر وہی ہوا جو ہونا تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام ہی اس غرض سے ہوا تھا کہ وہاں اسلامی نظام حکومت رائج ہوگا، لاکھوں انسانوں نے جو قربانیاں دیں وہ اسی مقصد کے لیے تھیں۔ اس بناء پر جب یہ پوچھا جائے کہ پاکستان کے مسلمان اسلامی نظام چاہتے ہیں تو پھر کسی مسلمان، کے لیے یہ کس طرح جائز ہوسکتا ہے کہ وہ اسلامی نظام نہیں چاہتا۔ ریفرنڈم میں اسلامی نظام کے حق میں ووٹ دینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ جنرل ضیاء الحق کی صدارت پر متفق ہیں۔ چنانچہ ریفرنڈم کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنرل ضیاء الحق پانچ سال کے لیے اور صدر منتخب ہوگئے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک کسی حکومت نے اسلام کے لیے وہ کام نہیں کیا تھا جو جنرل ضیاء الحق نے کر دکھایا۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی صدارت سے پہلے پاکستان کا چہرہ غیر اسلامی تھا۔ انگریزی تہذیب کا اس درجہ غلبہ تھا کہ دفتروں میں اور حکومت کے محکموں میں وضع قطع، انگریزی زبان میں بولنا، اردو سے اجتناب کرنا ایک عام بات تھی۔ لوگ نماز روزے کی پابندی نہیں کرتے تھے اور غیر اسلامی افعال و اعمال کا چرچا عام تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے آکر اس صورت حال

کو بالکل بدل دیا۔ اس کے علاوہ ذاتی اور شخصی زندگی میں جنرل ضیاء الحق ایک کٹر مذہبی اور دیندار شخص ہیں، اس کا اعتراف ہر مخالف اور موافق بھی کرتا ہے، اس بناء پر عوام کے لیے جنرل ضیاء الحق کے حق میں ووٹ دینا ذرا دشوار نہ تھا، لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ ملک میں اب بھی استحکام پیدا نہیں ہوگا اور جو مخالف طاقتیں ہیں وہ اب بھی اپنا کام کرتی رہیں گی۔ اس کے حل کی صورت میں بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ آئندہ جنرل الیکشن جو مارچ ۱۹۸۵ء میں ہونے والے ہیں ان کو جمہوریت کے اصول پر کرایا جائے اور اس میں کسی قسم کی کوئی دھاندھلی نہ دکھائی جائے۔

ہندوستان میں پارلیمنٹ کا الیکشن بڑے زور وشور سے ہوا اور اندرا کانگریس نے ۵۱۵ ممبروں کے ہاؤس میں ۴۰۰ سے اوپر نشستوں پر قبضہ کرکے پارلیمنٹ کے اب تک کا ریکارڈ توڑ دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ سوائے اندرا کانگریس کے مخالف پارٹیوں میں سے کوئی ایک آل انڈیا پارٹی بھی ایسی نہیں ہے جس پر عوام اعتماد کرسکیں۔ ان لوگوں کے سامنے نہ کوئی نصب العین ہے اور نہ ان لوگوں نے بے غرض خدمتِ ملک وقوم کا کوئی واضح ثبوت دیا ہے اور تھوڑا بہت ان پر رہا سہا جو اعتماد ہوسکتا تھا وہ جنتا دور کے قیام اور دو سال کے بعد ہی اس کے زوال سے ختم ہوگیا۔ اس کے بعد بھی ان لوگوں کو ہوش نہیں آیا اور ان میں آپس میں جو اختلافات تھے وہ برابر بڑھتے ہی رہے۔ اس کے علاوہ اندرا گاندھی کے نہایت سفاکانہ قتل نے ملک وقوم کی آنکھیں کھول دیں، وہ سمجھ گئے کہ انتشار پسند طاقتوں کی جڑیں کتنی گہری ہیں اور وہ ملک کی سالمیت کے لیے کس درجہ خطرناک ہیں، اس لیے انھوں نے پورے عزم وقوت سے فیصلہ کرلیا کہ ان انتشار پسند طاقتوں کو کچلنے کے لیے ضروری ہے کہ اندرا کانگریس کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور طاقتور بنایا جائے، چنانچہ یہی ہو۔ راجیو گاندھی نے وزیر اعظم بننے

کے بعد سے اب تک جو کارنامے انجام دیے ہیں اور جو بیانات ان کے نکلے ہیں ان سے بہت کچھ توقعات پیدا ہوئی ہیں کہ وہ ایک کامیاب اور فعّال وزیر اعظم ثابت ہوں گے جو باتیں کم کریں گے مگر کام زیادہ کریں گے۔ خدا کرے یہ توقع صحیح ثابت ہو۔

افسوس ہے خاکسار راقم الحروف کی طویل علالت کی وجہ سے جس کا آخری سبب یرقان ورمی ہے چند ماہ سے راقم برہان کی ادارت کے فرائض کماحقہٗ انجام نہیں دے سکا ہے۔ معالجوں کی سخت تاکید ہے کہ میں نوشت وخواند کا ہرگز کوئی کام نہ کروں اسی طرح چلنے پھرنے کی ممانعت بھی کردی گئی ہے۔ یہ میری بیماری تو خیر تھی ہی جو اللہ کے فضل وکرم سے روز بروز دور ہو رہی ہے اور صحت ترقی کر رہی ہے، ایک اور مصیبت یہ آپڑی کہ محترمہ بھابھی صاحبہ (یعنی اہلیہ محترمہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ) جو کم وبیش گذشتہ ۱۸ برس سے مرضِ فالج سے صاحبِ فراش ہیں اب گذشتہ ڈیڑھ ماہ سے ان کی حالت سخت تشویشناک ہے جس کی وجہ سے پورا گھر بے حد پریشان ہے اور اس کی وجہ سے عزیزم میاں عمید الرحمٰن عثمانی کو موقعہ نہیں مل رہا ہے کہ وہ اپنے دفتری فرائض حسبِ معمول باقاعدگی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ اس بنا پر برہان کی اشاعت وقت پر نہیں ہو سک رہی ہے۔

قارئینِ برہان سے درخواست ہے کہ وہ محترمہ بھابھی صاحبہ کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حالت قابلِ اطمینان بنائے اور ان کو شفائے کاملہ حاصل ہو۔

خداپرستی اور مادیت کی جنگ

(مسلسل)

سید کاظم نقوی ریڈر شعبۂ دینیات شیعہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

یہ اَن دیکھا خدا کیسا؟

خدا کے ماننے والوں کے خلاف کہ آخر آدمی کیسے ایسی ذات کے وجود کو مان لے جسے اپنے حواس کی طاقتوں میں سے کسی کے ذریعہ محسوس نہیں کیا ہے؟ خدا کو موجود کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے لیے جسم نہیں ہے، وہ کسی گھر میں نہیں رہتا، وہ کسی زمانے میں محدود نہیں ہے، اس کا کوئی انگ نہیں ہے۔ بتائیے کہ اس طرح کی نرالی اور انوکھی ذات کے تسلیم کرنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ ہم صرف ایسی چیزوں پر ایمان لا سکتے ہیں جنھیں اپنے احساس کی قوتوں کے ذریعہ محسوس کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خداپرست طبقہ جس چیز کو خدا کے نام سے مانتا اور یاد کرتا ہے وہ ان کے دماغوں سے باہر کوئی موجود نہیں ہے۔

مذکورہ بالا اعتراض نیا نہیں پرانا ہے۔ مدتیں گزر گئیں کہ وہ بحث و گفتگو کا مرکز بنا ہوا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صدر اسلام میں یہی اعتراض ائمۂ اہل بیتؑ کے سامنے کیا گیا اور انھوں نے اس کا جواب دیا، لیکن بیسویں صدی کے مادہ پرست

وہی بات الفاظ بدل کر یوں کہتے ہیں۔

"ہم بس ایسی چیز کے وجود کو مانتے ہیں جو سائنس کے ذریعہ ثابت ہو
مابعد الطبیعہ موجودات جیسے خدا، روح اور فرشتوں کا وجود
سائنس نہیں بتاتا، ہم ہرگز کسی ایسی چیز ماننے کے لیے
تیار نہیں ہیں جسے سائنس ثابت نہ کرے۔"

غالباً تعلیم یافتہ لوگ جانتے ہیں کہ آج کل کی اصطلاح میں سائنس کا لفظ "فلسفہ" کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد وہ معلومات ہیں جن کا تعلق نیچرل موجودات کی ظاہری ساخت اور ان کے اثرات سے ہے۔ ان نیچرل علوم میں سے ہر ایک میں کسی ایک خاص چیز یا بہت سی چیزوں کے حالات کی بابت گفتگو کی جاتی ہے۔ لیکن "فلسفہ" یعنی ایسے ہمہ گیر عمومی اصول و قوانین کے بارے میں بحث و گفتگو جن کے دائرۂ حکومت میں اس دنیائے وجود کی تمام چیزیں یا کم از کم اکثر و بیشتر چیزیں داخل ہیں۔ ان کے درمیان اسباب و نتائج ہونے کے لحاظ سے جو روابط اور تعلقات پائے جاتے ہیں ان کا نمایاں اور واضح کرنا سائنس کا کام ہے۔ خلاصہ یہ کہ فلسفہ اور سائنس کے درمیان دو حیثیتوں سے فرق ہے۔ ایک موضوع بحث کے عمومی اور ہمہ گیر ہونے کے لحاظ سے، دوسرے علت و معلول کے جنبوں کی طرف توجہ کے لحاظ سے، مثلاً جسم انسانی اور اس کے اعضاء و جوارح کے کام کرنے کے ڈھنگ سے بحث ایک علمی بحث ہے، لیکن جانداروں کے قسموں کے اسباب سے بحث ایک فلسفی بحث سمجھی جائے گی۔

بہر حال مادہ پرست کہتے ہیں کہ نیچرل سائنس کے راستہ سے خدا اور غیر مادی دوسرے موجودات کے وجود کو نہیں ثابت کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ آج کل کے علوم نے اپنی ارتقائی رفتار کے دوران میں بہت سے موجودات کو ہمارے لیے واضح اور نمایاں کر دیا ہے، لیکن اب تک وہ کسی ایسے موجود کو نہیں بتا سکے ہیں جو غیر مادی ہو۔ علمی نقطۂ نظر سے اس

قسم کی چیزوں کا موجود تسلیم کرنا غیر ممکن یا غیر علمی ہے۔

یہ اعتراض بھی کئی رخوں سے غلط ہے۔

وہی مرغے کی ایک ٹانگ!

مادہ پرستوں کے انکارِ خدا کے جو اسباب بیان کئے گئے وہ سب مذکورۂ بالا اعتراض میں جھلک رہے ہیں۔ سائنسدانوں کا علمی غرور، تمام حقیقتوں کو سائنس کے زیرِ حکومت واقتدار مان لینا، سائنس کے ترازو، مشاہدے اور تجربہ کے ذریعہ ہر چیز کا تولنا، سوچنے اور سمجھنے کے ذرائع کو مادی اسباب میں محدود قرار دیدینا، یہ تمام باتیں اس اعتراض کے پس منظر میں ہیں۔

مادہ پرست طبقہ کی بارگاہ میں ہماری عرض ہے کہ سرکار والا! سائنس کی کارگذاری کا دائرہ محدود ہے یا غیر محدود؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب مثبت ہے، کیونکہ نیچرل سائنس کی قلمرو میں بس وہی محدود، مادی موجودات ہیں۔ اس بنا پر ایسی چیز مادی وسیلوں سے نہیں حاصل ہوسکتی جو غیر مادی اور غیر محدود ہو۔

بنیادی طور سے خدا اور دوسرے غیر مادی موجودات سائنس کے حدود سلطنت سے باہر ہیں۔ جو چیز مادے کے حدود سے خارج ہو اس کے متعلق یہ آرزو نہ کرنا چاہیئے کہ وہ کبھی مادی ذرائع سے معلوم ہو گی جس طرح خود نیچرل زندگی کے مختلف شعبوں میں سے ہر ایک کے لیے مخصوص آلات اور وسائل ہیں۔ ایک علم کے آلات دوسرے علم سے متعلق اشیاء کی جانچ کے واسطے غیر مفید ہیں۔ مطالعاتِ فلکیہ، جانداروں کی جسمانی تشریح، جراثیم شناسی میں ہر ایک کے آلات دوسرے علم کے آلات سے مختلف ہیں۔

یہ ہمارے وسیع النظر سائنسدان ہرگز اجازت نہیں دیں گے کہ ایک ستارہ شناس ماہرِ فلکیات سے کہا جائے کہ فلاں بیماری کے جراثیم کو اپنے فلکیاتی آلات سے ثابت کرو۔ یونہی جراثیم شناسی کے شعبہ کے ماہر سے یہ فرمائش غیر معقول ہے کہ ستارۂ مشتری

کے چاندوں کا انکشاف اپنے جراثیم شناسی کے ذرائع سے کرو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین علوم میں سے ہر ایک اپنے شعبہ کی چیزوں کے متعلق اپنے وسائل و آلات سے تحقیق کر سکتا ہے، وہ اپنے دائرے سے باہر چیزوں کے بارے میں کسی قسم کا محققانہ اور ذمہ دارانہ اظہارِ خیال نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر ہم کیونکر سائنس کو حق دیتے ہیں کہ وہ مادّے اور مادیات کے حدود سے باہر چیزوں کی بابت کوئی فیصلہ کرے حالانکہ سائنس کے دائرۂ حکومت میں صرف نیچر اور اس کے اثرات وخصوصیات ہیں۔

ایک سائنسداں کو بس اتنا کہنے کا حق ہے کہ چونکہ یہ میرے دائرۂ تحقیقات سے باہر ہیں، چونکہ میں اپنے مخصوص ذرائع کی مدد سے ان کی بابت اطلاع نہیں حاصل کر سکتا لہٰذا میں سکوت کرتا ہوں۔ میں اس قسم کی چیزوں کا وجود نہ مان سکتا ہوں اور نہ ان کا انکار کر سکتا ہوں۔

فلسفۂ حسی کے موحدین میں ایک اہم شخصیت اگسٹ کمٹ (Auguste Comte) کی ہے۔ ان کی کتاب کا ترجمہ فارسی زبان میں "کلماتی در پیرامون فلسفۂ حسی" کے نام سے ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں یہ منصفانہ عبارت نظر آتی ہے:

> چونکہ ہم موجودات کے آغاز و انجام سے بے خبر ہیں لہٰذا کسی مقدم یا موخر موجود کا انکار نہیں کر سکتے، جس طرح اسے ثابت نہیں مان سکتے، خلاصہ فلسفۂ حسی اپنی مطلق جہالت کی بنا پر ایسے موجودات کے متعلق اظہار خیال سے پرہیز کرتا ہے۔ یوں ہی فرعی علوم کو بھی چاہیے جو فلسفۂ حسی کی اساس ہیں کہ وہ موجودات کے آغاز و انجام کی بابت فیصلہ کرنے سے اجتناب کریں، یعنی ہم خدا کے وجود اور اس کے علم وحکمت کا انکار نہیں کرتے بلکہ نفی و اثبات کے درمیان

اپنی غیر جانبداری کو محفوظ رکھتے ہیں۔"

خدا پرست طبقہ کا بھی یہی مقصد ہے کہ نیچرل سائنس کی عینک سے غیر مادی عالم کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا، وہ خدا جو مادی وسائل اور آلات کے ذریعہ ثابت ہو اصولاً خدا پرستوں کے نزدیک خدا ہی نہیں ہے کیونکہ مادی ذرائع جس چیز کو ثابت کریں وہ مادے اور اس کی خاصیتوں کے دائرے میں محدود ہوگی۔ بھلا وہ چیز جو خود مادی ہو وہ نیچر اور مادے کی خالق کیونکر سمجھی جاسکتی ہے؟

تمام دنیا کے خدا پرستوں کے عقائد کی بنیاد اسی پر ہے کہ خدا مادے اور مادیات سے بالکل منزہ اور مبرا ہے، کسی مادی ذریعہ سے اس کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔

اس بنا پر اس بات کا انتظار فضول ہے کہ ان ترقی یافتہ خوردبینوں اور دوربینوں کے ذریعہ کبھی زمین کی تہوں یا آسمان کی بلندیوں میں خدا کو دیکھا جاسکے گا۔

خدا کی نشانیاں۔

عام طور پر دنیا میں ہر چیز کے پہچاننے کا ذریعہ اس کی نشانیاں ہیں۔ ہم ہر موجود کو صرف اس کی نشانیوں کے ذریعہ پہچان سکتے ہیں، حتیٰ کہ وہ موجودات جنھیں ہم اپنی آنکھوں یا اپنے دوسرے حواس سے محسوس کر رہے ہیں، درحقیقت انھیں بھی ہم نے ان کے آثار کے ذریعہ پہچانا ہے، کیونکہ کوئی موجود بھی بذات خود ہمارے ذہن اور دماغ کے اندر نہیں آتا ہے، ہمارے دماغ کا ظرف موجودات بننا محال ہے۔

مثلاً اگر آپ کسی جسم کی موجودگی کا پتہ آنکھوں کے ذریعہ چلانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے نظر کو اس سمت کی طرف متوجہ کرتے ہیں جہاں اس کی موجودگی کا احتمال ہے۔ روشنی کی کرن اس جسم پر پڑتی ہے، پھر پتلی کے ذریعہ کچھ نورانی کرنیں ایک خاص نقطہ پر جھلکتی ہیں جس کا نام "شبکیہ" ہے۔ اس کے بعد ان کرنوں کو لے کر بھیجہ کے سپرد کر دیتے ہیں اس طرح انسان اس جسم کا پتہ چلا لیتا ہے۔

کبھی کسی جسم کا پتہ آنکھوں کے بجائے ہاتھوں سے چلایا جاتا ہے۔ یہاں کھال کی سطح کے نیچے بچھے ہوئے پٹھے اس جسم سے متصل ہوجانے کی وجہ سے کچھ اطلاعات دماغ کو دیتے ہیں اور انسان اس جسم کا پتہ چلا لیتا ہے۔

ہر جسم کا پتہ اس کی نشانیوں سے یعنی رنگ، آواز اور چھونے کی قوت پر اس کے اثر انداز ہونے کے ذریعہ چلتا ہے۔ کسی وقت وہ جسم خود ہمارے دماغ میں نہیں سماتا۔ اگر اس کا کوئی رنگ نہ ہوتا، اس پر چوٹ پڑنے سے کوئی آواز اس سے نہ نکلتی، اس میں سختی، نرمی، گرمی، سردی نہ ہوتی یا ہمارے پٹھوں میں کوئی عیب اور نقص ہوتا تو کبھی ہم اس جسم کا پتہ نہیں چلا سکتے تھے۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ کسی موجود کے پہچاننے کے لیے بہت سی نشانیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کوئی ایک اثر کافی ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ دس ہزار سال پہلے زمین کے فلاں حصے میں لوگ آباد تھے یا نہیں؟ آباد تھے تو ان کے زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ تھا؟ ان کے رہنے سہنے کا کیا انداز تھا؟ اس مقصد کے لیے کبھی زمین کی تہوں سے کھدائی کر کے نکالا ہوا ایک زنگ خوردہ ہتھیار، ایک ٹوٹی پھوٹی صراحی کافی ہوتی ہے۔ اسی ایک چیز کو سامنے رکھ کر ماہرین وسیع تحقیقات شروع کر دیتے ہیں اسی سے اس خطۂ زمین کے رہنے والوں کے حالات، طرزِ زندگی اور خیالات کا پتہ چلا لیا جاتا ہے۔

جبکہ ہر مادی اور غیر مادی موجود کی شناخت کا ذریعہ اس کی نشانیاں ہیں، جبکہ کسی موجود کے پہچاننے کے لیے اس کی ایک نشانی کافی ہے تو کیا یہ بے شمار موجوداتِ عالم جو حیرت انگیز اسرار و رموز کے مالک ہیں خدا کی معرفت کے واسطے کافی نہیں ہیں؟!

آپ کسی ایک موجود کی شناخت کے لیے ایک نشانی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ایک مٹی کی صراحی ایک زنگ خوردہ ہتھیار کی مدد سے چند ہزار برس پہلے کی انسانی آبادی کے

حالات کا پتہ چلاتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس بے شمار موجودات، بے شمار نشانیاں، غیر معمولی نظام و ترتیب خدا کی معرفت کے واسطے ہے۔ کیا اس کے باوجود سائنسدانوں کا طبقہ خدا کا اقرار نہیں کرے گا؟ دنیا کے جس گوشہ پر نگاہ ڈالیے اس کے علم و قدرت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ کیا پھر بھی نیچرل سائنس کے واقف کار یہی کہیں گے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، اپنے کانوں سے نہیں سنا، اپنے آپریشن کے چاقو کے نیچے یا مائیکروسکوپ کے ذریعہ نہیں مشاہدہ کیا۔ کیا ہر چیز کے وجود کو معلوم کرنے کے بس یہی وسائل ہیں؟

ہمیں کیا کیا دکھائی نہیں دیتا؟

خوش قسمتی سے سائنس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودی ہے۔ خود اس نے ہمارے ہاتھوں میں ایسی چیزیں دیدی ہیں جو الحاد اور مادہ پرستی کے خیال کا قلع قمع کرنے کے لیے کافی ہیں۔

شاید اگلے زمانے میں ایک سائنسدان کہہ سکتا ہو کہ جو چیزیں ہمیں اپنے حواس کے ذریعہ معلوم نہ ہوں گی انھیں ہم نہیں مانیں گے، لیکن آج علوم کی ترقی نے ثابت کر دیا ہے کہ اس دنیا میں ناقابل احساس موجودات کی تعداد ان موجودات کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے جو اب تک محسوس ہو چکے ہیں۔ اس عالم کے دل میں نہ جانے کتنے موجودات ہیں جن کا پتہ انسان احساس کی کسی طاقت کے ذریعہ نہیں چلا سکتا۔ ان کی بہ نسبت ایسے موجودات کی تعداد ایک صفر سے زیادہ نہیں ہے جنھیں معلوم کیا جا چکا ہے۔

نمونہ کے طور پر چند چیزیں آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ فزکس میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمام رنگوں کا سرچشمہ سات رنگ ہیں۔ ان میں پہلا سرخ اور آخری ہلکا نیلا ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں رنگ ایسے ہیں جنھیں ہم محسوس نہیں کر سکتے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ان میں بعض رنگوں کو ممکن ہے

جانور محسوس کر سکتے ہوں۔

اس حقیقت کی وجہ واضح ہے۔ رنگ ہمیشہ روشنی کی لہروں کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ سورج کی روشنی اور دوسرے نور گوناگوں رنگوں سے مل کر بنے ہیں۔ یہ نور گوناگوں رنگوں سے مل کر بنے ہیں۔ یہ نور جب کسی جسم پر پڑتا ہے تو وہ اس کے رنگ کے مختلف حصوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا اور بعض کو واپس کر دیتا ہے، جسموں کے جن رنگوں کو ہم دیکھتے ہیں یہ درحقیقت جسم کے اوپر چمکنے والے نور کا واپس شدہ رنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اندھیرے میں کسی جسم کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ رنگوں کا اختلاف نور کی لہروں کی لرزش کے شدید اور خفیف ہونے کا نتیجہ ہے، یعنی اگر لرزش اتنی شدید ہو کہ اس کی تعداد ایک سیکنڈ میں ۴۵۸ ہزار کروڑ کے عدد تک پہونچ جائے تو اس نور کی کپکپاہٹ سے ہلکا اودا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ روشنی کی تھرتھراہٹ کے ان دو عددوں سے زیادہ اور کم بے شمار عدد ہیں۔ ان سے بے شمار رنگوں کی بھی تشکیل ہوتی ہے جنھیں ہم نہیں دیکھ سکتے۔

۲۔ ہم روشنی کی صرف ان لہروں کو محسوس کرتے ہیں جن کی لرزشوں کی تعداد ۴۵۸ ہزار کروڑ سے ۷۲۷ ہزار کروڑ تک ہو۔ ان دو عددوں سے کم اور زیادہ جو لہریں اور لرزشیں فضا میں موجود ہیں وہ دکھائی دینے کے قابل نہیں ہیں۔

۳۔ ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا اور مانتا ہے کہ مفید اور مضر جراثیم کی تعداد ہم انسانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے لیکن انھیں ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ نہیں معلوم کہ اس دنیا میں ننھے منے کتنے جاندار موجود ہیں جن کا پتہ ابھی سائنس کو نہیں چل سکا ہے۔

۴۔ یقیناً دنیا کے تمام موجودات اور اجسام انہی ایٹموں کے اکٹھا ہونے سے تشکیل پائے ہیں، لیکن ہمیں نہ ایٹم کی عجیب و غریب شکل نظر آتی ہے، نہ اس کی وہ عظیم، غیر معمولی طاقت محسوس ہوتی ہے۔ نہ پروٹونوں کے گرد الیکٹران چکر لگاتے دکھائی

دیتے ہیں۔ یہ ایک ذرۂ غبار جو بمشکل ہماری آنکھوں کو نظر آتا ہے اسے لاکھوں ایٹموں نے مل کر بنایا ہے۔

گذشتہ زمانے میں جو فلاسفر ایٹم کے متعلق گفتگو کرتے تھے ان کی طویل بحثیں ایک خیال آرائی محسوس ہوتی تھیں اس کے باوجود کوئی شخص ان کے نظریات کا انکار نہیں کرتا تھا۔

۵۔ اکثر سائنسدان اقرار کرتے ہیں کہ ایتھر موجود ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ہر جگہ ہے۔ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض اسے تمام موجودات کی اصل مانتے ہیں۔ انھوں نے تصریح کی ہے کہ وہ ایک بے وزن، بے رنگ، بے بُو شئی ہے۔ زمین اور تمام ستاروں میں وہ پھیلا ہوا ہے۔ ہر چیز کے اندر وہ گھسا ہوا ہے۔ کیا ہم خدا پرست ان لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں کہ اگر واقعی ایتھر موجود ہے تو ہماری آنکھوں کو کیوں نظر نہیں آتا؟

۶۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کو ہر طرف سے ہوا گھیرے ہوئے ہے ہر آدمی ہر وقت ہوا کے ایک خول میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اتفاق سے یہ ہوا انتہائی بھاری چیز ہے ہر آدمی کے جسم پر ہر طرف سونے اور جاگنے کے عالم میں سولہ ہزار کلو گرام کا دباؤ اس ہوا کی وجہ سے پڑتا رہتا ہے۔ البتہ چونکہ یہ دباؤ آدمی کے بدن کے اندرونی دباؤ کی وجہ سے بے اثر ہو جاتا ہے اس لیے انسان کوئی تکلیف نہیں محسوس کرتا۔ کیا کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ ہوا بھی وزن رکھتی ہے۔ کیا ہمارے حواس اس بوجھ کو محسوس کرتے ہیں؟

۷۔ یہ ہماری قیام گاہ کرۂ زمین مختلف طرح کی حرکتوں کا مالک ہے۔ ان میں سے ایک اس کی سطح کا عجیب و غریب جزر و مد ہے۔ لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ سطح زمین ہمارے پیروں کے نیچے روزانہ دو مرتبہ تیس سینٹی میٹر ابھرتی اور دبتی ہے۔ کیا

کبھی کسی نے زمین کا یہ دبنا اور ابھرنا محسوس کیا؟ کیا اس جزر مد کی موجودگی کو کوئی نشانی بتاتی ہے؟!

معلوم ہوا کہ کسی چیز کے محسوس نہ ہونے کو اس کے معدوم ہونے کی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایسے غیر محسوس امور بہت ہیں جن سے ہماری دنیا بھری ہوئی ہے اور ہمارے حواس ان کا پتہ نہیں چلا سکتے ہیں۔

ایٹم اور جراثیم کے انکشاف سے پہلے کسی کو حق نہیں تھا کہ ان کے وجود سے انکار کرے۔ یونہی ممکن ہے کہ بہت سے موجودات ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوں۔ اب تک انسانی علم نے ان کا انکشاف نہ کیا ہو، بعد میں ان کے چہرے سے نقاب سرکے۔ ہمارا ضمیر کبھی اجازت نہیں دیتا کہ ان کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق ہم فیصلہ کریں جبکہ ہمارا علم محدود ہے، جبکہ ہمارے حواس ان کا پتہ چلانے سے عاجز ہیں، جبکہ ہمارے اس کی قلمرو بہت تنگ ہے، جبکہ ہماری اطلاع کے ذرائع بہت محدود ہیں ہمیں دنیائے وجود کو ان کے دائرے میں محدود کرنے کا حق نہیں ہے۔

مناسب ہے کہ یہاں اس بات کی تائید کے لیے "کیمیل فلیماریِن" کی ایک عبارت قارئین کرام کے سامنے پیش کر دی جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "لوگ جہالت اور نادانی کی وادی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ انسان کی یہ جسمانی ترکیب اسے بعض حقیقتیں نہیں بتا سکتی۔ یہ حواس پنجگانہ آدمی کو ہر چیز کے متعلق دھوکا دیتے ہیں۔ وہ اکیلی چیز جو انسان کو حقیقتوں تک پہونچاتی ہے عقل و فکر اور باریک بینی ہے۔"

اس کے بعد "کیمیل فلیماریِن" نے ان امور کو شمار کرنا شروع کیا ہے جن کا پتہ چلانے سے حواس عاجز ہیں۔ پھر حواس کے محدود ہونے کو ثابت کر کے لکھتے ہیں:

"نتیجہ یہ نکلا کہ عقل اور آجکل کے علوم کا یہ یقینی فیصلہ ہے کہ ہوا، ذرات کی حرکت

اور دوسری طاقتیں موجود ہیں کہ جنھیں ہم نہیں دیکھتے ہیں اور نہ ان حواس میں سے کسی کے ذریعہ ان کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ اس بنا پر ممکن ہے کہ ہمارے ارد گرد ان چیزوں کے علاوہ کچھ اشیاء موجود ہوں، بعض زندہ چیزیں وجود رکھتی ہوں جنھیں ہم نہ محسوس کر سکتے ہوں۔ میں نہیں کہتا کہ وہ ضرور ہیں، بلکہ کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ موجود ہوں۔ کیونکہ گذشتہ بیانات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن چیزوں کا ہم احساس نہ کریں ان کی بابت ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ نہیں ہیں۔ جبکہ علمی دلیل کے ذریعہ مکمل طور سے یہ ہمارے لیے ثابت ہو گیا کہ یہ ظاہری حواس تمام چیزوں کو ہم پر منکشف کرنے کے واسطے کافی نہیں ہیں بلکہ کبھی ہمیں دھوکا دے کر حقیقت کے خلاف چیزوں کو حقیقت بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہمیں یہ تصور نہ کرنا چاہیئے کہ موجودات کی بس وہی حقیقت ہے جو ہم محسوس کرتے ہیں، بلکہ اس کے خلاف عقیدہ رکھنا چاہیئے۔ ہمیں یوں کہنا چاہیئے کہ ممکن ہے کہ کچھ موجودات ہوں جنھیں ہم نہ محسوس کر سکتے ہوں۔ جیسا کہ جراثیم کے انکشاف سے پہلے کوئی شخص خیال نہیں کرتا تھا کہ لاکھوں جراثیم ہر جسم کے ارد گرد موجود ہیں اور ہر جاندار کی زندگی ان جراثیم کی جولانگاہ بنی ہوئی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ظاہری حواس موجودات کی حقیقت کا پتہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ اکیلی چیز جو باریکیوں سے مکمل طور پر واقف بناتی ہے ہماری عقل و فکر ہے۔"

(منقول از کتاب "علی اطلال المذہب المادی")

غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے

ہماری گذارش سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونا چاہیئے کہ ہم اس کے دعویدار ہیں کہ جس طرح آج کل کے جدید علمی ذرائع سے ایٹم، پروٹون کے گرد الیکٹران کی گردش اور بہت سے

رنگوں کا انکشاف ہو گیا ہے اسی طرح علوم وفنون کی ترقی کے نتیجہ میں آیندہ کچھ دوسری نامعلوم چیزوں کا پتہ چلے گا۔ ایک دن ممکن ہے کہ وہ دنیا بھی مادی اسباب اور ذرائع سے منکشف ہو جائے جو نیچر کے حدود سے باہر ہے۔

یقین رکھئے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ وہی ہے جو پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ جو چیزیں مادے کے علاوہ ہوں انھیں مادی ذرائع سے نہیں معلوم کیا جا سکتا۔ وہ ان کی کارگذاری کے دائرے سے باہر ہیں۔

ہماری گذارش کا مقصد صرف یہ تھا کہ مذکورہ موجودات کے انکشاف سے پہلے ان کا انکار صحیح نہیں تھا، ہم ان کے عدم کو یہ کہہ کر تسلیم نہیں کر سکتے تھے کہ چونکہ ہم انھیں نہیں محسوس کرتے، چونکہ ہمارے مادی ذرائع ان کا پتہ نہیں بتاتے، چونکہ سائنس انھیں نہیں ثابت کرتا، لہٰذا وہ نہیں ہیں، اسی طرح غیر مادی امور کے متعلق بھی اظہارِ خیال نہیں کیا جا سکتا، یعنی ان کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ ابتدا میں ایسے لوگ سکوت کریں گے مگر جب خدا پرستوں کے معقول اور مضبوط دلائل ان کے سامنے آئیں گے تو انھیں اس کائنات کا ایک باشعور خالق ماننا پڑے گا۔

امیر الامراء رئیس الاولیاء

حضرتِ خواجہ عبید اللہ احرار نقشبندیؒ

ایک مطالعہ

(۲)

جناب تقی انور صاحب علوی کاکوروی

تاریخ کی کتابوں سے حضرت خواجہ کے متعلق ہم کو ایسے جستہ جستہ حالات ملتے ہیں۔ آپ کی مکمل سوانح حیات اور ملکی و سیاسی خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہم ملفوظات کا بغور مطالعہ کریں۔ بابر نامہ کی مترجم مسز بیوبرج نے بھی غالباً اسی وجہ سے آپ کے صرف مطبوعہ ملفوظ یعنی "رشحات" کا مطالعہ کیا تھا جو اس کو دستیاب ہوسکا ہوگا۔ اس نے اپنے ترجمہ بابر نامہ میں اس سے جابجا نوٹ بھی لئے ہیں۔ رشحات مطبوعہ صورت میں ۳۶۰ صفحہ سے زائد کی کتاب ہے۔ یہ صرف حضرت خواجہ کا ملفوظ نہیں ہے بلکہ اس میں عام طور پر سلسلۂ نقشبندیہ کے بیشتر بزرگوں کے حالات ہیں۔ ملا فخرالدین علی بن حسین الواعظ الکاشفی (یعنی خلف الصدق مصنف انوار سہیلی) اس ملفوظ کے جامع ہیں، سبب تالیف یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت خواجہؒ کے آستانہ پر آخرِ ماہ ذیقعدہ ۸۸۹ھ اور اوائلِ ماہ ربیع الثانی ۸۹۳ھ میں صرف دو مرتبہ وہ حاضر ہو سکے۔

روزانہ جو کچھ آپ کی زبان سے سنتے اس کو اپنے دماغ میں محفوظ کر لیتے اور گھر آکر لکھ لیتے تھے۔ حضرت خواجہ کی وفات کے بعد اس روزنامچہ کی ترتیب شروع کی تاکہ مفارقت کی تکلیف آپ کی یاد سے کم ہو جائے اور دوسروں کو بھی استفادہ کا موقع ملے مگر یہ ملفوظ اپنی موجودہ حالت میں سولہ برس بعد مرتب ہو پایا۔ چونکہ اصل غرض حضرت خواجہ کے حالات کے بیان سے تھی اس نے بعض بزرگانِ نقشبندیہ کے کرامات و ارشادات کے ساتھ ساتھ بعض خاندانی و دیگر حالات بھی اس میں اضافہ کئے گئے۔ کتاب کے خاتمہ پر ایک فارسی تاریخ بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رشحات تاریخی نام ہے ؎

پابند محاسبانِ سنجیدہ صفات

تاریخِ تمامش ز حروفِ رشحات

۹۰۹ھ

رشحات مطبوعہ میں کتابت کی اتنی زائد غلطیاں ہیں کہ بعض جگہ تو عبارت کا صحیح پڑھنا اور صحیح مفہوم لینا ممکن ہی نہیں۔ میرے پاس رشحات کے دو بہت ہی قدیم خوشخط اور مطلا نسخے موجود ہیں۔ رشحات میں دو اور ملفوظات کا حوالہ ملتا ہے جن سے مؤلفِ مذکور نے مدد لی ہے حضرت خواجہ کے مخصوص خلفاء و اصحاب کے حالات میں حضرت مولانا محمد قاضیؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنفِ رشحات لکھتے ہیں کہ مولانا نے حضرت خواجہ صاحبؒ کے مناقب میں دو کتابیں تالیف کی ہیں ایک کا نام "سلسلۃ العارفین" اور دوسری کا "تذکرۃ الصدیقین" ہے۔ ہر دو کتابیں مطبوعہ نہ ہونے کی وجہ سے نادر الوجود ہیں[۱]۔ راقم الحروف کو وہ دونوں کتابیں

---

[۱] حضرت خواجہ صاحب کے حالات جن جن کتابوں میں دیکھے ان سے علم ہوا کہ سب کا اصل ماخذ مجموعہ "سلسلۃ العارفین و تذکرۃ الصدیقین" ہے۔ حضرت خواجہ صاحب کے خلیفہ و داماد میر عبدالاول نے ایک رسالہ "مسموعاتِ خواجہ عبید اللہ احرار" تحریر فرمایا تھا اس کا بھی ماخذ یہی مجموعہ ہے۔

حضرت مولانا حافظ شاہ محمد مجتبیٰ حیدر صاحب قلندر مدظلہ، نے مطالعہ کے لیے مرحمت فرمائیں نیز یہ حکم دیا کہ ان کو بغور مطالعہ کر کے ایڈٹ کر دو۔ ان کے ہی ہمت اور شوق دلانے پر نیز ان کی ہی اعانت اور علمی مدد سے یہ مختصر مضمون مرتب ہوا۔ چونکہ کتاب پر مصنف کا نام ہے اور کتاب کا نام درج نہیں ہے اس لیے یہ خیال ہوا کہ رشحات سے اس کا مقابلہ کیا جائے رشحات میں حضرت مولانا محمد قاضی عبداللہ کے حالات میں لکھا ہے کہ:

حضرت مولانا محمد قاضی اجلِ اصحاب حضرت ایشان اند و در مناقب و شمائل و خصائص و فضائل آں حضرت کتابہا تالیف کردہ اند مسمّٰی بہ سلسلۃ العارفین و تذکرۃ الصدیقین در آنجا آوردہ اند ...... کہ ابتدائے ملازمتِ من حضرت ایشاں آں بود کہ با طالب علم کرمانی مولانا نعمت اللہ از سمرقند بہ عزیمت ہرات بیروں آمدہ بودیم چوں بدہ شادماں رسیدیم و بواسطۂ گرمی و ہوا توقف کردیم نمازِ دیگر بود کہ حضرت ایشاں رسیدہ بملازمت رفتم پرسیدند از کجائی۔ گفتم از سمرقند۔ بعد ازاں بہ حکایت مشغول شدند۔ وانچہ در خاطر بود ہمہ را اظہار فرمودند ازاں جملہ سخنے بود کہ فقیر را سرگشتہ ساختہ ازیں ولایت می برد آں را بر وجہے اظہار کردند کہ خاطرِ فقیر بجانب ایشاں قوی منجذب شد۔

حضرت مولانا محمد قاضی خواجہ صاحبؒ کے جلیل القدر اصحاب میں ہیں۔ انھوں نے حضرت خواجہ صاحبؒ کے فضائل و مناقب میں دو کتابیں تالیف کی ہیں جن کا نام سلسلۃ العارفین اور تذکرۃ الصدیقین ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ حضرت کی خدمت میں میری حاضری کی ابتدا یوں ہوئی کہ کرمان کے ایک طالب علم مولانا نعمت اللہ کے ساتھ سمرقند سے ہرات جانے کے ارادہ سے ہم نکلے۔ جب شادماں گاؤں پہنچے تو لوہ اور گرمی کی شدت کی وجہ سے ہم رک گئے۔ ظہر کی نماز کا وقت تھا کہ حضرت خواجہ پہنچے۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے پوچھا کہاں سے آرہے ہو؟ عرض کیا سمرقند سے۔ پھر آپ گفتگو میں مشغول ہو گئے اور جو کچھ میرے دل میں تھا سب کا بغیر میرے کہے اظہار فرما دیا۔ منجملہ ان کے ایک بات ایسی تھی جو فقیر کو دربدر

پھرا رہی تھی اس کا اس طرح اظہار فرما دیا کہ
فقیر کا دل آپ کی جانب منجذب ہوگیا۔

تلاشِ بسیار کے بعد اس قلمی ملفوظ میں بعینہٖ یہ واقعہ ان الفاظ میں مل گیا۔

در ابتدائے آں کہ ایں فقیرِ جامع ایں جمع و تالیف بخدمت شریف حضرت ایشاں مشرف شدم آں بود کہ بہ مولانا نعمت اللہ طالب علمے کرمانی از سمرقند بعزیمت ہرات متوجہ شدہ بیروں آمدہ بودیم۔ بقریہ شادماں رسیدیم بمولانا نعمت اللہ گفتم کہ ہوا بغایت گرم است ــــــ لحظہ در باغ حضرت خواجہ توقف کنیم تا ہوا باعتدال شود چناں کردیم نماز دیگرے بود کہ شخصے آمد کہ حضرت خواجہ می آیند توقف کردیم لحظہ بود کہ حضرت ایشاں آمدند بہماں جائے کہ ما بودیم متوجہ ایں کمینہ شدند و فرمودند کہ از کجائی و بہ حکایت مشغول شدند وانچہ بخاطرِ ما بود ہمہ را اظہار کردند۔ از انجملہ (سخنے بود) کہ فقیر را سرگشتہ ساختہ ازیں ولایت می برد آں را بر وجہے کردند کہ خاطرِ فقیر بجانب ایشاں قوی نگراں شد۔

فقیر مؤلف کتاب ہٰذا کی حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری کی ابتدا یوں ہوئی کہ کرمان کے ایک طالب علم مولانا نعمت اللہ کے ساتھ سمرقند سے ہرات جانے کے ارادہ سے ہم نکلے جب شادماں گاؤں پہنچے تو مولانا نعمت اللہ سے میں نے کہا کہ ہوا نہایت گرم ہے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت خواجہ کے باغ میں ہم رک جائیں تاکہ ہوا قدرے کم ہوجائے۔ ظہر کی نماز کا وقت تھا کہ ایک شخص نے آکر بتایا کہ حضرت خواجہ آرہے ہیں۔ یہ سن کر ہم رک گئے۔ اتنے میں آپ آئے اور میری طرف متوجہ ہوکر پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو پھر گفتگو میں مشغول ہوگئے اور جو کچھ میرے دل میں تھا بغیر میرے کچھ کہے اظہار فرما دیا۔ منجملہ ان باتوں کے ایک بات ایسی تھی جو فقیر کو پریشان کیئے ہوئے تھی اور شہر بشہر پھرا رہی تھی۔ اس کا آپ نے اس طرح اظہار فرمایا کہ میرا دل آپ کی جانب مکمل طور پر مائل ہوگیا۔

سوائے چند الفاظ کے تغیر و تبدل کے بعینہ وہی عبارت ہے اس کے بعد حضرت مولانا محمد قاضی جامع ملفوظات کے مزید حالات کی تلاش ہوئی اگرچہ مؤلفِ رشحات نے مختصر حالات لکھے ہیں لیکن اس سلسلے میں چند واقعات بابر نامہ اور صاحبِ "حبیب السیر" کے مطالعہ سے بھی دستیاب ہوئے۔ یہی حضرت خواجہ مولانا محمد قاضی ہیں۔ کیونکہ اس نام کا خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے مخصوص خلفاء و اصحاب میں آپ کے سوا دوسرا نہیں تھا۔

بابر نامہ میں ایک جگہ تو سمرقند کو پہلی مرتبہ چھوڑ کر آنے کے بیان میں شہنشاہ بابر نے لکھا ہے کہ میرے استاد اور پیر حضرت مولانا خواجہ محمد قاضی کے خطوط آئے جن میں سمرقند واپس آنے کی فرمائش تھی اور دوسری مرتبہ اپنے لشکر کے خجند پہنچنے اور دشمنوں کے اندجان پر قابض ہونے کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے بابر لکھتا ہے کہ "آہ دشمنوں نے میرے حضرت خواجہ و مولانا قاضیؒ کو شہید کر ڈالا اور بڑی بے حرمتی سے ان کی لاش قلعہ کے دروازہ پر لٹکائی گئی۔"

ان کا اصل نام عبد اللہ تھا اور یہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے مرید و خلیفہ خاص تھے اور انھیں کے تربیت یافتہ بھی تھے۔ آپ حضرت خواجہ کے آخر عہد میں تو اٹھارہ سال شب و روز خلوت و جلوت میں حاضر رہے ہیں اور حضرت کے حکم سے ہی ان کے حالات اور چشم دید واقعات اور ارشادات قلمبند فرماتے رہے ہیں۔ "گلزارِ ابرار" میں حضرت ملا محمد غوثی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ صاحبؒ جب حقائق و معارف بیان فرماتے تو اصل مخاطب حضرت مولانا محمد قاضی ہوتے تھے۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ولی کامل تھے کیونکہ آپ کے قتل میں سعی و کوشش کرنے والے اور قاتل چند ہی دنوں میں نیست و نابود ہو گئے۔ تاریخ حبیب السیر میں بھی یہ واقعہ اسی نوعیت سے درج ہے۔ جس کے چند الفاظ نقل کئے جاتے ہیں:

خواجہ مولانا قاضی را کہ موسوم بعبید اللہ بود — خواجہ مولانا قاضی جو عبد اللہ کے نام سے

وبدستور معہود در دولت خواہی حضرت پادشاہی سعی می نمود بر در ارک شہید ساختند ...... حالاں کہ آنحضرت از جملہ تربیت یافتگان حضرت ولایت پناہ خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرار بود"	موسوم تھے اور بادشاہ کی خیر خواہی میں ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے قلعہ کے دروازے پر شہید کر دیئے گئے .... حالانکہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے خاص تربیت یافتہ تھے۔

....

تاریخ کی کتابوں سے صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ مولانا محمد قاضی حضرت خواجہ کے جلیل القدر خلفاء واصحاب میں سے تھے۔ ان کا جامع ملفوظات ہونا ہم کو علاوہ "گلزار ابرار" اور "بحر زخار" کے "رشحات" اور اب آپ کے ملفوظات سے معلوم ہوا۔ دوسرے حصہ موسوم بہ "سلسلۃ العارفین" کے ایک حصہ کے خاتمہ پر اس عبارت کا موجود ہونا "وجمع من ھو مقبول ومنظور لحضرت العالی .... المشہور بین الخلائق .... لمولانا محمد قاضی" اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ یہ وہی بزرگ ہیں ان کی شہادت کا واقعہ تذکرۂ "رشحات" میں نہ ہونا باطل ترین قیاس ہے اس لئے کہ "رشحات" کے مرتب کرنے کے وقت وہ یقیناً زندہ تھے جیسا کہ ان کے حالات کی عبارت سے پتہ چلتا ہے۔ شہنشاہ ہند ظہیر الدین نے بابر نامہ بعد کو لکھا ہے۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے ملکی خدمات اور شاہانِ وقت پر اقتدار

مذکورہ بالا ملفوظات سے ہم چند ایسے واقعات نقل کرتے ہیں جو حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ نقشبندی کے ملکی خدمات اور ایسے غیر معمولی محیر العقول اقتدار کا پتہ دیتے ہیں جس سے شاہان وقت بھی آپ سے مرعوب تھے۔ "صلح دادنِ حضرتِ ایشاں سہ بادشاہ مخالف را در یک معرکہ" کی سرخی سے ایک نہایت دلچسپ اور تعجب خیز واقعہ "سلسلۃ العارفین"

سے نقل ہے جس کے جامع (خواجہ مولانا قاضی) خود اس موقعہ پر موجود تھے۔ یہیں اصل قلمی ملفوظ کی عبارت معہ ترجمہ لکھتا ہوں:

واقعہ ملاقات مرزا عمر شیخ محمود خاں چناں بود کہ خبر آمد کہ مرزا عمر شیخ سلطان محمود خاں را بمددِ خود آوردہ و در شاہرخیہ بہم ملاقات کردہ اند۔ مرزا سلطان احمد تہیہ لشکر کردہ بلشکر عظیم متوجہ شدند و حضرت ایشاں را بخود ہمراہ بردند و سخن آں بود کہ حضرت ایشاں را بجہت صلح می برند۔ چہل روز در لشکر مرزا سلطان احمد بودند و در چہل و یکم در آق قورغان از توابع شاہرخیہ است لشکر مرزا سلطان احمد فرود آمدند۔ روزِ دیگر حضرت ایشاں بمرزا سلطان احمد شاہ شدہ گفتند مرا چرا آوردید من خود مردِ جنگی نہ ام اگر جنگ می کردید مرا چرا آوردید و اگر صلح می کنید تاخیر چراست مرا دیگر طاقت آں نماند کہ در میان لشکر شما باشم۔ مرزا فرمودند کہ مارا چہ اختیار است جمیع امور بہ مفوض بہ شما است ہرچہ صوابدید ملازمانست مارا ازاں چارہ نیست بموجب اشارت حضرت ایشاں سوار شدند و فقیر نیز در ملازمت بودم متوجہ شاہرخیہ بدیدن مرزا عمر شیخ و

مرزا سلطان احمد اور مرزا عمر شیخ اور سلطان محمود (شاہانِ وقت) کی ملاقات کا واقعہ

معلوم ہوا کہ مرزا عمر شیخ نے سلطان محمود خاں کو اپنی مدد کے لیے بلایا ہے اور دونوں شاہرخیہ کے مقام پر معہ لشکر موجود ہیں سلطان احمد مرزا بھی بہت بڑے لشکر کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لیے چلے اور حضرت کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا اور یہ ظاہر کیا کہ حضرت کو صلح کے لیے لے جاتے ہیں۔ چالیس روز شاہرخیہ میں قیام رہا، اکتالیسویں آق قورغان میں جو شاہرخیہ کا ایک موضع ہے مرزا سلطان احمد کا لشکر فروکش ہوا۔ دوسرے روز حضرت نے مرزا سلطان احمد نے فرمایا کہ مجھ کو کیوں لائے ہو میں لڑائی کے کام کا نہیں۔ اگر لڑنا ہی تھا تو میرا ساتھ لانا بیکار اور اگر صلح چاہتے ہو تو پھر تاخیر کیوں ہے۔ مجھ کو تمھارے لشکر کے قیام نے پریشان کر دیا ہے اب زیادہ رکنا ممکن نہیں۔ مرزا نے جواب دیا کہ میرا کیا اختیار ہے جو حضور چاہیں

سلطان محمود خاں اشدند مردم خبردار شدہ
باستقبال حضرت ایشاں بہ شاہرخیہ رفتند۔
در راہ التفات از حد بیروں بہ سلطان محمود
خاں نمودند و امر صلح را مقرر فرمودند و کیفیت
آں را نیز تعیین کردند بریں وجہ کہ ہر سہ لشکر
در مقابلہ یکدیگر ایستند و شامیانہ در میانہ برپا
کنند و بادشاہاں در شامیانہ با حضرت ایشاں
نشینند و حضرت ایشاں بہم صلح دہند و عہد و شرط
کنند و آخر روز مراجعت نمایند۔ و اثر التفات
حضرت ایشاں در سلطان محمود خاں ظاہر بود
بسیار متاثر گشتہ بود علی الصباح لشکر مرزا
سلطان احمد بتمامہ سوار شدند و مقرر چناں
بود کہ جلتہ نپوشند و دیگر سلاحہا بردارند و
بعضے پنہانی پوشیدند و ازاں جانب لشکر
سلطان محمود خاں و لشکر مرزا عمر شیخ با سلاح
تمام آمدند و در موضع تن تہتہہ صفہا راست
کردند۔ حضرت ایشاں باز بہ شاہرخیہ رفتند
کہ سلطان محمود خاں و مرزا عمر شیخ را بیارند۔
بعد از زمانے حضرت ایشاں با سلطان محمود
خاں و مرزا عمر شیخ آمدند و لشکر بتمامہ صفہا
کشیدند و در برپا ساختن شامیانہ گفت و شنید

کر سکتے ہیں مجھ کو ذرا بھی دریغ نہ ہوگا۔ چنانچہ
حضرت سوار ہو کر مرزا عمر شیخ اور سلطان محمود
سے ملنے کے لیے شاہرخیہ کی طرف چلے۔
میں (مولانا محمد قاضی) بھی حضور کے ہمرکاب
تھا۔ ان لوگوں کو حضرت کی تشریف آوری
کا علم ہو گیا۔ استقبال کے لیے حاضر ہوئے
اور حضرت کے ساتھ شاہرخیہ کی طرف چلے
راستہ میں حضرت نے سلطان محمود خاں پر
خاص عنایت فرمائی اور صلح کی معاملت کو طے
کر دیا اور یہ قرار پایا کہ تینوں لشکر ایک دوسرے
کے مقابل صف باندھ کر کھڑے ہوں اور
درمیان میں ایک شامیانہ لگایا جائے
جس میں تینوں بادشاہ اور حضرت خواجہ
تشریف فرما ہوں۔ حضرت آپس میں اسی
جگہ صلح کرا دیں اور شرائط کا تعین ہو جائے۔
اس کے بعد سہ پہر تک لشکر کوچ کرے۔
حضرت کی توجہ کا مرزا سلطان احمد پر خاص
اثر طاری تھا اور وہ بہت متاثر تھا صبح تڑکے
مرزا سلطان احمد کا لشکر ساز و سامان سے
تیار ہو گیا۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ سپاہی صرف
جلتہ نہ پہنیں باقی تمام ہتھیار لگا لیں بعض

بسیار واقع می شد۔ ہر فریقے می گفتند کہ
باآں طرف نزدیک ست واین نزاع بہ تطویل
انجامید تاکہ حضرت ایشاں درمیان صفہا
بودند و طہارت نماز پیشیں آنجا کردند۔
وبعد ازاں بہ ایں فقیر گفتند کہ پیش مرزا
سلطان احمد برو وبگو کہ من یک کسم و
ضعف پیری نیز دریافتہ است ایں مجموع
سلاح و آلاتِ حرب شمارا بر پشت خود
رابرداشتہ ام کہ لشکر ہا درہم نمی افتد
نہایت قوت ہمیں باشد دیگر طاقت نماند و
اگر بما اخلاصے دارید گذارید تا شامیانہ را
ہرجا آں مردم خواہند برپا کنند کہ مرا اعتمادے
براں حضرت است شامیانہ ہرجا کہ خواستند
برپا کردند۔ مرزا سلطان احمد بجمعے معین
ازخواص آمدہ درتہِ شامیانہ نشستند۔ بعد
ازاں حضرت ایشاں سلطان محمود خاں و
مرزا عمر شیخ را آوردند بجمعے از خواص
چوں بہ نزدیک شامیانہ رسیدند فرود
آمدند۔ مرزا سلطان احمد از تہِ شامیانہ
باستقبال بیشتر آمدند۔ حضرت ایشاں
اول سلطان محمود خاں پیش آوردند و

نے چھپا کر چلتہ بھی پہن لیا۔ دوسری طرف
سے سلطان محمود خاں اور مرزا عمر شیخ کا لشکر
ہتھیار بند روانہ ہوا اور موضع تل قہقہہ
میں پہنچکر اس نے اپنی صفیں درست کرلیں۔
حضرت پھر شاہرخیہ تشریف لے گئے تاکہ
مرزا عمر شیخ اور مرزا سلطان محمود خاں کو
اپنے ہمراہ لے آئیں۔ بہت دیر بعد آپ
کے ساتھ یہ دونوں بادشاہ آئے۔ اس وقت
لشکروں نے اپنی صفوں کو درست کیا۔
شامیانہ کے نصب کرنے میں اختلاف ہوگیا
یہاں تک کہ بات بڑھ گئی حضرت دونوں
لشکروں کے درمیان تشریف فرما تھے آپ
نے ظہر کا وضو وہیں کیا پھر میری طرف مخاطب
ہوکر فرمایا کہ مرزا سلطان احمد سے میری
طرف سے جاکر کہو کہ میں اس بڑھاپے میں
تمہارے تمام لشکر اور ہتھیاروں کا بوجھ
اٹھائے ہوئے ہوں۔ یہی وجہ ہے جو لشکر
تباہ نہیں ہوجاتا، اتنا ہی کیا کم ہے اب اس
ضعیفی میں اس سے زیادہ کی طاقت نہیں
رکھتا۔ اگر تم کو میرے ساتھ خلوص وعقیدت
ہے تو دوسری طرف کے لوگوں کو جہاں وہ

بمیرزا سلطان احمد کنار گرفتند و بعد ازاں مرزا عمر شیخ را بیش آوردند مرزا، کنار گرفتند۔ و دست برادر را گرفتہ بر روئے می مالید و می گریست و برادر کلاں نیز گردن او را می بوسید و می گریست از مشاہدۂ ایں امر و معاملہ گریہ بر ہمہ مستولی شدہ درمیانِ آں مردم شیونے شد در تہِ شامیانہ نشستند و چناں مجلس مہیبے شدہ بود کہ از غایت ہیبت فقیر دستار۔۔۔ را باز گونہ انداختم و لشکر ہا منتظر بودند کہ اگر چیزے واقع شود برہم بریزند ماحضر آوردیم چوں از خوردن فارغ شدند صلح واقع شدند و عہد کردند و عہد نوشتند و حضرت ایشاں تا شکندرا۔۔۔۔۔۔ فاتحہ خواندند و برخاستند۔ دراں روز بہ زبانِ ہمہ ایں می رفت کہ کمالِ تصرف و قوت ولایت ہمیں باشد کہ ازیں بزرگوار واقع شد کہ ایں صد ہزار کس [illegible] وجہ بودند کہ اگر ہر یکے بدست دیگرے افتادے ہلاک می کرد بمجرد اصلاح و قدوم شریف حضرت ایشاں در یک ساعت خصومت از میاں بیروں آمد کہ در ہیچ کس اثر خصومت نماند۔ مشاہدۂ ایں امر

کہیں شامیانہ لگا لینے دو۔ یہ پیغام پہنچتے ہی اس خوش اعتقاد بادشاہ نے حکم دے دیا کہ جہاں وہ چاہیں شامیانہ لگا لینے دو مجھ کو حضرت پر پورا بھروسہ ہے۔ اس کے بعد مرزا سلطان احمد اپنے اراکین سلطنت کے ساتھ شامیانہ میں بیٹھ گیا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد سلطان محمود خاں اور سلطان مرزا عمر شیخ کو ہمراہ لے کر حضرت بھی تشریف لائے جب یہ دونوں شامیانہ کے نزدیک پہنچے، اُتر پڑے۔ مرزا سلطان احمد بھی ان کے استقبال کے لیے اپنے امراء کو ہمراہ لے کر شامیانہ کے باہر نکل آیا۔ حضرت نے پہلے سلطان محمود خاں کو آگے بڑھایا اور مرزا سلطان احمد سے معانقہ کرایا اس کے بعد سلطان مرزا عمر شیخ کو، دونوں بھائیوں میں معانقہ ہوا۔ مرزا عمر شیخ نے بھائی کے ہاتھ کو بوسہ دینا اور رونا شروع کر دیا اور وہ بھی عمر شیخ کے گلے سے لپٹا رو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر تمام لشکری رونے لگے اور بڑا شور مچ گیا۔ اس کے بعد شامیانہ کے نیچے نشست ہوئی۔ مجلس ایسی پُر ہیبت

مورث یقین ہمہ شد بحضرتِ ایشاں مردم می گفتند کہ معلوم نیست کہ در مشائخ ما تقدم نیز کسے بایں قوت بودہ باشد۔ چوں از مجلسِ صلح بر خاستند لشکر ہا بایک دیگر آمیختند چوں بزہ کہ بامیش بیامیزد۔ حضرت ایشاں باسلطان محمود خاں مقرر کردند کہ بتاشکند روید ماہم از راہ دیگر خواہیم آمد و از میان لشکر ہا بیروں رفتہ متوجہ مولکت شدند و در راہ متوجہ ایں نقیر شدہ فرمودند کہ ایں کارہائے ما را چہ می گوئی ایں واقعہ را خود می تواں نوشت۔

وبار عب وجلال تھی کہ میں نے ہیبت کے مارے اپنے منہ پر کپڑا ڈال دیا۔ دونوں فقیر ہتھیار بند تھے کہ ذرا سی بات پر تلوار چلنے لگے۔ میں نے ماحضر پیش کیا۔ جب کھانا ہوچکا تو صلحنامہ لکھا گیا۔ حضرت نے تاشقند مرزا سلطان احمد کے قبضہ سے نکال کر سلطان محمود خاں کو دیدیا۔ ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ حضرت نے جو کچھ کیا وہ صرف تصرف اور آپ کی قوتِ ولایت کا کمال ہے۔ آپ کی تشریف آوری کی برکت سے ایک لمحہ میں سب کے دل سے دشمنی ایسی دور ہوگئی گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ ہر شخص ایک دوسرے کا مخلص بلکہ یارِ غار تھا۔ اس واقعہ سے لوگوں میں آپ کی ہیبت ولایت و اعتقاد اور زیادہ ہوگیا۔ بعض لوگ تو کہتے تھے کہ معلوم نہیں کہ پرانے مشائخ میں سے کسی میں یہ طاقت و قدرت و تصرف و ولایت تھی یا نہیں۔ جب مجلس ختم ہوگئی تو دونوں لشکروں کے لوگ اس طرح ایک دوسرے کے گلے ملے جیسے بھیڑ کا بچہ بھیڑ سے۔ حضرت نے سلطان محمود خاں سے فرمایا تم تاشقند چلو۔ میں دوسرے راستہ

سے آتا ہوں۔ حضرت لشکر سے باہر نکل کر موکلت کی جانب تشریف لے چلے۔ راستہ میں میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ میری کوششوں کی بابت تمہاری کیا رائے ہے۔ اس واقعہ کو یاد رکھو اور لکھ لینا۔

تاریخ حبیب السیر سے بھی اس واقعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ مورخ نے حضرت خواجہ کے حالات میں لکھا ہے:

حکایت مشہور است و بر گشتہ افواہ ثقات مذکور کہ نوبتے مرزا عمر شیخ و سلطان محمود مرزا بایک دیگر اتفاق نمودہ لشکر بہ سمرقند کشیدند و سلطان احمد مرزا از شہر بیروں رفتہ مقابلہ و مقاتلہ برادر را پیش نہاد ہمت ساختت و وروزے کہ ہر دو سپاہ در برابر یک دیگر صف قتال بیاراستند۔ ناگاہ خبر رسید کہ خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرار دراں معرکہ تشریف آوردند ... خواجہ عبید اللہ ہماں جا رسیدہ بہ زلالِ موعظت ونصیحت قتال و جدال را انفقاداد وہر سہ بادشاہ را بصلح و صفا راضی ساختہ فرمود تا درمیانِ میدان شامیانہ برافراشتند۔

قصہ مشہور ہے اور معتبر لوگوں کا بیان کیا ہوا ہے کہ ایک بار سلطان عمر شیخ مرزا اور سلطان محمود مرزا نے باہم متفق ہو کر سمرقند پر چڑھائی کی اور سلطان احمد مرزا بھی شہر سے باہر نکل کر بھائی سے جنگ اور مقابلہ کے لیے کمربستہ ہوئے اور جس دن دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف بستہ ہوئیں کہ اچانک خبر پہنچی کہ حضرت خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرارؒ اس معرکہ میں تشریف لائے ہیں ..... چنانچہ خواجہ عبید اللہ نے وہاں پہنچکر اپنے وعظ وتلقین سے آتشِ جنگ کو فرو کر دیا اور تینوں بادشاہوں میں صلح کرا کر ایک کو دوسرے سے متحد فرمایا۔ پھر اس میدانِ جنگ میں شامیانہ نصب

کیا گیا۔

اس طرح کے بہت سے واقعات قلمی ملفوظات مقاماتِ عالیہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ سے رشحات میں نقل کیئے گئے ہیں جن کی تفصیل ایک مبسوط کتاب ہی میں ہو سکتی ہے۔ بخیالِ طوالت صرف چند نقل کیئے جاتے ہیں۔

آپ کے ارشادات کے سلسلہ میں حضرت مولانا محمد قاضی نے سلطان ابوسعید مرزا کا یہ واقعہ بھی لکھا ہے:

می فرمودند کہ مرزا سلطان ابوسعید گفتم کہ تمغائے فلاں کس را معاف دارید۔ قبول کردند و گفتند کہ نہ طلبند۔ وبعد ازاں گفتیم عامد تہا است کہ بحضرتِ شما مصاحبت داریم بایستے کہ مارا ہمت بہ ازیں بودے و قتیکہ تمغہ نامشروع است و از ہمہ کس ناگرفتنی است چرا باید کہ یک کس را تخصیص کنیم مارا از ہمت خود شرم آمد بعد ازیں سخن مرزا سکوت کردند و ہیچ نہ گفتند ما نیز سکوت کردیم چوں از پیش مرزا بخانہ آمدیم کیفیت مجلس را بنور سعید گفتیم او پیش مرزا گفتہ کہ شما عجیب کردہ اید کہ تمامتِ تمغا نگذشتہ اید۔ مرزا گفتہ اند چوں سخن از ہمت گذشتہ بود شرم داشتیم کہ بپیش ایشاں دعوئے ہمت کنیم انشاء اللہ از تمامہ تمغا ہر کہ التفات

حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے سلطان ابوسعید سے کہا کہ فلاں شخص کا تمغہ (ٹیکس) معاف کردو۔ انھوں نے مان لیا اور حکم دیدیا کہ اس شخص سے کچھ نہ لیا جائے۔ کچھ دنوں بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ کی خدمت میں مجھے عرصہ سے نیاز حاصل ہے لیکن نہایت نادم ہوں کہ اتنا عرض کرنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ جب تمغہ شرعاً ناجائز ہے تو ایک ہی شخص کا کیوں معاف کیا جائے عام رعایا اس کی معافی سے کیوں مستفیض نہ ہوں، مرزا نے اس وقت سکوت کیا اور میں بھی یہ دیکھ کر چپ ہو گیا۔ جب مرزا کے دربار سے گھر واپس آیا تو میں نے نور سعید سے یہ واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے بوقتِ ملاقات بادشاہ سے کہا کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ آپ

شریف ایشاں خواہیم گذشت وبعد ازچندگاہ از تمامت تمغا گذشت۔

حضرت اقدس کے اتنا کہنے کے بعد بھی ٹیکس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی عام معافی پر آمادہ نہ ہوئے۔ شاہ نے جواب دیا میری جرأت نہیں پڑی کہ حضرت کے سامنے ایسی بات کا دعوئ کروں جس پر میری ہمت پورے طور پر مستعد نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے سکوت کیا۔ اب انشاء اللہ حضرت کی خواہش کے موافق عام معافی کا حکم جاری کروں گا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد تمام رعایا کا ٹیکس معاف ہوگیا۔

بابر نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمود مرزا خلف سلطان ابوسعید نے حضرت خواجہ کی وفات کے بعد ابواب جاری کرنے میں بڑی شدت کی۔ چنانچہ بادشاہ بابر نے سلطان محمود کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ کی اولاد کی بدولت بہت سے غریب اور مفلس لوگ ٹیکس (ابواب) سے معاف تھے، مگر اب ان سے بڑے ظلم اور تعدی کے ساتھ تحصیل ابواب کی جاتی ہے۔ خود حضرت خواجہ کی اولاد سے بھی سختی وتشدد کے ساتھ ابواب طلب کئے گئے۔

ان واقعات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت خواجہ کی شخصیت اور وجاہت ظاہری وباطنی کا شاہانِ وقت پر کس قدر اثر تھا اور وہ آپ سے کتنا مرعوب رہتے تھے۔ بادشاہوں میں آپ سے سوءِ اعتقاد رکھنے والے بھی تھے جن میں ایک تو یہی سلطان محمود تھا جس کے زمانہ کا مختصر حال بابر نامہ سے ملتا ہے۔ بابر نے اس کے محاسن ومعائب دونوں بیان کئے ہیں۔ لکھا ہے کہ وہ خوش خلق اور منتظم تھا لیکن شراب اور امرد پرستی کا اس حد تک دلدادہ

تھا کہ اس کے امرار کے کمسن بچے بھی نہ بچتے تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ یہ رواج اس کے زمانہ میں اس درجہ عام ہو گیا کہ ہر شخص اس کو فیشن سمجھ کر کرتا تھا۔ اس کے دربار میں کبھی علانیہ فواحش کا بھی اجرار ہوتا تھا۔ حضرت خواجہ سے اس کو سوءِ ظن تھا۔ سلطان محمود کے نام حضرت خواجہ کا ایک خط موجود ہے جس کا طرز تحریر عجیب شان کا ہے۔ اس کا بھائی سلطان احمد مرزا سمرقند کا بادشاہ تھا جس کے ملک پر چڑھائی کرنے کے ارادہ سے اس نے فوج کشی کی۔

حضرت خواجہ اس کو ان الفاظ میں منع فرماتے ہیں:

بعد از رفعِ نیازِ عرضداشت ایں فقیر بملازمان حضرت مخدوم زادہ خود آں کہ .... قصد سمرقند از خدمت شما مناسب نمی نماید .... تیغ بر روئے خود کشیدن چہ مناسب ..... بسخن مردم قصد ایں ولایت کردن و سخن فقیر قبول نہ کردن عجب می نماید ...... در سمرقند عزیز بسیار اند، فقرار بسیار اند، صلحار بسیار اند۔ ایشاں را بیش ازیں بہ تنگ آوردن مناسب نیست مبادا کہ دلے درد تا دل دردمند چہ کنند ...... ملتمسِ ایں فقیر کہ خدمتِ بے غرض است خالصۃً لوجہ سبحانہٗ قبول کنید۔

.... بعد سلام کے معلوم ہو کہ تم کو سمرقند پر چڑھائی کرنا کسی طرح زیبا نہیں ہے .... اپنے بھائی پر تلوار اٹھانا کسی طرح مناسب نہیں .... لوگوں کے اکسانے اور ورغلانے پر اس ملک پر فوج کشی کرنا اور ان کے مقابلہ میں اس فقیر کی بات قبول نہ کرنا کیا تم کو اچھا معلوم ہوتا ہے .... سمرقند میں ابرار، فقرار اور صلحار بکثرت ہیں ان کو اب اس سے زائد پریشان کرنا مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کا دل دکھ جائے اور اس کو ٹھیس پہنچے اور اس حالت میں وہ کیا کر بیٹھے۔ لہٰذا اس فقیر کی عرض جو بے غرض ہے اور خالصاً لوجہ اللہ ہے قبول کی جائے۔

؎ (بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید)

ان چند واقعات سے ناظرین نے حضرت خواجہ کی ملکی و ملّی خدمات کا اندازہ کرلیا ہوگا۔ حضرت نے رعایا کو بادشاہوں کے ظلم سے بچانے کی اہم ترین خدمت اپنے سر لے لی تھی۔ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ شاہانِ وقت کو ان بے جا حرکات سے باز رکھوں جن کی وجہ سے خلقِ خدا کو تکلیف پہنچتی ہے۔

"مقاماتِ عالیہ" میں آپ کا مقولہ بایں الفاظ درج ہے:

مارا کارے دیگر فرمودہ اند کہ مسلماناں را از مشرِ ظلمہ نگاہ داریم بواسطۂ ایں بامعنی با پادشاہاں بالیست اختلاط کردن و نفوسِ ایشاں را مسخر گردانیدن وبتوسطِ ایں عمل مقصود مسلمین را برآوردن۔	مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ بادشاہوں سے میل و مراسم رکھوں اور ان کے قلوب کو مسخر کروں اور اس عمل کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کے ظلم و ستم سے بچاؤں اور ان کی حاجت برآری کروں۔

(باقی آئندہ)

ایک ضروری اعلان

رسالہ برہان کے منی آرڈر، ادارہ ندوۃ المصنفین کے منی آرڈر اور مکتبہ برہان کے منی آرڈر اور رجسٹریاں وغیرہ وغیرہ مذیجر رسالہ برہان یا محض عمید الرحمٰن عثمانی کے نام بھیجیں۔ کسی اور کے ذاتی نام پر نہ بھیجیں۔

عمید الرحمٰن عثمانی

ابو حیّان التوحیدی

حیات اور تصنیفات

(۲)

جناب بدرالدین بٹ لیکچرار شعبۂ عربی و اسلامیات اسلامیہ کالج سری نگر، کشمیر

تصنیفات

توحیدی کے ترجمہ نگاروں نے ان کی تصانیف کی فہرست دی ہے مگر ابھی تک صرف چند کتابیں ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہوسکی ہیں۔ اس مضمون میں ہم تفصیلاً صرف مطبوعہ تصانیف کے بارے میں ہی گفتگو کریں گے۔

الإمتاع والمؤانسہ

یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اس کی وجہ تالیف یہ ہے کہ توحیدی کے ایک محسن ابوالوفا (جنھوں نے توحیدی کو وزیر ابن سعدان کے مصاحب شب بنانے میں اہم رول ادا کیا) نے توحیدی سے یہ فرمائش کی کہ وزیر ابن سعدان کے ساتھ شبینہ محفلوں میں جو گفتگو اور بحث وتمحیص ہوئی اس کی تفصیل ابوالوفا کو ملے۔ گو پہلے پہل توحیدی کو یہ معلومات فراہم کرنے میں تردد تھا مگر ابوالوفا کے تحکم آمیز اصرار کے سامنے بے بس ہوگئے۔ توحیدی نے اس ساری بحث وتمحیص، سوال وجواب اور لطائف ومذاق

کی باتوں کو، جو ابنِ سعدان کی شبینہ محفلوں میں واقع ہوگئی تھیں، کتاب کی شکل دیدی۔ یہ گفتگو اور بحث وتمحیص زبان وادب، فلسفہ ومذہب، ادب وشاعری، اقوام وملل اور معاصر ادبی وعلمی شخصیات پر توحیدی کی آراء پر مشتمل تھی۔ القفطی نے اس کتاب کی بہت تعریفیں کی ہیں اور لکھا ہے کہ یہ کتاب حقائق سے پُر ہے اور ابوحیان نے ہر علم وفن میں غوطہ لگایا ہے۔ ایک اور نقّاد نے لکھا ہے کہ کتاب کا حصہ اول تصوف پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصہ میں توحیدی بحیثیت محدّث نظر آتے ہیں اور تیسرے حصہ میں ایک بھکاری بن جاتے ہیں۔[۳۱]

ہم دیکھتے ہیں کہ توحیدی نے اس کتاب کے مندرجات کو راتوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور یہ ساری گفتگو سوال وجواب کی صورت میں درج ہے۔ موضوع ابن سعدان چھیڑتے تھے۔ توحیدی اس کا جواب دیتے۔ گفتگو کے آخر میں ابن سعدان کہتے: اِنَّ اللّیلَ قد دنیٰ من فجرہ ھاتِ ملحۃ الوداع۔ یہ "مِلحۃُ الوِداع" توحیدی کسی مذاق کی شکل میں یا لطیفہ کی صورت میں پیش کرتے۔ ایک رات وزیر نے کہا: ھاتِ الملحۃ الوداع حتی نفترق منھا۔ ثم ناخذ لیلۃ اخری فی شجون الحدیث۔ تو توحیدی نے یہ لطیفہ پیش کیا: حدثنا ابن سیف الراویہ۔ قال رأیت جحظۃ قد دعا بنّاءً لیبنی لہ حائطاً محضی، فلمّا امسی اقتضی البنّاء الاجرۃ۔ فتماسکا وذالک انّ الرجل طلب عشرین درھماً، فقال جحظۃ، اِنّما فعلت یاھذا نصف یوم وتطلبت عشرین درھماً؟ قال: انت لاتدری۔ انی بنیت لک حائطاً یبقی مأۃ سنۃ فبینما ھما کذلک وجب الحائط وسقط۔ فقال جحظۃ: ھذا عملک الحسن؟ قال: فاردت ان یبقی الف سنۃ؟ قال لا: ولکن کان یبقی الی ان تتوفی اجرتک۔[۳۲]

ابن سعدان توحیدی سے معاصر سیاسی اور علمی شخصیات ابن عباد، ابن العمید،

ابوسلیمان المنطقی، مسکویہ وغیرہ کے بارے میں استفسار کرتے ہیں۔ توحیدی ان شخصیات کے بارے میں اپنے خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ ابوسلیمان المنطقی کے بارے میں توحیدی یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"اما شیخنا ابوسلیمان ادقھم نظرًا، واقعرھم غوصًا واصفاھم فکرًا واظفرھم بالدرر، واوقفھم علی الغرر مع تقطع فی العبارۃ وقلۃ النظر فی الکتب وفرط استبداد بالخاطر وحسن استنباط للعویص وجرءۃ علی تفسیر وبخل بما عندہ من ھذا الکنز۔"[۳۳]

مشہور مورخ مسکویہ کے بارے میں کہتے ہیں:

فھو فقیر بین اغنیاء وغبیٌّ بین انبیاء لأنّہ شاذٌ فھو ذکیٌّ حسن الشعر نقی اللفظ .... وان بقی نفساہ بتوسط ھذا الحدیث، وما ادری ذلک مع کلفہ بالکیمیاء وانفاق زمانہ وکدّ بدنہ وقلبہ فی خدمت السلطان، واحتراقہ فی البخل بالدانق والقیراط والکسرۃ والخرقۃ۔[۳۴]

ابن سعدان نے جب ابن عباد اور ابوالوفار کے بارے میں جاننا چاہا تو توحیدی ابوالوفار کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور صاحب بن عباد سے وابستہ ساری سرگذشت سناتے ہیں اور ابن عباد کی تنقید کرتے ہیں۔[۳۵]

ایک شب اقوامِ عالم پر گفتگو چلی تو توحیدی نے اپنے مافی الضمیر کو ابن سعدان کے سامنے یوں پیش کیا:

الامم عند العلماء اربع: الروم والعرب وفارس والھند، ثلاث من ھؤلاء عجم وصعب ان یقال: العرب وحدھا افضل من ھؤلاء الثلاثۃ۔[۳۶]

کئی راتوں میں مذہب اور اس کے متعلقات پر گفتگو چلی تو توحیدی نے ابوسلیمان

منطقی کی زبانی اپنے خیالات کا ایسے اظہار کیا:

انّ الدّین موضوعٌ علی القبول والتسلیم والمبالغۃ فی التعظیم ولیس فیہ "لِمَ" "لا" "وکیف" الا بقدر ما یؤکد اصلہ ویشدّ ازمتہ"۔[37]

ایک رات کوئی سیاسی مسئلہ زیر بحث تھا۔ توحیدی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس قول سے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہیں:

قیل لعمر بن عبد العزیز: ما تقول فی علیّ وعثمان وفی حرب الجمل والصّفین؟ تلک دماءٌ کفّ اللہ یدی عنھا۔ فانا اکرہُ ان اغمض لسانی فیھا۔[38]

اخوان الصفا ہر زمانے میں موضوع بحث وتحیص رہے ہیں۔ ان لوگوں نے مختلف موضوعات پر پچاس رسالے لکھے، ان رسالوں کو مصنف کا نام دئے بغیر لوگوں میں مفت تقسیم کیا۔ بہت سارے مورخوں کے لئے یہ لوگ معمہ بنے رہے۔ "الامتاع" میں توحیدی نے ان کے نظریات کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے[39]۔ قفطی نے اس بنا پر توحیدی کی تعریف کی ہے اور اپنی گرانقدر تالیف "تاریخ الحکماء" میں توحیدی کے خیالات کو بے کم وکاست جگہ دی ہے۔

اس کتاب میں اتنے موضوع زیر بحث آئے ہیں کہ اس کی تبویب ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ ایک ہی رات میں کئی کئی مسئلے زیر بحث آتے تھے۔ اور توحیدی نے اس کو راتوں کے حساب سے لکھا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس زمانے کے علمی، ادبی اور عقلی رجحانات کا پتہ چلتا ہے اور توحیدی کے علم وفضل اور ادب وانشاء کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ "الامتاع" کو احمد امین اور احمد زین نے ایڈٹ کرکے قاہرہ سے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔

الصداقۃ والصدیق:

جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ کتاب دوستی اور دوست کے موضوع پر

لکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ تالیف یہ ہوئی کہ ایک دفعہ اس کے کچھ حصے توحیدی نے ایک دوست زید بن رفاعہ کو دکھائے یہ زید کو پسند آئے اور انھوں نے ان کو وزیر ابن سعدان کو سنایا۔ ان دنوں ابن سعدان وزیر نہیں ہوئے تھے۔ جب کئی سال بعد ابن سعدان وزیر ہوئے تو توحیدی نے اس کو مکمل کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا۔[۴۰]

دوستی پر یہ رسالہ احادیثِ رسولؐ، اقوالِ صحابہ اور قدیم اور توحیدی کی معاصر علمی شخصیات کے اقوال زریں پر مشتمل ہے۔ توحیدی نے اس کتاب میں حقیقی دوستی، اس کے اسباب، مبنی بر مفاد دوستی اور بے خلوص دوستی پر کھل کر بحث کی ہے۔ توحیدی نے اس کتاب میں لوگوں کے خطوط کے اقتباسات بھی دئے ہیں تاکہ دوستی پر تفصیلی روشنی پڑے۔ میری معلومات کی حد تک یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک منفرد تالیف ہے جس میں اصلی دوستی اور اس کے محرکات پر بحث ہے اور ان اسباب پر بھی گفتگو ملتی ہے جن سے اخلاص اور محبت اور مودّت کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۳۰۱ھ میں قسطنطنیہ سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں درج چند علماء کے اقوال پیش کئے جاتے ہیں:

العسجدی: دوستی ایک مفروضہ ہے۔ قابلِ اعتماد افراد بالکل عنقا ہیں اور وفاداری ایک ایسا لفظ ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔[۴۱]

ابوسعید السیرانی: جب میرے کسی دوست کا انتقال ہوتا ہے تو اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا کوئی عضو کٹ جاتا ہے۔[۴۲]

ایک اور مفکر نے دوست کی تعریف یوں کی ہے: من یطعمنی اذا جعت ویکسونی اذا عریت، ویحملنی اذا کللت ویغفرلی اذا ذللتُ۔

ایک خط کا اقتباس: کان اخوان الثقۃ کثیراً فأنت اولھم، وان کانوا قلیلاً فأنت اوثقھم، وان کانوا واحداً فأنت ھو۔[۴۳]

عباسی خلیفہ مُطیع کے خط کا ایک اقتباس : صدیقك صدیقك وصدیق صدیقك، وعدوك عدوك وصدیق عدوك عدوك وعدو صدیقك عدوك وعدو عدوك صدیقك۔[۴۴]

رسالہ فی العلوم:

یہ ایک بہت ہی مختصر رسالہ ہے جو سنت، فقہ، نحو، نجوم، فلکیات، عروض البلاغتہ اور مابعد الطبعیات کی تعریف و تشریح پر مشتمل ہے اور کتاب الصداقہ والصدیق کے ساتھ ہی قسطنطنیہ سے شائع ہوا ہے۔

البصائر والذخائر:

یہ کتاب توحیدی کی طویل محنت و مشقت کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے جاحظ کے اسلوب کی پیروی کی ہے جو ابوحیان کا پسندیدہ اسلوب تھا۔ جاحظ کے بارے میں ان کا مشہور قول ہے کہ وہ روح عالم تھے اور ان کی کتابیں لعل و جواہر سے کم نہیں۔

یاقوت الحموی کے بقول "البصائر والذخائر" دس جلدوں پر مشتمل تھی، ہر جلد کا ایک ابتدائیہ اور اختتامیہ تھا۔ اور یہ توحیدی کی پندرہ سالہ محنت و مطالعہ کا نتیجہ ہے، ۳۵۰ھ میں یہ کتاب شروع کی گئی اور ۳۶۵ھ میں مکمل ہوئی۔[۴۵]

یہ علم و ادب کی بدقسمتی ہے کہ ابھی تک اس کتاب کی صرف پہلی دو جلدیں ہی زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہیں جن کو ڈاکٹر ابراہیم کیلانی نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا جبکہ اس سے قبل ڈاکٹر احمد امین اور احمد السقر نے ۱۹۵۳ء میں اس کی پہلی جلد قاہرہ سے شائع کی تھی۔ باقی جلدوں کے مخطوطات قسطنطنیہ اور کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ابوحیان کی وسعت علمی، تجربات اور معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ خود ابوحیان کی نگاہ میں اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ان کے ان

الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے : وقد انشأت هذا الکتاب علی روایة ما حصلت لانه ثمرة العمر والزبد الایام وو دیعة التجارب ..... ولا علیك ان تستقصر النظر فی جمیع ماحوی هذا الکتاب لانه کبستان یجمع الوان الزهر وکبحر یضم اصناف الدرر وکالدهر الذی یأتی بعجائب العبر۔[۴۶]

اس کتاب میں ابوحیان کے ادب پارے ، مذاق و لطائف ، شاعری ، ضرب الامثال بذلہ سنجیاں ، احادیثِ رسولؐ ، اقوالِ صحابہ ، بادشاہوں ، صوفیاء ، نحویوں ، زبان دانوں کے مقولے ، آیات قرآنی کی تفسیر ، تاریخ ہائے وفات ، اخلاقی پند و نصائح ، تاریخی واقعات ، سخاوت کے قصے ، ناموں کی تصحیح ، مجد و شرافت کے واقعات وغیرہ جمع کر دئے ہیں ۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ طرزِ جاحظ پر لکھی گئی یہ کتاب کسی تبویب کے بغیر ہی ہے ۔ بلکہ اس میں سب چیزیں یکے بعد دیگرے سامنے آتی ہیں ۔ جاحظ اور ابوحیان دونوں کا خیال تھا کہ اگر قاری ایک ہی موضوع پر پڑھتا رہے تو اس کی طبیعت اوب جاتی ہے اور وہ تکان محسوس کرتا ہے اور پھر اسے کوئی چیز یاد بھی نہیں رہتی ۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ سنجیدہ بحث کے دوران کوئی مذاق کی بات یا لطیفہ پیش کیا جائے تاکہ اس کا دماغ راحت محسوس کرے اور اس کی دلچسپی برقرار رہے ۔[۴۷]

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ ابوحیان نے اس کتاب میں احادیث رسولؐ کو جگہ دی ہے جو مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں ۔ تبرکاً یہ حدیث لیجئے : لا مال اعود من العقل ولا وحدة اوحش من العجب ولا عقل کتدبیر ولا کرم کالتقوی ولا قرین کحسن الخلق ولا میراث کالادب ولا تجارة کعمل الصالح ولا علم کالتفکر کأداء الفرائض ۔[۴۸]

جا بجا اشعار بھی مناسب موقعوں پر موتیوں کی طرح پرو دئے ہیں :

حسبی بقلبی شاهداً فی الهوی والقلب اعدل شاهد یستشهد

ان کنت اوحد فی الجمال فاننی فی صدق ودی الوفاء لا وحد[49]

صوفیاء کے سردار حسن بصری کا یہ قول بھی کتاب میں درج ہے:

اعمل کانک میت غداً ولا تجمع کانک تعیش ابداً[50]

قارئین کی دلچسپی کے لئے ہنسی مذاق اور لطیفے جا بجا نظر آتے ہیں۔ نمونتاً ایک ملاحظہ ہو:

قال رجل لصاحب منزلہ : اصلح خشب ھذا السقف فانہ یقرقع قال: لا تخف انما ھو یسبح ، فقال : اخاف ان تدرکہ رقة فیسجد[51]

ایسا لگتا ہے کہ یہ کتاب ابوحیان کی زندگی ہی میں بڑی دلچسپی سے پڑھی گئی اور پہلی جلد کے مطالعہ کے بعد ابوحیان کو قارئین کے تبصرے ملے تھے جن کو انھوں نے جلد دوم میں جگہ دی ہے۔ تبصرہ نگاروں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے توحیدی کو لکھا تھا کہ اس کتاب میں کوئی باب بندی (Chapterisation) نہیں ہے۔ مزید برآں اس کتاب میں علم کو جہالت کے ساتھ ملا لیا گیا ہے اور فلسفہ کو بیوتوفی کے ساتھ خلط ملط کیا گیا ہے۔ پارسائی کے واقعات کو بدکاری کے واقعات کے درمیان جگہ دی گئی ہے اور یہ کہ لسانی اور نحو کے مسائل کو غیر ضروری طور پر اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے اور کسی کسی جگہ کتاب میں عریانی بھی نظر آتی ہے۔

اخلاق الوزیرین:

ابوحیان کی اس اہم تالیف کو محمد بن تاویت الطنجی نے ایڈٹ کر کے مجمع العلمی العربی دمشق سے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ اس کا مخطوطہ قسطنطنیہ کے کتب خانہ میں پایا گیا جو غالباً دنیا میں اس کا واحد مخطوطہ ہے۔

اس کتاب کی وجہ تالیف وہ سلوک ہے جو توحیدی کے ساتھ تین بویہی وزراء ابوالفضل ابن العمید، ابوالفتح ابن العمید اور صاحب بن عباد کے ہاتھوں روا رکھا گیا۔ اس تالیف

میں توحیدی نے ان وزرار کی زندگیوں کے تاریک گوشوں کو بڑی جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے اور معاصر علمار وفضلار کے تائیدی بیانات سے اپنی پوزیشن مضبوط کی ہے۔

اپنی تنقید کے جواز کے لئے توحیدی نے آغاز ہی میں غیبت کے موضوع پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ منافق کو بے نقاب کرنا غیبت اور چغل خوری نہیں ہے[۵۳]۔ توحیدی نے جس ماحول میں یہ کتاب لکھی وہ ماحول بالکل مخالفانہ تھا۔ بے جا خوشامد اور چاپلوسی "سرکاری" علمار وادبار کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ اگر توحیدی اس ماحول میں اپنے آپ کو کھپاتے تو شاید وہ کوئی بڑے سے بڑا منصب بھی حاصل کر لیتے مگر ان کے زندہ ضمیر نے انھیں بے جا خوشامد کی اجازت نہیں دی جس کا نتیجہ توحیدی کی وہ حالت تھی جس کا انھوں نے زندگی بھر مقابلہ کیا۔

ان وزرار کے خلاف توحیدی نے نہ صرف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ معاصر علمی، سیاسی اور ادبی شخصیات کے خیالات کو بھی پیش کیا ہے۔ ابن عباد کے بارے میں زعفرانی کی یہ رائے نقل کی ہے کہ وہ بد باطن، اپنے احباب تک کے بے وفا اور مجموعہ رذائل تھے[۵۴]۔ اسی طرح المسیبی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ابن عباد کا بیرون گمراہی اور اندرون جہالت ہے[۵۵]۔ وہ علمار وادبار سے ہمیشہ ناراض رہتے ہیں۔ اسی طرح ابن عباد کے استاد ابن فارس کی یہ رائے بھی نقل کی ہے کہ ابن عباد دشمنِ خدا اور دشمنِ علمار ہیں[۵۶]۔

ابوالفضل ابن العمید کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ وہ بردباری کا مظاہرہ تو کرتے ہیں مگر وہ اصلاً بڑے ظالم ہیں۔ وہ ایک عالم وفاضل کے روپ میں اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں مگر علم وفضل سے کورے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بڑے بہادر ہیں مگر فی الحقیقت بزدل ہیں۔ اپنے آپ کو منطق کا ماہر سمجھتے ہیں مگر اس سے بالکل خالی ہیں[۵۷]۔ اگر آپ ان سے کسی مدد کی امید کریں گے تو آپ کو نا امید کریں گے اور اگر آپ ان کی

روٹی کا ٹکڑا لیں گے تو وہ آپ کا خون چوس لیں گے۔[58]

توحیدی نے ان لوگوں کی صرف خامیاں ہی بے نقاب نہیں کی ہیں بلکہ اگر خوبی بھی نظر آئی تو اس کو بھی بے کم وکاست بیان کیا ہے۔ ابوالفضل کے بارے میں الہروی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ایک اچھے سکریٹری، عمدہ انشار نگار اور ایک بہترین حافظہ کے مالک ہیں۔ غزل میں عمدہ شعر کہتے ہیں۔[59] ابوالفتح ابن العمید کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک ذہین، جوان، متحرک اور اپنے والد سے بہتر شاعر ہونے کے باوجود وہ کم عمری کی وجہ سے وہ سب کچھ نہ دکھا سکے جس کی ان میں صلاحیت تھی۔[60]

آخر میں توحیدی نے قارئین سے اپیل کی ہے کہ وہ اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کریں اور ان کا جو بھی فیصلہ ہوگا وہ منظور ہوگا۔[61]

توحیدی کے معاصر سیاسی زعماء اور ان کے سرکاری ادباء نے اس کتاب کے خلاف ایسا ہوّا کھڑا کیا کہ بعد کے ترجمہ نگاروں نے اس کتاب کو شجر ممنوعہ قرار دیا اور توہمات کی ایک ناقابل یقین اور غیر معقول فضا قائم کی گئی کہ اکثر مصنفین نے اس کا تذکرہ کرنا تک باعث نحوست سمجھا۔ پڑھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یاقوت الحموی پہلے ترجمہ نگار ہیں جنھوں نے اس کتاب کے اقتباسات معجم الادبار میں نقل کئے ہیں۔ ابن خلکان جیسے عالم و فاضل بھی وہم و تعصب اور سنی سنائی باتوں کے شکار ہو گئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ اُن کتابوں میں سے ایک ہے کہ جو آدمی اسے اپنے پاس رکھے گا اس پر مصیبت آتی ہے۔ مجھے خود بھی اس کا تجربہ ہوا ہے اور اُن کو بھی ہوا ہے جن پر مجھے اعتماد ہے۔[62]

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک کتاب کیسے مصیبت لا سکتی ہے؟ کیا یہ وزرار جن کے بارے میں توحیدی نے لکھا ہے نعوذ باللہ پیغمبر تھے کہ جن پر کسی بھی قسم کی تنقید یا لب کشائی کفر ہے۔ مان لیا کہ خود ابوحیان توحیدی کا مزاج ایک حد تک اس ناکامی کا ذمہ دار ہے

جوان وزرار کے درباروں میں ان کو ہوئی مگر یہ وزرار بھی مکمل طور پر بری الذمہ قرار نہیں دئے جا سکتے۔ یہ بات بھی تسلیم ہے کہ ان وزرار نے علم و ادب کی سرپرستی کی ہے مگر کیا اس سے وہ بشری کمزوریوں سے منزّہ ہو گئے۔ ابوحیان نے ان پر لکھتے وقت نہ صرف اپنے خیالات کو پیش کیا ہے بلکہ معاصر علمار و ادبار کی آرار کو بھی شامل کیا ہے جو ان وزرار کو بخوبی جانتے تھے اور جن کے مراسم بھی ان کے ساتھ تھے۔ لہٰذا ان خیالات کو یکسر کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

الإشارات الالٰهيه:

اس کتاب کا پورا نام "الاشارات الالٰهیه والانفاس الروحانیه" ہے۔ کتاب دو جلدوں میں تھی۔ جلد اول کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بدوی نے دریافت کر کے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔ اس کا مخطوطہ ظاہریہ لائبریری دمشق میں پایا گیا جو دنیا میں اس کتاب کا واحد نسخہ ہے۔ اس کا اختصار عبدالقادر بن محمد نے کیا ہے جس کا مخطوطہ برلن لائبریری میں موجود ہے۔

ڈاکٹر بدوی کا خیال ہے کہ وہ آدمی جس کے ساتھ توحیدی مراسلت کرتے نظر آتے ہیں، جاننا مشکل ہے اور غالباً وہ توحیدی کے تخیل کی پیداوار ہے مگر کتاب کے بعض جملوں کو پڑھ کر ڈاکٹر بدوی کی رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ مثلاً ایک جگہ ابوحیان لکھتے ہیں:

وصل کتابك ..... وصلك الله بالخير وجعلك من أهله .....

تسألني فيه عن حالي كتبت اليكم يا احباب قلبي

يا احبابي! اذا قرأتم كتابي. فتفضلوا علي بجوابي، فلعلي اداوي بكتابكم ما بقي.

لگتا ہے کہ یہ کتاب توحیدی نے بڑھاپے میں لکھی ہے اور اس کا مقصد تزکیۂ نفس

ہے۔ لہٰذا اس کا ہر صفحہ اور ہر سطر ایسے وعظ و نصائح سے پُر ہے جن میں ایمان باللہ اور شکستہ دل کے ساتھ اللہ کے حضور گڑگڑانے کی تلقین کی گئی ہے۔ ابو حیان انسانی شعور سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں آیات اور مہربانیوں پر غور کرے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ روا رکھی ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

أیہا المبتدع بالقدرة الالہیة والخلق المصطنع بالمشیئة الربانیہ والانسان لمخوف بنعمة الملکیہ تأمل مواقع ایاتہ فیك واستنطق شواھد آثاره علیك ..... وانظر بای فضل فضك ومن ای حال خلفك والی ای درجة رقاك وبأیّ رتبة حلّاك وبایّ سرٍ ناجاك .... ومن ای شر وقاك [۶۳]

ابو حیان تلقین کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی پر توکل یا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ استمداد صرف اسی سے کرنا چاہیے کیوں کہ اس ذات کے بغیر دنیا کی کوئی طاقت ہماری دستگیری نہیں کر سکتی۔ کہتے ہیں:

یا ھذا! لا مستقبل لك الا باللہ، ولا عوذ لك الا الی اللہ ولا توکل لك الا علی اللہ ولا خیر لك الا من اللہ ولا نجاۃ لك الا باللہ ولا مُنعم علیك الا اللہ [۶۴]

توحیدی کے نزدیک معیارِ فضیلت انسان کے اخلاق و فضائل اور عادات و اطوار ہیں۔ دھن دولت کوئی معیارِ شرافت اور قدر و منزلت نہیں ہے۔ توحیدی کی نظروں میں دولت کو معیارِ فضیلت قرار دینے والے ظالم ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

واذا فضلت انساناً علیٰ انسان فَلِمَ لا تفضلہ بالفضائل والاخلاق والعادات والافعال ولکن تفضّلہ بالدراھم والدنانیر والثیاب والضیاع إنك إذاً لَمِنَ الظالمین لأنّك قد جھلت الفاضل [۶۵]

کتاب کا باستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ایسا انسان زندیق نہیں ہوسکتا۔ کتاب کا ورق ورق خوفِ خدا، ایمان باللہ کے جذبات سے روشن ہے۔

الہوامل والشوامل:

یہ کتاب احمد امین اور احمد السقر نے ایڈٹ کر کے قاہرہ سے ۱۹۵۱ء میں شائع کی ہے۔ اصل میں یہ کتاب ان سوالات و جوابات پر مشتمل ہے جو ابوحیان اور ابوعلی مسکویہ کے درمیان ہوئے ہیں۔ سوالات توحیدی نے بھیجے تھے اور جوابات مسکویہ نے دئے ہیں۔ توحیدی نے ادب، فلسفہ، سیاست، زبان، تصوف، سماج، سائنس، مابعدالطبیعات کے مسائل پر سوالات کئے ہیں۔ یہ سوالات کئی سو ہیں جو مختلف اوقات میں توحیدی نے مسکویہ کو لکھ کر بھیجے تھے۔ ان سوالات کے جواب مسکویہ نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ لکھ کر بھیجا تھا۔ کتاب کے مطالعہ سے توحیدی اور مسکویہ دونوں کے علم وفضل و مرتبہ کا احساس ہوتا ہے۔

المقابسات:

یہ کتاب ۱۳۰۵ھ اور ۱۳۰۶ھ میں مرزا محمد الشیرازی نے بمبئی سے شائع کی ہے بعد ازاں اس کا ایک اور ایڈیشن حسن السندوبی نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا مگر ڈاکٹر ابراہیم کیلانی کے بقول دونوں ایڈیشن ناقص ہیں۔

کتاب میں چھوٹے بڑے ایک سو چھ مقابسات ہیں۔ مقابسات ان تقریروں کا نام ہے جو مختلف اوقات پر ان محفلوں میں کی جاتی تھیں جو یا تو وزیر ابن سعدان کے یہاں لگتی تھیں یا وراقوں کے بازار میں یا مشہور منطقی ابوسلیمان المنطقی کے کسی شاگرد کے گھر میں منعقد کی جاتی تھیں۔ ان محفلوں کی صدارت یحییٰ بن عدی اور ابوسلیمان المنطقی السجستانی کرتے تھے۔ ان محفلوں کے شرکاء فلاسفہ، اطباء، ریاضی دان، ماہرین فلکیات، نحوی، مورخ، شعراء، ادباء، مذہبی علماء اور دیگر دانشور لوگ ہوتے تھے۔ ان محفلوں

میں ہر مذہب و خیال کے لوگ شرکت کرتے تھے اور بحث و مباحثہ کے ذریعہ سے اپنی علمی پیاس بجھا دیتے۔ طلبانِ علم اپنی ڈائریاں کھولتے اور صدر محفل کے جوابات نوٹ کرتے۔ اختلافِ رائے کی صورت میں صدر محفل کی رائے پر کسی بھی علمی مسئلہ کا فیصلہ ہوتا۔

"المقابسات" تاریخِ فلسفہ کے طلباء کے لئے بہت ہی مفید کتاب ہے۔ الحریری نے بھی اپنے مقامات میں اس کتاب سے اخذ و استفادہ کیا ہے[۶۶]۔

"المقابسات" میں روح، عقل، زمان و مکان، زندگی بعد موت، نحو اور یونانی منطق سے اس کا تعلق، تزکیہ نفس، خیر و شر، فضائل و رذائل، نثر و نظم اور بلاغت وغیرہ پر مفید بحثیں ملتی ہیں۔

کتاب میں الفاظ کا کھیل ضرورت سے زیادہ کھیلا گیا ہے اس لئے عام قاری اس سے استفادہ نہیں کر سکتے مگر بعض علماء کا خیال ہے کہ یہی ابہام اور گہرائی ان جیسے موضوعات کے لئے ضروری تھی کیونکہ فلاسفہ و حکماء رمز و کنایات ہی میں بات کرنا پسند کرتے ہیں۔

توحیدی کے کچھ اور مطبوعہ رسالے یہ ہیں:

۱۔ رسالۃ فی علم الکتابہ
۲۔ رسالۃ الحیوان
۳۔ رسالۃ الامامہ المعروفۃ بروایۃ سقیفہ۔
۴۔ المناظرہ بین ابی سعید السیرافی ومتی بین یونس القنائی۔
۵۔ کتاب النوادر۔

توحیدی کے ترجمہ نگاروں نے توحیدی کی جن اور کتابوں کے نام دئے ہیں اور جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی ہیں اور نہ یقین کے ساتھ ان کی موجودگی کے بارے میں

کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ تقریظ الجاحظ ۲۔ رسالۃ الحسنین الی الاوطان

۳۔ المحاضرات والمناظرات ۴۔ الاقناع

۵۔ التذکرۃ التوحیدیہ

۶۔ کتاب الحج العقلی اذا ضاق الفضاء عن الحج الشرعی

۷۔ کتاب الزلفۃ ۸۔ ریاض العارفین

۹۔ رسالۃ فی اخبار الصوفیہ ۱۰۔ الرسالۃ البغدادیہ

۱۱۔ رسالۃ الی ابی الفضل ابن العمید

۱۲۔ کتاب الرّد علی ابن جنّی فی شعر المتنبی

۱۳۔ رسالۃ لابی بکر الطالقانی ۱۴۔ الرسالۃ الصوفیہ

۱۵۔ الرسالۃ فی ضلالات الفقہاء فی المناظرہ۔

حوالے:

۱۔ یاقوت الحموی: معجم الادباء: قاہرہ ۱۲۹۹ھ، جلد ۱۵، ص ۵۔

۲۔ عبدالرزاق محی الدین: ابوحیان التوحیدی بحوالہ جنید الشیرازی، قاہرہ ۱۹۴۹ء ص ۱۱۔

۳۔ معجم الادباء، جلد ۱۵، ص ۵۔

۴۔ سبکی: طبقات الشافعیہ الکبریٰ، مصر، جلد ۴، ص ۲۔

۵۔ کرد علی: امراء البیان، قاہرہ ۱۹۳۷ء، جلد ۱، ص ۱۹۲۔

۶۔ ابوحیان التوحیدی: الامتاع والمؤانسہ، قاہرہ ۱۹۵۳ء، جلد ۱، ص ۷۰۔

۷۔ ابوحیان التوحیدی: المقابسات، قاہرہ ۱۹۲۹ء، ص ۳۱۔

۸۔ الامتاع والمؤانسہ، جلد ۳، ص ۱۶۱۔

۹۔ ایضاً جلد ۱، ص ۶۔

۱۰۔ مقابسات ، ص ۱۵۶۔

۱۱۔ الثعالبی : یتیمۃ الدھر، قاہرہ، جلد ۳، ص ۲۸۰۔

۱۲۔ التوحیدی : اخلاق الوزیرین، دمشق ۱۹۶۵ء، ص ۳۲۰۔

۱۳۔ معجم الادباء ، جلد ۱۵، ص ۹۔

۱۴۔ التوحیدی : الصداقۃ والصدیق، قسطنطنیہ، ۱۳۰۱ھ، ص ۳۰

۱۵۔ ابن خلکان : وفیات الاعیان، قاہرہ ۱۹۴۸ء، ج ۲، ص ۸۲۔

۱۶۔ الامتاع ، ج ۱، ص ۱۸۔

۱۷۔ ایضاً ، ج ۱، ص ۲۲۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۹۶

۱۹۔ ایضاً ، جلد ۱ ، ص ۱۲

۲۰۔ ایضاً، ج ۳، ص ۲۲۱ ، ج ۱، ص ۶۶

۲۱۔ معجم ، ج ۱۵، ص ۱۶۔

۲۲۔ السیوطی : بُغیۃ الوعاۃ، ص ۳۴۹۔

۲۳۔ طبقات ، ج ۴، ص ۲، العسقلانی، لسان المیزان، حیدر آباد ۱۳۳۱ھ، ج ۶، ص ۳۷۰۔

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ طبقات، ج ۴، ص ۳۔

۲۶۔ ایضاً، ج ۴، ص ۲۔

۲۷۔ ایضاً ص ۲۔۳، لسان، ج ۶، ص ۳۶۹۔

۲۸۔ معجم، ج ۱۵، ص ۵۔

۲۹۔ لسان، ج ۶، ص ۶۳۔ ۳۶۱۔

۳۰۔ طبقات، ج ۴، ص ۳۔

۳۱۔ قفطی: تاریخ الحکماء، لیبزگ، ۱۹۰۳ء، ص ۲۸۳۔

۳۲۔ الامتاع، ج ۱، ص ۲۹۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۳۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۵۔۳۶۔

۳۵۔ ایضاً، ج ۱، ص ۵۴۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۳۷۔ ایضاً، ج ۲، ص ۱۸۷۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۸۳۔

۳۹۔ ایضاً، ج ۲، ص ۴۔۲۲۔

۴۰۔ توحیدی: الصداقۃ والصدیق، ص ۶۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۷،

۴۲۔ ایضاً۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۷۹۔

۴۵۔ معجم، ج ۱۵، ص ۸۔

۴۶۔ البصائر والذخائر، قاہرہ ۵۴۔۱۹۵۳، ج ۱، دیکھئے مقدمہ۔

۴۷۔ ایضاً۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۳

۴۹۔ ایضاً، ص ۲۰۶

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۳۹۹۔

۵۲۔ ایضاً، ج ۲، ص ۲۹۶۔

۵۳۔ توحیدی: اخلاق الوزیرین، ص ۶۸۔۷۱

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۰۷۔۳۰۲۔

۵۶۔ ایضاً۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۳۲۱۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۳۶۱۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۳۴۳۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۰۴۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۵۴۷۔

۶۲۔ وفیات، ج ۴، ص ۱۹۷۔

۶۳۔ الاشارات الالہیۃ، ص ۳۵۔

۶۴۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔۱۰۰۔

۶۶۔ کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۴۲۔

۶۷۔ ڈاکٹر ابراہیم کیلانی: ابو حیان التوحیدی، قاہرہ ۱۹۳۷ء، ص ۴۵۔۴۶

لغات کی تحقیق

(۲)

مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؔ

(۶)

سحر صاحب لکھتے ہیں: ایک اور موقع پر انھوں نے (یعنی رشید حسن خاں نے)
جہالت، رفاقت، حماقت اور حقارت کے ساتھ رقابت کا بھی عام اردو تلفظ بکسر
اول بتایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ رقابت عام طور پر بفتح اول بولا جاتا ہے ....
رواج کے بارے میں لکھا ہے کہ اردو میں رواج کو اب بکسر اول مرجح ماننا چاہیے۔
زبان وقواعد ص۱۰۷ و ۱۰۸) میری رائے میں اب اس لفظ کا تلفظ بدل گیا ہے اور یہ زیادہ تر
بفتح اول بولا جاتا ہے۔ اسی کو مرجح ماننا چاہیے۔ رقابت اور روان کی طرح روایت اور
رذالت کی بھی یہی صورت ہے الخ (زبان و لغت ص۲)

واصفؔ عرض کرتا ہے کہ رواج، روایت، رذالت، جہالت، رفاقت، حماقت، حقارت
یہ ساتوں لفظ اہل دہلی کے لہجے میں بکسر اول ہی فصیح ہیں۔ لغۃً باستثنائے روایت سب
بفتح اول ہیں۔ ایک لفظ رَواز بالفتح ہے اس کو بعض لوگ جیم کے ساتھ رواج بولتے ہیں
صحیح زے سے ہے) گوشت کے اندر کی چربی کو کہتے ہیں۔ یہ اردو لفظ ہے اور بفتح اول صحیح

ہے۔ آصفیہ میں اس کو بکسر اول غلطی سے لکھ دیا ہے۔

(۷)

سحر صاحب لکھتے ہیں۔ طمطراق بول چال میں بکسر اول و فتح سوم بھی آتا ہے اور اردو کے لہجے کے مطابق ہے (زبان ولغت صـ۷۶) احقر و آصف اس لہجے کو سمجھنے سے قاصر اور ناواقف ہے۔

(۸)

ملائی پر بہت طویل بحثیں کی گئی ہیں۔ زبان و قواعد میں پندرہ صفحات اور زبان ولغت میں تین صفحے اس کی نذر ہو گئے۔ دودھ کو اونٹانے سے اوپر کی سطح پر جو موٹی سی تہ جمتی ہے اس کو ملائی کہتے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ منڈلائی تھا۔ پھر مخفف ہو کر ملائی ہو گیا (منڈلانا اور منڈھنا کا ایک ہی ماخذ ہے) معلوم نہیں کیوں بعض حضرات نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا جو ملائی کا مترادف ہے۔ یہ ایجاد بے ضرورت بھی تھی اور بے لطف بھی۔ کیونکہ ملائی کے معنی ہیں اوپر چھا جانے اور احاطہ کرنے والی چیز۔ بالائی میں احاطہ کا مفہوم نہیں ہے اس لحاظ سے یہ لفظ ناقص رہا۔ یہ جدید تحقیق اب میں نے اردو مصدر نامہ میں درج کر دی ہے جو انشاء اللہ طبع دوم میں آجائے گی۔ (و آصف)

(۹)

سحر صاحب لکھتے ہیں۔ املانامہ میں ایک جگہ اور اردو املا میں ہر جگہ مشتقات کے قاف کو مشدد لکھا گیا ہے۔ تکرار سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی نہیں ہے۔ مشتق کے قاف پر تشدید پہلے ہی حذف ہو چکی ہے۔ جمع میں تشدید بولنے یا لکھنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ (اردو املا اور اس کی اصلاح صـ۸۷)

و آصف عرض کرتا ہے یہ دلیل تو صحیح نہیں کہ چونکہ مفرد میں سے تشدید حذف ہو چکی ہے اس لئے جمع میں بھی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ کون کہتا ہے کہ مفرد میں سے تشدید حذف ہو چکی ہے۔

اگر وقف کی حالت میں تشدید کا تلفظ واضح طور سے نہ ہو تو اس سے یہ سمجھ لینا کہ تشدید حذف ہو چکی ہے اور جہاں اس کا تلفظ بآسانی ممکن ہے وہاں سے حذف کر دینا یہ صحیح اجتہاد نہیں۔ اور یہ کہنا کہ مشتقات کا قاف غیر مشدد پڑھا جاتا ہے خلاف واقعہ بھی ہے۔

مشتق اسم مفعول ہے اشتقاق سے۔ یہ مادہ مضاعف ہے (ش ق ق) مندرجہ ذیل الفاظ کو ملاحظہ فرمائیے۔ مفرد کی صورت میں تشدید کا تلفظ نہیں ہوتا۔ ترکیب کی صورت میں تشدید پڑھی جاتی ہے۔

شق، شق القمر، شق اول ــــ حق، حقانی، حقی ــــ ہم، مہمات ــــ محل، محلات ــــ ممتد، ممتدہ ــــ معتد، معتدہ ــــ سم، سمّیات ــــ مرتد، مرتدین ــــ رد، رد جواب ــــ سدّراہ ــــ ضد، ضدی ــــ جر، جرثقیل ــــ مد، مدات ــــ حد، حد نظر ــــ مختل، مختل الحواس، مختص، مختصات ــــ محب، محب صادق، محبین۔

بہر حال سحر صاحب کا اقدام دور رس نتائج کا حامل اور لائق تہنیت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حرکت میں برکت ہے اور اختلاف موجب رحمت ہے۔ اردو پر جو ہر چہار طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان حملہ آوروں میں سے ایک گروہ ڈیزائنروں کا ہے جو کتابوں کے ڈسٹ کور اور ٹائیٹل پر ڈیزائن بناتے اردو کے خوبصورت نستعلیق خط پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ اور عجیب مضحکہ خیز نکٹا بوچا، لنجا لولا لنگڑا کا ناکترا خط ایجاد کرتے رہتے ہیں۔

راقم الحروف متعدد بار لکھ چکا ہے اور اب پھر عرض کرتا ہے کہ ایک زور دار مہم ان ڈیزائنروں کے خلاف بھی شروع ہونی چاہیئے۔ آخر کب تک اردو کے حامی مصنفین ادبا شعرا یہ ستم دیکھتے رہیں گے اور چوں نہیں کریں گے۔

آج کل کی مطبوعات کے ٹائیٹل اور ڈسٹ کور اٹھا کر دیکھئے اور

اسلاف کی محنتوں کی بربادی پر آنسو بہایئے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

دعائے صحت

پچھلے مہینہ کے رسالہ برہان میں حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایڈیٹر رسالہ برہان کی علالت کی اطلاع دی گئی تھی۔ خدا کے فضل سے مولانا کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے۔ اور اسپتال سے تشریف لے آئے ہیں۔ موصوف یرقان (پیلیے کی بیماری) میں مبتلا ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی سے بہت زیادہ متوقع ہوں کہ آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ (آمین)

قارئین برہان اور اس ادارہ سے تعلق رکھنے والے حضرات سے میں دعائے صحت کی درخواست کرتا ہوں۔

عمید الرحمن عثمانی
پرنٹر و پبلشر و منیجر
رسالہ برہان دہلی

دقیقی طوسی

از مسز شاہدہ رشید شیروانی ایم۔ اے

سلسلہ سامانیہ کے ہر فرمانروا کا عہد اگرچہ بام ترقی کا ایک نیا پایہ ہے۔ لیکن نوح بن منصور کا زمانہ آخر المنازل ہے۔ یہ فخر اسی دور کو حاصل ہے کہ عجم کا سرمایۂ فخر یعنی شاہ نامہ جس کو ابن الاثیر قرآن عجم کہتا ہے۔ اس کا ابتدائی خاکہ اسی عہد میں قائم ہوا۔

سامانی خاندان ابتدار سے اس بات کا خواہشمند تھا کہ ان کے اسلاف کی داستان نثر سے نظم ہو کر عام زبانوں پر چڑھ جائے لیکن ابھی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی کہ ایک عظیم الشان تاریخی سلسلہ شعری صورت اختیار کر جائے۔ نوح بن منصور جب ۳۶۵ھ میں تخت نشین ہوا تو پایۂ تخت یعنی بخارا میں بڑے بڑے شعرار موجود تھے۔ ان میں دقیقی خاص طور سے بخارا کا رہنے والا تھا۔

ابو منصور محمد بن احمد دقیقی، بقول رضا زادہ شفق، سامانی دور کا آخری بڑا شاعر ہے۔ اور سامانی دور کے شاعروں میں اس شاعر کو رودکی کے بعد دوسرا درجہ حاصل ہے۔ عوفی کہتا ہے "اورا بسبب دقتِ معانی و رقت الفاظ دقیقی گفتندی"۔ لیکن عوفی کا یہ قول شک کی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے

استادی کے مرتبہ پر پہنچنے سے پہلے اسے دقیقی نہیں کہتے تھے اور بعد میں لوگوں نے اس کو دقیقی کہنا شروع کیا۔ ذبیح اللہ صفا نے بھی اس قول پر شک ظاہر کیا ہے۔

دقیقی کا سالِ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن اغلب یہ ہے کہ وہ قرن چہارم کے نیمہ اول کے اواسط میں پیدا ہوا۔ اس کے مولد کے بارے میں اختلاف ہے۔ عوفی نے اس کو طوسی لکھا ہے۔ بعض نے اس کو سمرقندی لکھا ہے، لیکن رضازادہ شفق کی تحقیق کے مطابق یہ بلخ کا رہنے والا تھا۔

نولدیکے اور ایتھے نے جن کے ہمنوا ذبیح اللہ صفا بھی ہیں یہ قیاس کیا ہے کہ دقیقی مذہب زردشت کا ماننے والا تھا۔ ذبیح اللہ صفا پوری طرح اس بات کے قائل ہیں کہ وہ زردشتی مذہب کا پیرو تھا۔ اور اس بات کے جواب میں کہ اس کا نام مسلمانوں جیسا کیوں تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ تاریخ میں بہت سے لوگ ہم کو ایسے ملتے ہیں جن کے نام مسلمانوں جیسے ہیں لیکن جن کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ مجوسی تھے۔ جیسے علی بن عباس مجوسی اہوازی، جو اہواز کا مشہور طبیب تھا۔ وہ دقیقی کے مذہب کے ثبوت میں چند اشعار بھی پیش کرتے ہیں جن میں دقیقی نے اپنے مذہب زردشتی پر ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

دقیقی چار خصلت برگزیدہ ست | بہ گیتی از ہمہ خولی و زشتی
لبِ یاقوت رنگ و نالۂ چنگ | مئی خوشرنگ و کیش زردشتی

یکی زردشت دارم آرزویست | کہ پیشت زند را برخوانم از بر

بیزداں کہ ہرگز نبیند بہشت | کسی کو ندارد، رہِ زردھشت

لیکن ان اشعار سے یہ فیصلہ کرنا کہ وہ دین زردھشتی کا ماننے والا تھا صحیح نہ

گا۔ کیونکہ یہ صرف شاعری کی ایک ترنگ بھی ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک رجحان
ں شعرا میں یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ خود کو مذہب اسلام سے دور ظاہر کرتے
ہیں۔ خود امیر خسروؔ کا ایک بہت مشہور مصرعہ ہے:

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

خود اردو کے مشہور شاعر غالبؔ کے اشعار میں بھی ہم کو مذہب کا کوئی
واضح تصور نہیں ملتا ہے ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں:

وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایشیائی شاعری کا رجحان یہی تھا اس بات کو
ت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ پروفیسر براؤن نے اپنی مشہور کتاب
"Literary History of Persia" میں اس کو پکا مسلمان لکھتے
ہیں۔ اس کے علاوہ رضا قلی خاں ہدایت نے اپنی کتاب مجمع الفصحاء میں دقیقی کے
واعظانہ اور ناصحانہ اشعار بھی درج کئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر صنف
میں کچھ نہ کچھ کہتا ضرور ہے۔

دقیقی پہلے چغانی کے یا آل محتاج کے امیر الدولہ ابوسعید خاں منصور چغاں
کا مداح تھا۔ دقیقی کا یہ شعر چغانیوں کے دربار سے اس کے تعلق کو ظاہر
کرتا ہے:

فرخندہ بر منصبی باطِ سیف۔
چونانکہ بر حلیم دقیقی چغانیاں

ان سب سے زیادہ دقیقی کو منصور بن نوح اور نوح بن منصور کے دورِ حکومت میں
شہرت حاصل ہوئی کیونکہ جب دقیقی کی شہرت دور دور تک ہوگئی تو اسے ابوصالح

منصور بن نوح نے اپنے دربار میں بلایا اور شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی۔ دقیقی نے یہ خدمت قبول کی اور شاہنامہ کی ابتدار کی۔ اس کے قصائد حسب ذیل امرا کی مدح میں ملتے ہیں :

۱۔ امیر ابو صالح منصور بن نوح سامانی۔

۲۔ امیر رضی ابو القاسم نوح بن منصور بن نوح (اس کے حکم سے شاہنامہ شروع کیا۔

۳۔ امیر فخر الدولہ احمد بن محمد از آل محاج۔

۴۔ امیر ابو سعید مظفر۔

۵۔ ابو نصر۔

دقیقی جوانی ہی کے زمانہ میں ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مجمع الفصحار میں رضاقلی خاں ہدایت نے اس واقعہ کا سال سن ۳۴۱ھ لکھا ہے۔ یہ واقعہ یقیناً ۳۷۰ھ سے پہلے کا ہے۔

دقیقی کے اشعار کی تعداد کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ۲۰ ہزار اشعار نظم کیے اور کوئی کہتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ۔ تعداد کتنی بھی ہو لیکن فردوسی نے ان اشعار کو اپنے شاہنامہ میں نقل کیا ہے۔ اور ان ہی اشعار کی بدولت فردوسی نے نامکمل شاہنامہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

دقیقی حالانکہ جوانی ہی میں قتل ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اوائل بن ہی میں ایک مشہور شاعر ہو گیا تھا اور بہت ہی کہنہ مشق شاعروں کا مقابلہ کرنے لگا تھا۔ اس کی استادی مسلّم ہو گئی تھی۔ دقیقی کے قصائد، غزلیات، قطعات پراگندہ صورت میں لباب الالباب، مجمع الفصحار اور کتب تاریخ و ادب مثلاً تاریخ بیہقی، ترجمان البلاغۃ، حدائق السحر، اور کتب لغت فرس اسدی، لغت نامہ دھخدا کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ لیکن

ان پراگندہ اشعار ہی سے دقیقی کی استادی، شاعری میں مہارت، دقتِ خیال اور لطافت معانی و روانی الفاظ پر یقین کامل ہو جاتا ہے۔

چند اشعار نمونہ کے طور پر جو پراگندہ شکل میں ہیں اور لغت نامہ دھخدا سے نقل کئے ہیں درج ذیل ہیں:

برخیز و برافروز ہلا قبلہ زردشت

بنشیں و برافگن قاقم بر پشت

پس کس کہ زردشت بگردید دگربار

ناچار کند بسوئے قبلہ زردشت

من سردنیابم کہ سرازآتشِ ہجراں

آتشکدہ کشتہ دل و دیدہ چو چرخشت

دقیقی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور کسی حد تک کامیاب شاعر ہے۔ مثلاً مثنوی، قصیدہ، غزل۔ ان سب کا مختصر جائزہ زیر تحریر ہے۔

مثنوی

دقیقی کو ادب فارسی میں زندگانیٔ جاوید عطا کرنے والا اس کا گشتاسپ نامہ ہے جو ساتویں سامانی امیر نوح بن منصور کے حکم سے نظم کیا۔ یعنی شاہنامہ کا ٹکڑا جو شرح سلطنت گشتاسپ اور ظہور زردشت اور جنگ مذہبی درمیانِ گشتاسپ و ارجاسپ ہے لیکن دقیقی اس شاہنامہ کے ایک ہزار اشعار ہی کہہ پایا تھا کہ غلام کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ اس شاہنامہ کے اشعار کی تعداد عوفی نے بیس ہزار اور مستوفی نے تین ہزار لکھی ہے لیکن حقیقت میں دقیقی کی وفات کے اشعار ملے ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔ فردوسی نے ان اشعار کو من وعن نقل کیا ہے اور اس نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دقیقی کا کلام سست

اتنا ہی ہے۔ دقیقی کے شاہنامہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

چو گشتاسپ را در لہراسپ تخت
فرود آمد از تخت و بربست رفت

اور اس شعر کے ساتھ اختتام ہوتا ہے:

بر آواز خسرو نہادند گوش
سپردند او را ہمہ گوش و ہوش

شعر العجم میں علامہ شبلی نعمانی فردوسی اور دقیقی کا جب تقابل کرتے ہیں تو دقی
کو فردوسی سے پست ضرور قرار دیتے ہیں۔ مگر ساتھ دقیقی کے کلام کو بھی مانتے
ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ فردوسی نے کوئی نیا کام نہیں کیا۔ دقیقی شاعری کو دو آت
کرکے چھوڑ گیا تھا فردوسی نے اس کو سہ آتشہ کرکے شاہنامہ لکھ ڈالا۔ و
لکھتے ہیں کہ دقیقی کے کلام میں بھی وہی بات ہے جو فردوسی کا سرمایۂ افتخار ہے
علامہ شبلی نعمانی کا مزید یہ بھی کہنا ہے کہ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان کو ع
الفاظ کی آمیزش سے پاک کرکے مستقل زبان کی حیثیت دی۔ دقیقی ہے۔ ذیل کا
شعر اس مثال کا ایک نمونہ ہے:

چو گشتاسپ را داد لہراسپ تخت
فرود آمد از تخت و بربست رخت

لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ سب سے پہلے دقیقی نے سادہ زبان میں شاع
کی کیونکہ رودکی کے یہاں ہم کو دقیقی سے زیادہ سادگی اور سلاست ملتی ہے۔

قصیدہ

دقیقی نے شاعری کی صنف قصیدہ کو بھی بہت ترقی دی۔ اس کے جو تھو
بہت قصیدے باقی رہ گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص سبک

روش کا مالک تھا۔ اس کے قصیدہ میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ نہیں ہے اس لئے وہ زور وشور نہیں ہے جو بعد کے قصیدہ میں ملتا ہے۔ بعد کے قصیدہ نگاروں میں تصنّع نمایاں ہے لیکن ادبی چاشنی نہیں ملتی۔ دقیقی کے یہاں ادبی ذوق کی تسکین ملتی ہے۔ اس کے یہاں وہ علمی اصطلاحات نہیں ملتیں جو انوری وغیرہ کے قصیدوں میں کثرت سے ہیں۔

قصیدے کے ضمن میں وہ پند ونصیحت، رہنمائی، اور مردانہ صفات کے حاصل کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اور اپنے ممدوح کو دلیری، سخاوت، اور فرد، یعنی ان تین بڑی صفتوں کو حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے مثلاً

دو چیز کردند سر مملکت را

یکی پرنیانی یکی زعفرانی

دقیقی کے بعض قصیدے، قطعے اور غزل کی طرح پر لطف میں اور ... دیتے ہیں جو ہم کو ایک عمدہ غزل سے حاصل ہوتی ہے۔ بعض ... میں اپنے محبوب کا سراپا کھینچا ہے جو بعد میں غزل کی ایک نمایاں صفت بن گیا مثلاً ذیل کے قصیدے میں دقیقی نے نہایت سادہ اور سہل انداز میں محبوب کا سراپا بیان کیا ہے ؎

پری چہرہ بتی عیار دلبر

نگاری سرو قد و ماہ دلبر

اس کے قصیدوں کی تشبیبوں میں عشق و محبت، ہجر و وصال کی کیفیت اس انداز میں ملتی ہے جس انداز میں ان کیفیات کا بیان بعد میں غزل کی ایک خصوصیت بن گیا۔

غزلیات

قصیدہ اور مثنوی کے علاوہ دقیقی نے غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔ اور بہت

ہی اچھی غزلیں لکھی ہیں۔ اس کی غزل کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

گویند صبر کن ترا صبر بر دہد
آری دید ولیک بہ عمر دگر دہد

دقیقی نے بعض مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں اور یہ دقیقی کے زمانے کے اعتبار سے بالکل نئی بات تھی۔ اس طرح اس کی یہ خاص ایجاد تھی۔ مسلسل غزل سے مراد وہ غزل ہے کہ شاعر پوری غزل میں جس کا ذکر بھی کر رہا ہے وہ ایک موضوع کو شروع سے آخر تک قائم رکھے۔ غیر مسلسل غزل میں یہ بات نہیں ہوتی۔ غزل کا ہر شعر جداگانہ مطلب رکھتا ہے۔ لیکن دقیقی پہلا شاعر ہے جس نے غیر مسلسل غزل کے برعکس ایسی غزل کا آغاز کیا جو ایک ہی موضوع پر پوری غزل کا خاتمہ کرے۔ اس کی ایک مسلسل غزل بہت مشہور ہے ؎

برانگندی صنم ابری بہشتی
زمیں را خلعت اردی بہشتی
بہشت عدن را گلزار ماند
درخت آراستہ حور بہشتی
زمیں برساں خون آلودہ دیبا
ہوا برساں مشک اندودہ دشتی

اس غزل میں مئی اور معشوق کی رعنائی فطرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی تشبیہیں نہایت رنگین اور خیالات نہایت لطیف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سبزے نے بہشتی خلعت زمین پر پھیلا دیا ہے اور سرخ پھولوں نے خون آلود دیبا کا لباس پہنا ہے پھول کھلے ہوئے ہیں اور ان میں گلاب کی بو مہک رہی ہے۔

(باقی آئندہ)

دعائے صحت

آج کل حضرت قبلہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ بہت کافی علیل ہیں ۔ ان کی علالت تو حضرت قبلہ مفتی صاحبؒ کی زندگی کے دوران شروع ہو چکی تھی لیکن حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد معذوری ، اضطراب اور دماغی حالت زیادہ پریشان کن ہوتی جاتی ہے

قارئین اور اپنے بزرگوں سے اپنی والدہ محترمہ کی صحت یابی اور سکون کے لیے دعا کی درخواست کرتا ہوں ۔

خادم

صاجزادہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

عمید الرحمٰن عثمانی

جدید مسائل کے شرعی احکام

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ سود و دورِ حاضر کے مسائل

از افادات مفتیٔ اعظم حضرت مولانا محمد شفیع رح

یہ کتاب جو کہ چار فقہی مسائل پر مشتمل ہے جس میں بنک و تجارتی سود اور ٹیلی ویژن، شریعت کی نظر میں V.C.R. کے استعمال کے شرعی احکام نیز موجودہ دور میں پیش آنے والے مسائل کے بارے میں جامع اور عمدہ طریقہ پر شرعی نقطۂ نظر واضح کیا گیا ہے۔

قیمت: Rs 13/25

ملنے کا پتہ: مینیجر مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

(عمید الرحمٰن عثمانی)

ایڈیٹر
سعید احمد اکبرآبادی

برہان

معاون ایڈیٹر
عمید الرحمٰن عثمانی

سالانہ چندہ
چالیس روپے

قیمت فی پرچہ
تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۵	جمادی الاول ۱۴۰۵ھ مطابق فروری ۱۹۸۵ء	شمارہ ۲

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

ہم نے گذشتہ چند مہینوں میں مسز اندرا گاندھی پر جو نظرات لکھے تھے ان میں ہم نے صاف تحریر کیا تھا کہ اندرا حکومت ایمرجنسی کے بعد اس درجہ شاندار اور کامیاب نہیں رہی جیسی کہ امرجنسی سے پہلے تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ عہدیداران وافسران حکومت میں کرپشن عام ہو گیا تھا اس لئے حکومت کی پالیسی اور اس کے احکام کچھ تھے اور یہ لوگ کرتے کچھ تھے، آخر اندرا گاندھی خود اندرون ملک کرپشن کا شکار ہو گئیں۔ مسز اندرا گاندھی نہایت ذہین اور بیدار مغز خاتون تھیں اور حکومت کی ایک ایک کارگذاری پر ان کی نگاہ تھی لیکن بہرحال ان کے پہلو میں ایک عورت کا دل تھا جس پر عفوو درگذر اور چشم پوشی کی صفت کا غلبہ ہوتا ہے اس بنا پر افسران حکومت کے corruption کے خلاف وہ کوئی مؤثر اور عملی قدم نہیں اٹھا سکیں اور اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ دنیا کے سامنے ہے۔

لیکن راجیو گاندھی اپنی ماں کے جواں سال، جواں ہمت اور پُر از حوصلہ و اُمنگ نوجوان ہیں انھوں نے عقل کے ناخن اس وقت لئے ہیں جب ملک آزاد ہو چکا تھا اس بنا پر ان کا دماغ ان اثرات سے بالکل پاک وصاف ہے جو تقسیم سے پہلے کی فرقہ وارانہ سیاست نے لوگوں کے دماغ پر اس طرح مسلط کر دی تھی کہ کوئی شخص خواہ کیسا ہی ہو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس فضا کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ان وجوہ

کی بنا پر راجیو گاندھی کا دماغ کھلا ہوا اور روشن ہے۔ ان کے ارادے میں پختگی عزم میں
استقلال اور ان کے سامنے مستقبل کا ایک واضح پروگرام ہے چنانچہ وزیراعظم بننے کے
بعد ہی انھوں نے اپنی گورنمنٹ کی پالیسی کا اور ملک کے اندرونی اور بیرونی معاملات
میں اصلاحات کا جو ایک مرتب اور واضح پروگرام شائع کیا تھا اب انھوں نے ان کی
طرف عملی اقدامات شروع کر دیئے ہیں اس سلسلے میں انھوں نے کہا تھا کہ پہلی ضرورت
Administration سے Correption کو دور کرنا ہے۔ اس سلسلے میں
انھوں نے جاسوسی کے الزام میں اپنے اور صدر جمہوریہ کے Seceeteriat
کے بڑے بڑے افسروں اور ساتھ ہی چند اور بڑے ذمہ دار لوگوں کو حوالہ عدالت کر کے
وزیراعظم نے جو نہایت اہم اور نہایت ضروری اقدام کیا ہے وہ نہایت قابل تعریف
اور قابل ستائش ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی تعلقات کو بہتر سے بہتر بنانے
کے لئے جو اعلانات کئے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے پڑوسی ممالک کے لوگوں اور حکومتوں
پر ان کے نہایت خوشگوار اثرات پیدا ہوئے ہیں اور باہمی دوستی اور خیر اندیشی کی راہ
ہموار کرنے کے لئے مضبوط بنیاد قائم ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہم عرض کرنا چاہتے
ہیں کہ ایک حکومت کے عہدے دار یا افسر کا Correption صرف یہی نہیں ہے
کہ وہ بیرونی ممالک کے لئے جاسوسی کا کام کرے بلکہ ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ ہر وہ افسر
جو اپنے فرائض منصبی کو نظر انداز کر کے ایسے اعمال کا مرتکب ہو رہا ہے جن سے ہندوستان
کے مختلف فرقوں میں جھگڑے اور لڑائیاں ہوں اور ملک میں اتحاد و یکجہتی اور یگانگت
کی فضا نہ پیدا ہو ایسا افسر بھی بلا شبہ Corrupt ہے اور وہ اس کا مستحق ہے
کہ حکومت اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرے۔ وزیراعظم نے جیسا کہ توی توقع
ہے کہ اس طرف بھی توجہ کی تو ہمیں امید ہے کہ ملک میں آئے دن فرقہ وارانہ فساد
ہوتے رہتے ہیں اور جو ملک کی رسوائی اور بدنامی کا باعث ہیں ان کا بھی بہت جلد

سدباب ہوجائے گا۔

اب ہم ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ ملک میں جو ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوئی ہے اور ملک نے از سرِنو اپنے جواں سال وزیراعظم کی قیادت میں جس خوداعتمادی اور ولولہ اور حوصلے کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف چلنا شروع کیا ہے مسلمانوں کو کھلے دل و دماغ سے ان سب چیزوں کا جائزہ لے کر اس کی باہمہ وجوہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ملک کی تعمیر و ترقی میں دوسرے برادرانِ وطن سے مل کر مثبت اور مؤثر حصہ لیں۔ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا رویہ آزادی کے بعد سے اب تک بجائے مثبت کے منفی اور بجائے حقیقت پسندانہ کے جذباتی رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک مسلمانوں میں کوئی صحیح، تندرست اور فعال متحرک لیڈرشپ پیدا نہ ہوسکی۔ ان میں دسیوں پارٹیاں پیدا ہوئیں مگر ہر ایک اپنی ڈفلی اور اپنا راگ لے کر بیٹھ گئی اور کبھی تعمیری نقطۂ نظر سے یہ نہیں سوچا کہ قوموں کی قسمت ماتم سرائی اور نوحہ دگلہ مندی سے کبھی نہیں بدلتی بلکہ ایک مثبت اقدام سے بنتی ہے۔ اس جدید فضا میں ہماری رائے ہے کہ مسلمانانِ ہند کو اپنا ایک convention منعقد کرنا چاہیے جس میں وہ ملک کے اندرونی اور بیرونی حالات کا معروضی نقطۂ نظر سے کھلے دماغ سے جائزہ لیں اور مستقبل کے لئے ایک واضح اور روشن پروگرام مرتب کریں۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو یقین ہے کہ اس ملک میں ان کا مستقبل روشن ہوگا۔

میری طویل علالت کی خبریں پاکستان میں میرے بچوں کو برابر پہنچ رہی تھیں اور وہ لوگ سخت پریشان تھے کہ اب تک علالت کا سلسلہ کیوں جاری ہے اور افاقہ اور

صحت کے آثار و قرائن کیوں نہیں پیدا ہو رہے ہیں۔ اس بنا پر انھوں نے یہ طے کیا کہ مجھ کو پاکستان آجانا چاہیے۔ چنانچہ میری بیٹی ان سب کی نمائندہ بن کر ۹ جنوری ۱۹۸۵ء کو اچانک ہوائی جہاز کے ذریعہ کراچی سے علی گڑھ پہنچ گئی اور ۱۴ جنوری کو خود میرے ایک نہایت قدیم وفادار اور مخلص Faculty of Theology کے پرانے دفتری میاں محمود بخش کو ساتھ لے کر نئی دہلی پہنچی اور تین چار گھنٹے ہی میں میرے visa اور دوسری ضروری کارروائیاں اور ہوائی جہاز میں میری سیٹ Reserve کرا کر شام کو علی گڑھ واپس آگئی اور بالآخر میں ۱۸ جنوری کی شام کو PIA سے بخیر و عافیت کراچی پہنچ گیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے علاج و معالجہ، دوا دارو، راحت و آسائش اور دیکھ بھال کے جو اعلیٰ سے اعلیٰ انتظامات ہیں وہ سب بہمہ وجوہ میسر ہیں اور اب اس کا اثر یہ ہے کہ مرض کا اصل سبب جو علی گڑھ کے ڈاکٹروں کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کراچی آنے کے دو دن بعد ہی مشین کے ذریعے آدھے گھنٹے میں بالکل صاف اور واضح طور پر معلوم ہو گیا اور اس رپورٹ کی روشنی میں کراچی کے دو نہایت مشہور اور نامور ڈاکٹروں نے علاج شروع کر دیا ہے۔ اس بنا پر اللہ کے فضل و کرم سے اب میری صحت نسبتاً کافی بہتر ہو گئی ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ طبیعت نے مکمل صحت کی منزل کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ قارئین برہان اور احباب سے دعا ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں حسب معمول ہمیشہ یاد رکھیں۔

عہد سلطنت کے فقہی لٹریچر کا ایک تنقیدی جائزہ

(۱)

جناب ظفر الاسلام صاحب، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

مذہبی علوم وفنون میں فقہ کو چند وجوہ سے ایک خاص اہمیت حاصل ہے، اول یہ کہ اس کا تعلق زندگی کے مختلف النوع مسائل سے ہے، عبادات ہو یا معاملات، معاشرتی امور ہوں یا معاشی، ملکی مسائل ہوں یا بین الاقوامی یہ تمام موضوعات فقہ کے تحت زیر بحث آتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی رسائی تعبدی یا عائلی زندگی کے چند مخصوص مسائل تک محدود نہیں بلکہ یہ عملی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس فن کا دوسرا امتیازی پہلو یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول ؐ اس کے بنیادی ماخذ ہیں۔ مزید براں علم فقہ کا یہ بھی ایک اختصاص ہے کہ یہ بذاتِ خود دیگر علوم وفنون کی ترقی و توسیع کا باعث بنا۔ علم فقہ کی داغ بیل اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور ہی میں پڑ چکی تھی لیکن اس کی نشو ونما دوسری و تیسری صدی ہجری کی مرہونِ منت ہے۔ اسی عہد میں فقہ کے معروف مذاہب وجود میں آئے اور فقہاء مجتہدین نے فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین کا اہم کام انجام دیا۔ فقہ کی ترویج و اشاعت کے لئے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف دونوں ذرائع اختیار کئے گئے۔ اہل علم اور

اصحاب فقہ کی کاوشوں کے نتیجہ میں دیگر علوم و فنون کے ساتھ علم فقہ بھی اسلامی دنیا میں پروان چڑھتا رہا اور مقامی فقہاء کے رجحانات کے اعتبار سے مختلف علاقوں میں ــــــــ مختلف مذاہب فقہ کو مقبولیت حاصل ہوئی مثلاً حجاز و یمن میں فقہ شافعی، نجد میں فقہ حنبلی، اندلس و شمالی افریقہ کے مغربی حصہ میں فقہ مالکی اور وسط ایشیا کے بیشتر ممالک۔ عراق، ماوراء النہر، آذربائیجان، افغانستان وغیرہ میں فقہ حنفی کو رواج ملا۔

وسط ایشیا میں منگولوں کی یورش نہ صرف سیاسی تباہ کاری کا باعث بلکہ علمی و ثقافتی زندگی کے لئے بھی ضرر رساں ثابت ہوئی۔ ان حالات میں ہندستان نے اس علاقہ کے اہل علم و فن کو اپنی جانب متوجہ کیا جہاں مسلم حکومت سلاطین دہلی کی قیادت میں اپنے قدم جما رہی تھی اور اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک نیا مرکز تعمیر کر رہی تھی۔ سلاطین کی علم دوستی، معارف پروری اور فیاضی و فراخدلی کے باعث دہلی مختلف علوم و فنون کے ماہرین کے لئے ایک بہترین مرجع و ماویٰ ثابت ہوا۔[۱] مشرق وسطیٰ سے مسلمانوں کی آمد زیادہ تر خراسان و ماوراء النہر کے راستہ سے ہوئی اور وہ ان علوم و فنون کے ساتھ وارد ہند ہوئے جو ان کی سرزمین میں رائج و مقبول تھے۔

---

[۱] منہاج السراج، طبقات ناصری، کابل، سنہ ۱۹۶۴ء، ص ۱۶۶، عصامی، فتوح السلاطین، مدراس، سنہ ۱۹۴۸ء، ص ۱۱۴، ۱۱۵، ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، سنہ ۱۸۶۲ء، ص ۳۴۱، ۳۵۲، ۳۵۴، ابن بطوطہ، رحلہ، مطبعہ ازہریہ، مصر، سنہ ۱۹۲۸ء، ص ۱۶، امیر خسرو، نہ سپہر، کلکتہ، سنہ ۱۹۴۸ء، ص ۱۴۳، مثنوی دولرانی خضر خاں، مطبوعہ علی گڈھ، سنہ ۱۹۱۷ء، ص ۴۶، ۴۷، شیخ نور الحق دہلوی، زبدۃ التواریخ، اوٹوگراف ص ۱۸ (مخطوطہ برٹش میوزیم) ریسرچ لائبریری شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، ورق ۳۰ ب۔

دینی علوم کے جو ماہرین یہاں منتقل ہوئے ان میں اکثریت فقہار کی تھی۔ فقہی علوم ان کی توجہ کا خاص مرکز بنے اور اسی میدان میں ان کی صلاحیتیں نمایاں ہوئیں۔ ان کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں علمی حلقوں میں فقہ کا رنگ ایسا غالب ہوا کہ فقہ و اصول فقہ کی تحصیل معیار فضیلت قرار پایا اور کسی کی صلاحیت ولیاقت جانچنے کے لیے فقہی علوم میں مہارت کو خاص اہمیت دی گئی۔ مزید براں یہ علم مذہبی عہدوں (مثلاً قاضی، محتسب ومفتی وغیرہ) اور سلطان سے تقرب کے حصول میں بھی مدد و معاون ثابت ہوتا تھا۔ ان تمام عوامل کی وجہ سے مذہبی علوم میں فقہ پر خاص توجہ دی گئی اور اس کے سیکھنے سکھانے کا رواج عام ہوا۔ مدارس کے نصاب میں فقہ واصول فقہ کو نمایاں مقام ملا[۱]۔ مذاکرات وعلمی مجالس میں زیادہ تر فقہی مسائل موضوع بحث بنے اور تالیف وتصنیف کے میدان میں بھی فقہ علمار کا ایک پسندیدہ موضوع قرار پایا۔

فقہ اسلامی میں علمار وفضلار کی غیر معمولی دلچسپی سے قطع نظر اس فن سے سلاطین و امرار کا لگاؤ بھی قابل ذکر ہے اس لئے کہ یہ بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں طریقہ سے فقہی علوم کی ترویج وترقی کا سبب بنا۔ مذہبی علوم وفنون میں فقہ سے ان کی خاص مناسبت کی وجہ یہ اس سرزمین (غزنین وغور) کے علمی ماحول کا اثر تھا جہاں سے یہ سلاطین اور ان کے رفقار حکومت اصلاً تعلق رکھتے تھے۔ مزید براں اس تعلق کو استوار کرنے میں معاصر علمار (بالخصوص مقربین بارگاہ) کے ذاتی رجحانات اور ان کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت حکومت کے شعبوں میں قضا کو خاص

---

[۱] سیرت فیروز شاہی، نقل (مخطوطہ اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور) مولانا آزاد لائبریری یونیورسٹی کلکشن، نمبر ۱۱۱، ص ۱۴۷، ابوالعباس القلقشندی، صبح الاعشیٰ، مطبع امیریہ، القاہرہ ۱۹۱۵ء، الجزر الخامس، ص ۷۱۔

اہمیت حاصل تھی اور اس شعبہ سے وہی علماء منسلک کئے جاتے تھے جو فقہ میں مہارت رکھتے تھے[۱]۔ قاضیوں کے ساتھ مفتیوں کا تقرر بھی عمل میں آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی فقہی علوم سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ قاضیوں کو قانونی مشورہ بہم پہونچانے اور بعض مشکل مسائل میں فقہی نقطۂ نظر کی وضاحت کے علاوہ یہ سلاطین کو بھی وقتاً فوقتاً درپیش مسائل میں احکام شرعی سے روشناس کراتے تھے[۲]۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ علماء کا وہ طبقہ جو انتظامیہ کا ایک جز تھا اور اس حیثیت سے سلطان سے با قاعدہ ربط ضبط رکھتا تھا۔ فقہی علوم میں شغف و دلچسپی رکھنے والا طبقہ تھا۔ اس کے کوئی معنی نہیں کہ یہ طبقہ دربار کے علمی ماحول اور خصوصی طور پر سلطان کی علمی دلچسپیوں پر اثرانداز نہ ہوا ہو۔ ماہرین فقہ سے اس خصوصی تعلق کے علاوہ سلاطین کے بارے میں تاریخی ماخذ میں یہ عمومی ذکر ملتا ہے کہ وہ سفر و حضر میں علماء کی صحبت کو پسند کرتے تھے اور ان کے مشوروں سے مستفید بھی ہوتے تھے[۳]۔ اور بعض سلاطین کے بارے میں صراحۃً

۱؎ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۵۱-۳۵۲، ۳۸۰

۲؎ برنی، ص ۲۹۷۔

۳؎ حسن نظامی، تاج المآثر، مائکروفلم نمبر ۱۳۹ (مخطوطہ ببلیوتھک نیشنل) ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، طبقات ناصری، ص ۱۶۵، برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۶، ۴۷، ۱۱۱، ۱۱۲، ۲۹۰، ۲۹۶، ۴۴۱، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۵۸، ۵۵۹، یحییٰ سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ، ۱۹۳۱ء، ص ۱۱۵، ۱۱۶، شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، ص ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۲۹، ۱۳۰، فتوحات فیروز شاہی، علی گڑھ، ص ۸-۱۰۔ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار (انگریزی ترجمہ اٹو اسپیس) علی گڑھ ۱۹۴۳ء، ص ۳۷، ۳۸، ۵۱، ۵۲، صبح الاعشیٰ، ص ۹۵، ۹۶، رزق اللہ مشتاقی،

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مذکور ہے کہ ان کے دستر خوان پر روزانہ سینکڑوں فقہار شریک ہوتے تھے اور اس موقعہ پر مختلف مسائل زیر بحث آتے تھے[۱] معاصر مؤرخین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلاطین اور اہل علم وفقہ کے تعلقات محض رسمی نوعیت کے نہیں تھے بلکہ سیاسی وسماجی معاملات میں ان سے وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیالات بھی کرتے تھے اور اس دور کے بعض مخصوص مسائل میں شرعی نقطۂ نظر کی وضاحت بھی ان سے طلب کرتے تھے۔ اس دور میں سلاطین وعلماء کے مابین مختلف مسائل پر بات چیت کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان میں اہم و قابل ذکر ہندوؤں کی شرعی حیثیت، مال مغنومہ میں سلطان کا حصہ اور بیت المال میں سلطان اور اس کے اہل وعیال سے متعلق علاء الدین خلجی اور قاضی مغیث کا مکالمہ[۲] ۔ حدود شرعی کی بابت محمد بن تغلق اور ضیاء الدین برنی کے مابین بحث ومباحثہ[۳] اور سماجی ومعاشی اصلاحات اور بعض گمراہ کن فرقوں کی سرگرمیوں کے سدباب کے لئے فیروز شاہ تغلق اور معاصر علماء کے درمیان مختلف مواقع

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) واقعات مشتاقی، اوٹوگراف نمبر ۳ (مخطوطہ برٹش میوزیم) ریسرچ لائبریری شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، ص ۴۹، زبدۃ التواریخ، محولہ بالا، ص ۴۳، احمد یادگار، تاریخ شاہی کلکتہ، سنہ ۱۹۳۹ء، ص ۴۶۔

[۱] برنی (تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶) غیاث الدین تغلق کی بابت، القلقشندی (صبح الاعشی ص ۹۵) محمد بن تغلق اور رزق اللہ مشتاقی (واقعات مشتاقی، ص ۴۹) سکندر لودی کے متعلق ذکر کرتے ہیں کہ یہ سلاطین ماہرین فقہ سے شاہی دستر خوان پر دینی وفقہی مسائل پر گفتگو کرتے تھے نیز دیکھئے تاج المآثر، ص ۳۶۶، فتوح السلاطین، ص ۲۱۹، برنی، ص ۲۱۱، ۲۱۲۔

[۲] برنی، ص ۲۹۰، ۲۹۶۔

[۳] برنی، ص ۵۱۰، ۵۱۱۔

پر تبادلۂ خیال وغیرہ[۱]

فقہی مسائل اور ان کی تحقیق سے سلاطین کی دلچسپی اس امر سے بھی واضح ہے کہ قاضیوں، مفتیوں اور علماء سے انفرادی طور پر استفسار کرنے کے علاوہ بعض اہم مختلف فیہ مسائل میں علماء کی مجموعی رائے جاننے کے لئے باقاعدہ علمی مذاکرے اور بحث و مباحثہ کی مجلسیں منعقد کراتے تھے جن کے لئے اس وقت محضر کی اصطلاح رائج تھی۔ عہد سلطنت میں اس طرح کے محضر کا متعدد بار منعقد ہونے کا ثبوت ملتا ہے[۲]۔ سلطان التتمش اور غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں جو محضر بلایا گیا تھا اس کا موضوع بحث شریعت کی روشنی میں سماع کی حیثیت کا تعین تھا[۳]۔ سلطان جلال الدین خلجی نے سیدی مولا کے خلاف بغاوت کے الزام کی تحقیق اور اس پر شرعی فیصلہ کے لئے محضر طلب کیا تھا[۴]۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں بعض امراء کی جانب سے ایک دوسرے شخص کو سلطان بنانے کی کوشش پر تخت نشینی کے مسئلہ پر غور کرنے[۵]، برہمنوں پر جزیہ

۱۔ فتوحات فیروز شاہی ص ۷،۵، ۹، عفیف ص ۱۲۹، ۱۳۰، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۸۰، ۳۸۳۔

۲۔ محضر میں شرکت کے لئے ملک کے مختلف اطراف، بالخصوص دہلی کے ممتاز و نامور علماء کو دعوت دی جاتی تھی اور کسی ایک عالم کو حکم یا صدر مجلس کے طور پر مقرر کیا جاتا تھا۔

۳۔ فتوح السلاطین، ص ۱۱۸-۱۱۹، سید محمد کرمانی، سیر الاولیاء، مرکز تحقیقات فارسی، لاہور، ص ۵۳۷، ۵۳۹۔

۴۔ یحییٰ بن احمد سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ، ۱۹۳۱ء، ص ۶۵-۶۷، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۲۸۳ھ، ص ۴۳۔

۵۔ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۲۱، ۱۲۲، نظام الدین بخشی، طبقات اکبری، نولکشور ۱۸۷۹ء، ص ۱۱۳۔

عائد کرنے[1]، "حق شرب" کے نام سے ایک نیا محصول لگانے[2]، گمراہ فرقوں کے خلاف شریعت کی روشنی میں اقدام کرنے[3]، ارتداد کے بعض مقدمات کا تصفیہ کرنے اور سماجی و معاشی اصلاحات پر غور و فکر کے لئے متعدد بار علمار کی مجلسیں منعقد کی گئی تھیں[4]۔ سکندر لودی نے اپنی شہزادگی اور سلطنت کے دوران دوبار محضر طلب کیا تھا۔ پہلی دفعہ کروکشیتر کے ایک کنڈ ختم کرنے کا مسئلہ زیر بحث آیا جہاں مختلف علاقوں سے کفار جمع ہوتے تھے اور کچھ مذہبی رسوم انجام دیتے تھے[5]۔ دوسری دفعہ ارتداد کا ایک مسئلہ موضوع بحث تھا[6]۔

سلاطین کے استفسار کے بغیر علمار اپنے طور پر بھی انھیں احکام شرعی سے واقف کراتے تھے بالخصوص ان امور میں جہاں انھیں شریعت کی خلاف ورزی نظر آتی اور بعض مشائخ اپنے پند و نصائح میں درباری ماحول، شاہی زندگی اور نظم و نسق میں رائج غیر اسلامی اعمال و رسوم کی نشاندہی اور شرعی نقطۂ نظر کی وضاحت پر خاص زور دیتے تھے۔ عہد التتمش کے مشہور عالم سید نور الدین مبارک غزنوی نے اپنے ایک وعظ میں سلطان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تھی کہ درباری زندگی میں خورد و نوش

---

[1] عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۸۲، ۲۸۳۔

[2] عفیف، محولہ بالا، ۱۲۹ - ۱۳۰۔

[3] فتوحات فیروز شاہی، ص ۷-۹

[4] عفیف، ۳۷۹ - ۳۸۲۔

[5] عبداللہ داؤدی، تاریخ داؤدی (تصحیح پروفیسر عبدالرشید) مطبوعہ علی گڑھ، ص ۲۹-۳۰، تاریخ شاہی، ص ۳۰-۳۱۔

[6] تاریخ داؤدی، ص ۵۹-۶۰، طبقات اکبری، ص ۱۶۳، ۱۶۴۔

اور نشست و برخاست کے جو طریقے رائج ہیں اور شاہی آداب بجالانے کے لئے پابوسی جیسی جو رسمیں معمول بہ ہیں وہ غیر اسلامی ہیں[۱] سلطان جلال الدین خلجی نے جب سیدی مولا اور ان کے مصاحبین کے خلاف بغاوت کے الزام کی صحت و عدم صحت کو آگ کے ذریعہ جانچنا چاہا تو معاصر علماء نے اسے خلاف شریعت قرار دیا، اس وضاحت کے بعد سلطان نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔[۲] محمد بن تغلق نے ایک بار قحط کے زمانہ میں لوگوں کو دہلی کے باہر کاشت کرنے اور شاہی گودام میں غلہ جمع کرنے کا حکم دیا۔ ایک معاصر عالم مولانا عفیف کاشانی نے اس اسکیم سے اختلاف ظاہر کیا۔[۳] متعلقہ ماخذ میں صراحتاً اس کی کوئی وجہ مذکور نہیں۔ غالباً اسے "جبری زراعت" تصور کرتے ہوئے اس پر اعتراض کیا گیا ہوگا۔ عہد تغلق کے معروف عالم اور سہروردی سلسلہ کے مشہور بزرگ سید جلال الدین بخاری (معروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت) نے آتشبازی جیسی غیر اسلامی رسموں کو ہدف تنقید بنایا تھا جو اس دور میں شب برات کے موقعہ پر عوام کے علاوہ حکومت کے زیر اہتمام بھی انجام پذیر ہوتی تھیں[۴]۔ سید جلال نے ان ٹیکسوں کے خلاف بھی اظہار کیا جو شریعت کے متعینہ محاصل میں شامل نہیں تھے

۱۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۴۱، سید مبارک غزنوی کے حالات کے لئے ملاحظہ کیجئے، اخبار الاخیار ص ۳۲-۳۳۔

۲۔ برنی، محولہ بالا، ص ۲۱۱۔

۳۔ رحلہ ابن بطوطہ، الجزء الثانی، ص ۵۵۔

۴۔ سراج الہدایہ (ملفوظات سید جلال الدین بخاری) مرتبہ قاضی سجاد حسین، انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء ص ۱۱۱، ۱۱۲۔

لیکن حکومت کے ذرائع آمدنی کا جز تھے[۱] سید جلال فیروز شاہ کے بھی معاصر تھے اور کوئی تعجب نہیں کہ غیر شرعی محاصل کی معافی کا اعلان اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت تنبیہ کرتے وقت فیروز شاہ سید جلال کے خیالات سے بھی متاثر ہوا ہو[۲]۔ اسی دور کے ایک دوسرے بزرگ شیخ قطب الدین منور نے شراب خوری سے احتراز پر زور دیا جس سے شاہی دربار اور امراء کی پر مسرت محفلوں میں بہت کم احتیاط برتی جاتی تھی[۳] ماخذ سے یہ بھی ثابت ہے کہ سلطان سکندر لودی کے ہمعصر عالم عبدالوہاب بخاری نے سلطان کو اس کی ذاتی زندگی کے بعض غیر شرعی پہلو بالخصوص ڈاڑھی نہ رکھنے پر انتباہ کیا تھا[۴]۔ سلاطین کی روزمرہ کی زندگی اور سیاسی و انتظامی امور میں علماء کی جانب سے شرعی نقطہ کی وضاحت کی یہ چند مثالیں ہیں۔ اس نوع کے متعدد واقعات تاریخی تذکروں سے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سلاطین مختلف ذرائع سے شریعت کے اوامر و نواہی اور فقہ کی تفصیلات سے روشناس ہوتے رہتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ان تمام مسائل میں جن کے متعلق وہ خود

۱؎ سراج الہدایہ، محولہ بالا، ص ۲۱۱، ۲۱۴۔ سید جلال کے حالات کے لئے ملاحظہ کیجئے، اخبار الاخیار ص ۶۳۔

۲؎ عفیف، ص ۳۷۵، ۳۷۷، پروفیسر خلیق احمد نظامی کے الفاظ میں "فیروز شاہ نے جو غیر شرعی ٹیکس معاف کیے تھے اس میں یقیناً مخدوم جہانیاں کا بھی اثر تھا" (سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ادارہ ادبیات دلی، ۱۹۸۱ء، ص ۴۲۰۔

۳؎ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۷۹۔

۴؎ واقعات مشتاقی، ص ۱۲-۱۳، تاریخ شاہی ص ۶۳-۶۵، زبدۃ التواریخ، ورق ۷۲-۷۳۔

تحقیق کراتے یا بغیر استفسار علمار کی جانب سے انھیں وضاحت ملتی تھی۔ علمار کی رایوں وفیصلوں پر عمل کرتے تھے لیکن یہ طے شدہ ہے کہ سلاطین کی یہ تحقیق وجستجو وفقہی مسائل سے ان کی دلچسپی ظاہر کرتی ہے علمار کی تشریح و توضیح اس دلچسپی کو بڑھانے میں یقیناً ممد ومعاون ثابت ہوئی ہوگی۔

(باقی آئندہ)

اعلان

حضرت مفتی صاحبؒ کے سلسلے میں جو خاص نمبر شائع ہونے جارہا ہے اس کی تاخیر کی اصل وجہ حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب ایڈیٹر رسالہ برہان کی طویل علالت ہے۔ آپ سے ان کی صحت کلّی کے لئے دعا کی استدعا کرتا ہوں اور انشاء اللہ تعالیٰ میری یہ کوشش رہے گی کہ یہ شاندار معیاری نمبر حضرت مفتی صاحبؒ کے شایان شان بہت جلد شائع ہو اور حضرت مفتی صاحبؒ کے نام سے ایک اکیڈمی قائم کی جائے اور ان کی میموریل سوسائٹی یقیناً بنی چاہیئے اور مفتی عتیق الرحمن روڈ جامع مسجد کے علاقے میں قائم کی جائے۔ اس لئے دہلی اور باہر کے حضرات، حضرت مفتی صاحبؒ کے معتقدین اور محسنین سے اپیل کرتا ہوں کہ اس معاملے میں پوری دلچسپی لیں، میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ شکریہ!

خادم

عمید الرحمن عثمانی
مینیجر رسالہ برہان دہلی

بقیہ: دقیقی طوسی

زبس بانگ اسپان و جوش و خروش

ہمی نالۂ کوس نشنیدہ گوش

درفشانِ بسیار افراشتہ

سنبز نیزہا ز ابر بگزاشتہ

بقول مولانا شبلی فردوسی نے بے شبہ اس وصف کو کمال تک پہنچایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ وہی شراب ہے جو دوبارہ کھینچ کر لائی گئی ہے۔

اس مختصر لیکن جامع تذکرے سے میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ دقیقی طوسی حقیقت میں سامانی دور کا ایک بڑا شاعر ہے۔ اپنی گوناگوں شاعرانہ خوبیوں کی بنا پر دقیقی کا نام تاریخ ادبیات ایران میں زندۂ جاوید رہے گا۔

مطالعہ کتب

۱۔ تاریخ ادبیات ایران — رضا زادہ شفق

۲۔ شعر العجم — شبلی نعمانی

۳۔ صنادید عجم — مہدی حسن ناصری

۴۔ تاریخ ادبیان در ایران — ذبیح اللہ صفا

۵۔ LITERERY HISTORY OF PERSIAN — براؤن

۶۔ لغت نامہ دھخدا — (دش۔ دل صفحہ نمبر ۷۰)

۷۔ سخن و سخنوران — (ج ۱ ص ۱۲)

امیر الامراء رئیس الاولیاء

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار نقشبندی رح

ایک مطالعہ

جناب تقی انور صاحب علوی کاکوروی

حضرت خواجہ کے شکل و شمائل

اگرچہ ملفوظات میں اس قسم کے بکثرت واقعات کا تذکرہ ہے مگر میں نے صرف وہ چند امور نقل کیے ہیں جن کا تاریخی ثبوت بھی فراہم ہے۔ دوسرے بعض واقعات مورخین کی تنقیدی نگاہ میں ہر چند کہ استناد کے درجہ تک نہیں پہنچتے۔ مگر ہم کو ان کے مطالعہ نے اس طرف متوجہ کیا کہ حضرت خواجہ کے ظاہری اکتسابات، شکل و شمائل اور روزمرہ کی زندگی و معاشرت کا بھی ملفوظات سے مطالعہ کریں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ دراصل آپ میں وہ صفاتِ ظاہری بھی موجود تھے جن کا جامع ہونا ایسی اہم خدمات کے سرانجام دینے کے لئے ضروری ہے۔

صورت

حضرت خواجہ کے اصحاب میں سے ایک شخص کا بیان ہے کہ میں ایک روز حضرت خواجہ نظام الدین سمرقندی رح کی خدمت میں حاضر تھا۔ اتنے میں ایک حسین جوان آیا جس کا چہرہ

انتہائی نورانی اور بارعب وجلال تھا، اور وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آ گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد حضرت مخدوم نظام الدینؒ سے میں نے پوچھا کہ یہ کون شخص تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہی خواجہ عبید اللہ احرارؒ ہیں۔

حفظِ ادب

ایک ارادت مند کا بیان ہے کہ میں نے پینتیس ۳۵ سال آپ کی خدمت کی اور خلوت و جلوت میں ساتھ رہا۔ اس طویل مدت میں آپ کو کبھی کوئی ایسی بات کرتے نہیں دیکھا جس سے دوسرے کی طبیعت مکدّر ہوتی ہو۔ کبھی آپ نے سیب یا انگور کھانے کے بعد چھلکا منہ سے نکال کر نہیں پھینکا اور نہ بلغم یا رطوبت کو اس طرح کھنکھار کر خارج کیا کہ دوسرے کو کراہت ہوئی ہو۔

ایثار

آپ کا اپنا بیان ہے کہ ابتدا میں جب میں موضع ہری میں تھا تو میرے افلاس کا یہ حال تھا کہ پیسہ کوڑی تو درکنار صرف ایک پگڑی تھی اور وہ بھی اس قدر چھوٹی اور بوسیدہ کہ ایک طرف کا پیچ ٹھیک کرتا تھا تو دوسری طرف سے کھل جاتی تھی۔ ایک روز اتفاقاً بازار سے گذر رہا تھا کہ ایک فقیر نے مجھ سے سوال کیا میرے پاس سوا اس پگڑی کے کچھ نہ تھا۔ میں نے فوراً اتار کر ایک نانبائی کو دی اور کہا کہ یہ پاک ہے، اس کو لے لو دیگ پونچھنے کے کام آئے گی اور اس کے عوض اس فقیر کو کچھ کھلا دو۔

خدمتِ خلق

آپ نے بیان فرمایا کہ میں جس زمانہ میں سمرقند میں مولانا قطب الدین کے مدرسہ میں تھا تو کئی آدمیوں کی جو ایک ہی قسم کے متعدی مرض میں مبتلا تھے خدمت کرتا تھا۔ اُن کو پاخانہ پیشاب تک کا ہوش نہ تھا۔ دن و رات میں کئی کئی مرتبہ ہر شخص کے کپڑے و بچھونے خراب ہوتے تھے جن کو میں برابر دھویا کرتا تھا۔ آخر مجھ کو بھی وہی مرض لاحق ہو گیا جو ان لوگوں

کو تھا۔ ایک رات میں سخت تپ محرقہ میں بھن رہا تھا۔ اس حالت میں بھی کئی گھڑے پانی بھر کر میں نے ان بیماروں کے کپڑے اور بستر دھوئے اور جس زمانہ میں ہری میں تھا پیر ہری کے فارم میں جاکر لوگوں کی خدمت کیا کرتا تھا۔ بعض دفعہ پندرہ سولہ آدمیوں کی ایک ساتھ خدمت کی۔ خدمت کرنے میں کبھی اچھے برے، آزاد یا غلام کا فرق نہیں کیا اور قبل اس کے کہ کوئی مجھے میری خدمت کا بدلہ دے وہاں سے چپ چاپ چل دیا کرتا تھا۔

جواں مردی اور ہمت

آپ نے بیان فرمایا کہ میں بچپن میں بہت ڈرتا تھا ایسا کہ گھر سے باہر نہ نکلتا تھا۔ ایک رات دل میں شدت سے داعیہ پیدا ہوا کہ اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت کرنا چاہیئے۔ چنانچہ شیخ ابوبکر قفال شاشی اور وہاں سے شیخ خاوند طہور اور خواجہ ابراہیم کیمیا گر اور اس کے بعد شیخ زین الدین دعائے عارفاں کے مزارات پر گیا اس وقت سے خوف جان سے دور ہو گیا حتیٰ کہ تاشقند کے تمام بزرگوں کے مزارات پر جو ایک دوسرے سے فاصلہ پر تھے ایک رات میں سب جگہ گشت کر لیتا تھا۔ بعض مزارات تو ایسی جگہ واقع تھے کہ لوگ وہاں دن میں بھی تنہا جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایک رات شیخ زین الدین دعائے عارفاں کے مزار کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک پاگل شخص آپہنچا، یہ شخص بڑا لمبا چوڑا قوی ہیکل و خوفناک شکل کا تھا۔ دن دہاڑے لوگ اس سے ڈرتے تھے اور انہیں دنوں وہ شخص ایک آدمی کو قتل کر چکا تھا۔ میرے قریب پہنچکر اس نے ڈرانا اور شور مچانا شروع کیا اور نہایت غصہ سے مجھ سے کہا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور ذرا بھی نہ ڈرا۔ یہ دیکھ کر وہ دوڑا اور درختوں کی لکڑیاں توڑ کر جمع کرنے لگا۔ اس کے بعد قریب کی مسجد سے جلتا ہوا چراغ اٹھا لایا۔ اس کا ارادہ تھا کہ لکڑیاں جلا کر میرے اوپر پھینک دے اور مجھے جلا دے مگر اسی دوران اتنی تیز ہوا چلی کہ چراغ

ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ دیو ہیکل دیوانہ میرے گرد صبح تک چیختا چنگھاڑتا رہا اور ڈراتا رہا لیکن میں نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ صبح ہونے کے بعد وہ تاشقند کی بازار کی طرف بھاگا وہاں پہنچکر اس نے پھر ایک آدمی کو قتل کر ڈالا۔ یہ دیکھ کر بازار والوں نے اسے گھیر کر مار ڈالا۔

علوم ظاہر

آپ کا ابتدائی زمانہ بیشتر سیر و سیاحت میں گذرا جس کا مقصد بزرگان دین و کاملین سے فیضِ صحبت حاصل کرنا تھا۔ سمرقند، بخارا، مرو، خراسان، ہرات اور بلخ میں رہ کر صدہا اکابرین اولیاء اللہ کی صحبت و خدمت سے فیض یاب ہوئے۔ علاوہ حضرت مولانا یعقوب چرخیؒ کے جن سے آپ کو بیعت تھی حضرت شیخ بہاء الدین عمرؒ اور حضرت مولانا نظام الدینؒ کی صحبت میں بھی حاضر رہے اور بعض دیگر بزرگانِ دین سے بھی ملاقات کی۔ اس سفر کے اثنا میں آپ علوم ظاہری کی پوری تکمیل نہ کرسکے مگر استعداد خداداد تھی، علم لدنی حاصل ہوچکا تھا چنانچہ بڑے بڑے علماء آپ کے حدیث و تفسیر کے وقت انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ آپ کے مخصوص اصحاب کی فہرست میں بعض اکابرِ علماء کے نام بھی ہیں جو آپ کے علم و فضل کے معترف تھے۔ آپ ارشاد فرماتے تھے کہ "مجموعۂ تحصیلِ ما از مصباح یک دو ورق بیش نیست" (یعنی ہمارے تحصیلِ علم کا مجموعہ مصباح کے ایک دو ورق سے زائد نہیں ہے) اس ارشاد کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ درج ہے جس سے حضرت خواجہ کی خداداد قابلیت کا ثبوت ملتا ہے۔ خواجہ فضل اللہ ابو اللیثی جو علمائے سمرقند کے اکابرین میں تھے کہا کرتے تھے کہ مَیں حضرت خواجہ کے باطنی کمالات سمجھنے و دیکھنے کی اہلیت و صلاحیت نہیں رکھتا تھا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ نے اگرچہ علوم ظاہری کم پڑھے لیکن برابر تفسیر کے مطالب پر ایسے سوالات فرمایا کرتے ہیں جس کا جواب کسی بڑے سے بڑے عالم سے بھی بن

نہیں پڑتا۔

غنا اور تموّل

انتیس ۲۹ سال کی عمر میں حضرت خواجہ سیر و سیاحت کے بعد تاشقند واپس گئے اور وہاں زراعت (کاشتکاری) شروع کی۔ آپ کے پاس تھوڑی مزروعہ زمین تھی لیکن آپ نے لوگوں سے بٹائی پر زمینیں لیں اور اپنی ذاتی محنت و کاوش سے اس میں ترقی دیتے رہے جس میں اس قدر نفع ہوا کہ مال و دولت، جائداد، مویشیوں اور املاک کا اندازہ کرنا ہی مشکل تھا۔ "رشحات" کے مصنف حضرت خواجہ کے آستانہ پر دوسری مرتبہ ۸۹۳ھ میں حاضر ہوئے تو اس وقت تیرہ سو فارم کے آپ کے مالک تھے۔ حضرت کا خود بیان ہے کہ صرف سمرقند کے فارموں کا عُشر اسّی ہزار من غلہ مرزا سلطان احمد کے زمانہ میں آپ حکومت کو ادا کرتے تھے۔ حضرت مولانا جامیؔ نے آپ کی مدح میں ایک شعر اسی مضمون کے متعلق نظم کیا ہے ؎

ہزارش مزرعہ در زیرِ کشت است
کہ زادِ رفتنِ راہِ بہشت است

(یعنی ان کے زیرِ کاشت ہزار فارم ہیں جو بہشت کی راہ کے جانے کا زادِ راہ ہے)

آپ کی اس جائداد کی کثیر آمدنی رفاہِ عام میں زائد صرف ہوتی تھی۔ ملفوظات میں جگہ جگہ ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ "مقاماتِ عالیہ" سے ان کا اقتباس مع ترجمہ تحریر کرتا ہوں:

(۱)

روزے ایں فقیر را طلبیدند و فرمودند کہ	آپ نے ایک روز مجھ کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ
...... در آخر حیات خود می خواہم	زندگی کے آخری ایام میں میری یہ خواہش ہے
کہ در سیر مزارِ پدراں گرسنگان ترکستان را	کہ اپنے آباؤ اجداد کے مزارات پر حاضر

سیر سازم و دراں زماں ترکستان بجہت
قحط ہر شکستہ بہ شاش آمدہ بودند فرمودند
ایں خدمت را من می کنم یا تو فقیر اختیار
آں خدمت کردم بریں وجہ کہ ہر روز چہ مقدار
گوسفند گشتہ می شد مجموع را بدست خود
بفقرا بخش می کردند و خربزہ کہ در دیہائے
آں نواحی بود ہمہ بفقرا صرف می شد و مشغولی
بجائے رسید کہ در ماہ رمضان ایں فقیر را
فرصت چیز خوردن نبود۔

ہو کر فقرار کا پیٹ بھروں اور یہ وہ زمانہ
تھا جب ترکستان میں سخت قحط پڑا ہوا
تھا اور آپ اس سے دل شکستہ ہو کر
شاش آئے تھے۔ فرمایا کہ یہ خدمت
میں اپنے ذمہ لوں یا تم لوگے۔ میں نے
اس خدمت کو اپنے سر لے لیا۔ ایک ایک
دن میں اتنی اتنی (بکثرت) بکریاں حلال
کی جاتی تھیں جن کا شمار مشکل تھا۔ میں
خود اپنے ہاتھ سے مزارات پر موجود رہ کر
فقرار کو تقسیم کرتا تھا۔ گرد و نواح میں
جتنا خربوزہ بویا گیا تھا وہ سب انھیں فقرار
کو بانٹ دیا گیا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا
لیکن میری عدیم الفرصتی کا یہ حال تھا کہ
افطار کرنا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔

(۲)

وقتے خبر آمد کہ خان و سلاطین قزاق ہمہ اتفاق
کردند کہ آمدہ ولایت را تازند و خراب
سازند بجہت تسکین ایشاں و رفاہیت و صیانت
اطفال و عیال مسلمین و اموال ایشاں مبلغ
پنجاہ و شصت ہزار دینار از اموالِ حلال
خود برائے ایشاں سوغات فرستادند و

ایک مرتبہ یہ خبر آئی کہ سلاطین و خوانین قزاقاں
نے باہم اتفاق کر لیا ہے اور اس ملک پر
حملہ کرنے اور لوٹ مار کرنے کی تیاریوں
میں مصروف ہیں۔ آپ نے ملک اور رعایا
کی حفاظت اور مسلمانوں کے عیال و اطفال
کی حفاظت و خیراندیشی کی غرض سے

وکتابت نوشتہ فرستادند و درخواست کردند
کہ ازاں خیال درگذرند۔ درخواست حضرت
ایشاں را شنیدہ از سرآں اندیشہ درگذاشتند

پچاس ساٹھ ہزار اشرفیاں بطور تحفہ ..
حملہ آوروں کو بھیجیں اور ان سے یہ کہلا بھیجا
کہ اپنے ارادۂ بد سے باز آجائیں۔ چنانچہ
آپ کے اس فرمانے سے وہ خوفزدہ
ہوکر اپنے ارادوں سے باز آگئے۔

(۳)

.... وصیت کردہ گفتند ما بر خود
گرفتہ بودیم کہ در رباط میر رباطے عمارت کنیم
پارۂ از خشت وغیرہ سرانجام شدہ بود دیگر
در زمینے کہ مقابلہ مسجد نگاریں خریدہ شدہ
بود مدرسہ عمارت کنیم کہ دراں مدرسہ درسِ
تفسیر و حدیث و فقہ و مصنفات امام غزالی
..... و پنجاہ ہزار دینار را ...... خریدہ
وقف مسجد بازار سوزن فروشاں کردہ شود
کہ مدرس و امام موالی و مؤذن را چیزے
بیشتر رسد و اگر بہ مرمت حاجت شود مرمت
کردہ شود۔ و .... کہ در زمانِ
حیات ما حاصل آں را جمع کردہ پیش ما
می آوردند وقف آں مدرسہ باشد ہمچناں کہ
کہ در زمانِ حیات مخصوص ما بود بعد از ممات
نیز ثواب و ثمراتِ آں عائد باشد۔

.... آپ نے اپنے مرض الموت
میں یہ وصیت فرمائی کہ میں نے سوچا تھا
کہ ایک اور عمارت اس زمین پر بنوادوں جو
مسجد نگاریں کے مقابل میں نے خرید لی ہے اور
اس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور مصنفات امام
غزالی کے درس کے لئے ایک مدرسہ اور
کھولوں اور پچاس ہزار اشرفی کی جائداد
خرید کر بازار سوزن فروشاں کی مسجد کے
لیے وقف کر دوں تاکہ مدرس، امام، خدام
اور مؤذن کو کچھ زائد دیا جاسکے اور اسی
آمدنی سے ان عمارات کی آئندہ مرمت و ترقی
بھی کی جاسکے۔ اس جائداد کی آمدنی جس طرح
میری زندگی میں اس مدرسہ پر خرچ ہو رہی ہے
میرے بعد بھی اسی طرح خرچ ہو۔

ارشادات

تصوف اور علمِ باطن کے متعلق آپ کے صدہا واقعات اور بیش قیمت وانمول ارشادات موجود ہیں جو مضمون کے طویل ہوجانے کے خوف سے اس کے تحریر کرنے کی اجازت نہیں دیتے لیکن اس موقعہ پر ان کو قطعاً نظر انداز کرنا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا اور وہ ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں یہاں صرف چند عام فہم ارشادات نقل کرتا ہوں:

۱- مرتبۂ نبوت کے بعد بادشاہت کا مرتبہ ہے اس سے بڑھ کر سوائے نبوت کے کوئی اعلیٰ مرتبہ نہیں ہوسکتا۔ دین کی امداد اور شریعت کی حفاظت جس قدر شاہانِ عادل کے ہاتھوں ہوسکتی ہے کسی عام آدمی کے ہاتھوں ممکن نہیں۔ ظالموں اور باغیوں کا دفاع بھی بادشاہ ہی خوب کرسکتے ہیں۔ جس قدر خیرات بادشاہ ایک گھڑی میں کرسکتا ہے دوسرا برسوں میں نہیں کرسکتا۔ قباحتِ خرابی اور نکبت اس وقت ہوتی ہے جب بادشاہت اور حکومت سعادتِ آخرت کا ذریعہ نہ ہو۔

۲- سلطنت اور حکومت یہی ہے کہ خدا ورسول کے احکام کی پوری پابندی کی جائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادہ پر حدِ شرع جاری کی اور جسم سے روح کی مفارقت کے بعد بھی بقیہ کوڑے لگانے کا حکم دیا۔

۳- کوئی عمل اس سے بہتر نہیں کہ امراء اور بادشاہوں کی ڈیوڑھی پر حاضر رہے۔ دولت وثروت کے لالچ کے لیے نہیں بلکہ صرف اس لیے کہ حاجت مندوں، فقیروں اور مظلوموں کی مدد کرے۔ ایک مرتبہ ایک بزرگ کو راہِ حق میں ایسی دشواری پیش آئی کہ کسی طرح سے وہ مشکل حل نہ ہوتی تھی۔ ان کو تین مرتبہ ہدایت ہوئی کہ فلاں شاہی چوبدار کے پاس جاؤ تاکہ تمھاری مشکل حل ہو۔ انھیں کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ اس چوبدار سے باطنی امور میں مدد مل سکے گی۔ متواتر الہام اور حکمِ حق ملنے کے بعد مجبوراً یہ خیال کرکے چوبدار

کے پاس گئے کہ غالباً خداوند تعالیٰ کی اس پر خاص عنایت ہے۔ جب مشکل حل ہوگئی تو چوبدار سے پوچھا کہ تمھارا کون سا عمل خداوند تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ یہ دولتِ باطنی عنایت ہوئی۔ اس نے جواب دیا کہ میں روزانہ صبح اٹھ کر بادشاہ کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوتا ہوں اور دن بھر اسی کوشش میں رہتا ہوں کہ میری کوشش سے مظالم اور خلاف شرع امور نہ ہونے پائیں۔ جس روز کامیاب ہو جاتا ہوں خدا کا شکر کرتا ہوں اور ناکامی کی حالت میں صبر اختیار کرتا ہوں جس کے انعام میں مجھ کو ایسا مرتبہ اور ایسی دولت نصیب ہوئی کہ تم جیسے لاکھوں ولی میرے پاس آتے ہیں۔

۴۔ ارشاد فرمایا کہ بادشاہِ عادل خداوند تعالیٰ کے حکم اور اقتدار کے مظہر ہیں اُن کو چاہیے کہ اقتدار اور حکومت میں مستقل رہیں تاکہ صحیح معنوں میں مظہرِ حق ہو سکیں۔ سلطنت میں شرکت عیب ہے۔

۵۔ ارشاد فرمایا کہ صحبت کے فوائد بہت ہیں لہذا تھوڑے فائدہ کے لیے صحبت کو ترک نہیں کرنا چاہیے ؎

صحبتِ مرداں اگر یک ساعت است

بہتر از صد خلوت و صد طاعت است

۶۔ ارشاد فرمایا کہ بہت ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے ؎

خندہ کم کن کہ خندۂ بسیار

صد دلِ زندہ را بمیراند

۷۔ ارشاد فرمایا کہ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد عبادت ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ۔ اور عبادت کا خلاصہ اور اصل مقصد خضوع و خشوع کی صفت کے ساتھ حق تعالیٰ سے آگاہ رہنا ہے۔

۸۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ اگر مرید شیخ میں کوئی

عیب دیکھے اور اس سے اس کے عقیدہ میں خلل پڑے اور وہ شیخ کے روبرو جائے تو وہ منافق ہے۔ مرید کو چاہیئے کہ اس کو شیخ میں سوا کمال کے کچھ نظر ہی نہ آئے۔

۹۔ ارشاد فرمایا کہ مرید کی چشمِ نقص کور (یعنی تنقیدی نظر اندھی) رہے تاکہ وہ پیر کے کمال کے سوا کچھ اور مشاہدہ ہی نہ کرے۔

۱۰۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ مرید وہ ہے جس کا مرادِ شیخ کے سوا کوئی ارادہ نہ ہو اور وہ تمام ارادوں سے خالی ہو۔

۱۱۔ ارشاد فرمایا کہ علمائے ظاہر کی صحبت سے جنھوں نے علم کو محض دنیا کمانے اور حبِ جاہ کا ذریعہ بنا رکھا ہے گریز کرنا چاہیے۔

خانۂ شرع خراب است کہ اربابِ صلاح
درعمارت گریِ گنبدِ دستارِ خود اند

مضمون کے آخر میں ہم مولانا نور الدین عبدالرحمٰن جامی (جو آپ کے ہم عصر تھے) جو انھوں نے سلسلۂ نقشبندیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "نفحات الانس" میں تحریر کئے ہیں اور ان سے مخاطب دراصل خواجہ عبید اللہؒ ہی ہیں نیز سلسلۃ الذہب کے اشعار بھی جو آپ کی مدح میں تحریر کیے ہیں۔ حضرت مولانا جامیؒ کی آپ کی خدمت میں عقیدت و محبت اور اس کا دلچسپ و عجیب واقعہ "سلسلۃ العارفین" میں مفصل مذکور ہے۔ غالباً حضرت مولانا کو بھی کسی وقت حضرت خواجہ کی فقیرانہ شانِ امارت پر سوءِ ظن ہوا جس پر منجانب حق مولانا کو سخت تنبیہ کی گئی۔

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار انند | کہ برند از رہ پنہاں بہ حرم قافلہ را
از دلِ سالک رہ جاذبۂ صحبتِ شاں | می برد وسوسۂ خلوت و فکر چلہ را
قاصرے گر زند ایں طائفہ را طعن و قصور | حاش للہ کہ بر آرم بہ زباں ایں گلہ را
ہمہ شیرانِ جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند | روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

یعنی حضرات نقشبندیہ عجیب قافلہ سالار ہیں کہ باطن کی راہ سے پورے قافلہ کو حرمِ ذات تک لے جاتے ہیں۔ ان کی صحبت کے جاذبہ سے سالک کے دل سے خلوت اور چلہ کشی کی فکر کے وسوسے محو ہو جاتے ہیں (یعنی وہ خلوت اور چلہ میں اپنے پیر و مرشد کے حضور کی بدولت کسی وسوسہ میں نہیں پھنستے) اگر کوئی اعتراض کرنے والا اس طائفہ پر طعن کرے تو میری زبان پر اس کا کوئی گلہ نہ آئے گا۔ سارے قلندرانِ عظام یا انسانِ کامل اس سلسلہ سے وابستہ ہیں۔ لومڑیاں اپنے مکر سے اس سلسلے میں کیسے دخل انداز ہوں گی۔

خواجۂ بندگانِ کار آگاہ — قبلۂ مقبلاں عبید اللہ

خواجہ می راند بارگی بشتاب — چوں فرشتہ کہ راند ابرِ خوش آب

الحق آں شاہ مسند ارشاد — خبر از حال خویشتن می داد

صاحب "بحر زخار" ان الفاظ میں معترف ہیں "آں قطبِ اقطاب عالم۔ آں صحیفۂ منقش وعلمك مالم تكن تعلم۔ آں از اکبرِ متابعان رسول الثقلین۔ آن برہانِ اولیاء و اتقیاء خافقین۔ آں گنجینۂ عشق و اسرار پروردگار۔ حضرت خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرارؒ۔

ناظرین کو حضرت خواجہ کی زندگی کے ان مختصر حالات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ بعض حضرات صوفیہ نے کس طرح اور کس قدر مالی، ملکی اور ملی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ صوفی کے متعلق یہ خیالِ خام قائم کر لینا کہ وہ اپنے قوائے عملی کو بیکار بنا کر دوسروں سے خدمت کا طالب ہوتا ہے محض تنگ نظری ہے۔ تصوف اور حق شناسی دراصل خدمتِ خلق ہے خواہ وہ کسی صورت میں ہو۔ اور یہی صوفیاء و فقرائے عظام نے برابر کی ہے۔ آزادی کی حمایت صوفیاء کا بھی خاص مشغلہ رہا ہے جس کا ثبوت اس مختصر مضمون سے فراہم ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تارک الدنیا فقیر کو اس کی فرصت ہی نہیں دی جاتی کہ وہ عالم سیاسیات کی مانند اشتمالیت اور اشتراکیت کے مباحث پر کوئی جدید تصنیف

پیش کر سکے لیکن خدمت خلق کے لئے جب میدان عمل میں آنے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ سب سے پہلے کمرہمت چست کرنے کو تیار رہتا تھا۔

(ختم)

دعائے صحت

پچھلے مہینہ کے رسالہ برہان میں حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایڈیٹر رسالہ برہان کی علالت کی اطلاع دی گئی تھی۔ خدا کے فضل سے مولانا کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے اور اسپتال سے تشریف لے آئے ہیں۔ موصوف یرقان (پیلیے کی بیماری) میں مبتلا ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی سے توقع ہے کہ آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رہے۔ (آمین)

قارئین برہان اور اس ادارہ سے تعلق رکھنے والے حضرات سے میں دعائے صحت کی درخواست کرتا ہوں۔

عمید الرحمٰن عثمانی
پرنٹر و پبلشر و مینیجر
رسالہ برہان دہلی

دقیقی طوسی

از مسز شاہدہ رشید شیروانی ایم اے

(۲)

دقیقی کے کلام کی خصوصیات

۱۔ صنائع و بدائع :

شاعری میں مناسب حد تک صنائع اور بدائع کا استعمال ضروری ہے۔ ان کے اثر سے خیال میں شدت اور اثر انگیزی پیدا ہوتی ہے۔ دقیقی نے اپنے قصیدوں میں صنائع بدائع کا بھی استعمال کیا ہے۔ بعد کے قصیدہ نگاروں کے قصیدوں پر صنائع بدائع ہم کو چھائے ہوئے ملتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے شعر میں اس نے صنعت تضاد اور صنعت حسنِ تعلیل کو بہت ہی اچھے انداز میں استعمال کیا ہے :

از آں لاغر میانست ایں کہ عشقم
چنیں فربہ شدست و صبر لاغر

مبالغہ شاعری کی جان ہے۔ دقیقی کے کلام کی نمایاں خصوصیت مبالغہ کا استعمال ہے۔

ایک خوبصورت مبالغہ ملاحظہ فرمائیے :

گر دست بدل بر نہم از سوختن دل
انگشت شود بی شک در دست من انگشت

۲۔ تشبیہات:

دقیقی کے کلام کی دوسری خصوصیت تشبیہات کا استعمال ہے۔ اس کی تشبیہات بہت ہی سادہ اور سہل ہیں۔ ان میں بے تکلفی اور آمد ہے۔ بے ساختگی ہے۔ زور آور تکلف نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بغیر کسی کوشش کیے بغیر کسی غور وفکر کے برجستہ تشبیہیں آرہی ہیں۔ دقیقی یکے بعد دیگرے شعر میں تشبیہات کا سلسلہ باندھ دیتا ہے لیکن تشبیہات کی سادگی اور معصومیت برقرار رہتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں وہ سادہ اور سہل انداز میں محبوب کے سراپا کو بیان کر رہا ہے:

بسانِ سرو سیمینت قدش
ولیکن بر سرش ماہِ منوّر

زگل بوی گلاب آید بداں ساں
کہ پنداری گل اندر گل سرشتے

۳۔ فطرت کی مناظر کشی:

دقیقی کی شاعری صرف رزم وبزم پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ اس کے کلام میں فطرت کی مناظر کشی اعلیٰ پیمانہ پر ہے اور بقول مولانا شبلیؔ "فارسی میں غالباً اس نے سب سے پہلے اس کی بنیاد قائم کی" لیکن مجھے شبلیؔ کے اس قول کے تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ کیونکہ رودکی کے اشعار میں بھی فطرت کی مناظر کشی کی جھلک ہے۔ دقیقی کی بعض نظمیں فطرت کے مناظر کی عکاسی میں بے مثال ہیں۔ بعض اشعار میں ان کی منظر کشی ایسی ہے جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے ان مناظر کو دیکھ رہا ہے اور

شاعر مظاہرِ فطرت سے بہت قریب ہے۔ ذیل کے اشعار اس کی مظاہرِ فطرت کا اعلیٰ نمونہ ہیں ؎

بطعم نوش گشتہ چشمۂ آب
برنگ دیدۂ آہوئی دشتی

چنیں گردد میاں ہزماں کہ گوئی
پلنگ آہو نگیرد خیر کشتی

دقیقی اپنی شاعری کے لئے فطرت سے تشبیہات حاصل کرتا ہے۔ کبھی پہاڑ سے کبھی جنگل سے کبھی دریا سے۔ وہ سراپائے محبوب کے لئے تشبیہیں لاتا ہے تو مظاہرِ فطرت سے۔ لیکن اس کی تشبیہات میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ محبوب کو فطرت سے نہیں بلکہ فطرت کو محبوب سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس لئے شدت اور اثر میں اضافہ ہے۔ متاخرین کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی متاخرین شعراء نے فطرت کو محبوب سے تشبیہ دینے کے بجائے محبوب کو فطرت سے تشبیہ دی ہے۔ فطرت کو محبوب سے تشبیہ جن اشعار سے دقیقی طوسی نے دی ہے ان کا نادر نمونہ یہ ہے:

شب سیاہ بداں زلفکانِ تو ماند
سپید روز بپاکی رخانِ تو ماند
بوستان ملوکاں ہزار گشتم پیش
گل شگفتہ برخسارگانِ تو ماند

ان اشعار میں دقیقی نے مظاہرِ فطرت کو محبوب کے اعضاء سے تشبیہ دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رات کے اندر جو سیاہی ہے وہ محبوب کی زلفوں سے لی گئی ہے۔ یعنی محبوب کی زلف کی سیاہی رات کی سیاہی سے کہیں زیادہ ہے۔ اور اتنی زیادہ ہے کہ رات کو سیاہ بننے کے لئے محبوب کے زلف کی سیاہی لینے کی

ضرورت رہی۔ اسی طرح دن کے اندر جو سفیدی ہے وہ دراصل محبوب کے پاک وصاف چہرے سے لی گئی ہے۔ باغ کے اندر جو قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور ان کے اندر جو شگفتگی اور تازگی ہے وہ محبوب کے رخسار کی وجہ سے ہے یعنی اس کے کہنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ رات ہو یا دن، پھول ہو یا باغ ہر شے کا حسن محبوب کے حسن سے لیا ہوا ہے۔

ذیل کے مزید چند اشعار سے بہتر فطرت کی منظر کشی پوری فارسی شاعری میں شاید مشکل ہی سے ملے ؎

سحرگاہاں کہ باد بزم جنبد
بجنباند درخت سرخ واصفر

تو پنداری کہ از گردوں ستارہ
ہمی بارید بر دیبائی اخضر

دقیقی کہتا ہے کہ صبح کے وقت جب ہوا چلتی ہے تو اس ہوا کے چلنے سے درخت کے پتے ہلتے ہیں اور وہ سرخ وسفید پتے زمین پر بکھر جاتے ہیں۔ ان کے بکھرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر آسمان سے ستارے گر رہے ہوں یعنی پتیوں سے زمین اس قدر خوبصورت ہو جاتی ہے کہ وہ پتے نہیں بلکہ ستارے معلوم ہوتے ہیں۔

۴۔ واقعہ نگاری:

دقیقی کے کلام کی ایک اور اہم خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔ اگرچہ فردوسی خدائے سخن ہے لیکن دقیقی کا رتبہ بھی کسی سے کم نہیں۔ فردوسی کے کلام کا اصل جوہر واقعہ کو بیان کرنا ہے لیکن ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے معرکہ آرائی کا سماں اس طرح کھینچا ہے کہ اس کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

مساجد و معابد قرآن کی روشنی میں

از مولانا محمد ثناء اللہ عمری ایم۔اے۔ جامعہ دارالسلام عمرآباد

قرآن حکیم انسانیت کے نام خالق کائنات کا آخری اور ابدی پیام ہے جو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ انسان حقیقی معنوں میں اپنے خالق و رازق کا بندہ بن کر جیئے اور مرے۔ اسی بندگی کا ایک لازمی جزء وہ عبادت ہے جو نماز کہلاتی ہے۔ شب و روز میں پانچ وقت فرض ہے۔ یوں اس عبادت کے سارے ہی حرکات و سکنات اللہ کی قربت کا ذریعہ ہیں، مگر اس کی ایک ادا ایسی بھی ہے جو باری تعالیٰ کو سب سے زیادہ پیاری ہے، اور اسی لئے پیاری ہے کہ اس میں بندے کا عجز و انکسار انتہائی شکل و صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ سجدہ وہ حالت ہے جس میں انسان پر حقیقی معنوں میں بندگی کا احساس طاری ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے ارکان نماز میں صرف سجدے کے متعلق یہ گواہی دی ہے کہ وہ اللہ کی قربت کا ذریعہ ہے۔

واسجد واقترب (علق - ۱۹) اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو۔

صحیح مسلم میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اقرب مایکون العبد من ربہ وھو ساجد فاکثروا الدعاء۔ بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے، پس اس حالت میں زیادہ سے زیادہ دعائیں مانگو۔

سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبین کی

نماز کا یہ رکن یعنی سجدہ اس قدر پسندیدہ قرار پایا کہ اسلامی عبادت گاہوں کے لئے اسی لفظ کا مشتق یعنی مسجد رائج ہوگیا، مفردات میں ہے :-

المسجد بکسر الجیم موضع السجود- یعنی لفظ مسجد جیم کے کسرے کے ساتھ ہے، سجدہ کرنے کی جگہ-

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم لکھتے ہیں:"- اگرچہ مسجد کے مفہوم کے متعلق مفسرین نے طرح طرح کے اقوال نقل کئے ہیں، مگر صاف بات یہی ہے جو امام راغب نے لکھی ہے- یعنی مسجد بکسر جیم ہے اور اس سے وہ مقام مراد ہے جہاں فاطر السموٰت والارض کے آگے جبین نیاز زمین پر رکھی جائے، اسی کی جمع ہے مساجد" [1]

قرآن نے مختلف مقامات پر کئی مسجدوں اور معبدوں کا ذکر کیا ہے، ان میں مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ، مسجدِ نبوی، مسجدِ قبا اور مسجدِ ضرار کے علاوہ عام مساجد اور معابد بھی ہیں- اور یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کی عبادت گاہوں کے نام بھی، پھر ان کے متعلق بعض احکام بھی واضح کئے ہیں- سب سے زیادہ جس مسجد کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے وہ مسجدِ حرام ہے-

۱- چنانچہ آل عمران میں ارشاد ہے-

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعلمین فیہ آیات بینٰت مقام ابراھیم ومن دخلہ کان آمنا وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ومن کفر فان اللہ غنی عن العلمین ۵ (۹۶-۹۷)

بلاشبہ پہلا گھر جو انسان کے لئے (خدا پرستی کا معبد و مرکز) بنایا گیا ہے و

---

[1] مقالات الہلال ص۱

یہی (عبادت گاہ) ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام انسانوں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اس میں (دین حق کی) روشن نشانیاں ہیں۔ ازانجملہ مقام ابراہیم ہے۔ (یعنی ابراہیم کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جگہ جو اس وقت سے لے کر آج تک بغیر کسی شک وشبہ کے مشہور اور معین رہی ہے اور ازانجملہ یہ بات ہے کہ) جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن وحفاظت میں آگیا اور (ازانجملہ یہ کہ) اللہ کی طرف سے لوگوں کے لئے یہ بات ضروری ہوگئی کہ اس تک پہنچنے کی استطاعت پائیں تو اس گھر کا حج کریں اور اس پر بھی جو کوئی (اس حقیقت سے) انکار کرے (اور اس مقام کی پاکی وفضیلت کا اعتراف نہ کرے) تو یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی ذات تمام دنیا سے بے نیاز ہے۔ (وہ اپنے کاموں کے لئے کسی فرد اور قوم کا محتاج نہیں۔)

یوں دنیا میں گھر تو بہت پہلے بن گئے تھے، مگر اللہ کی عبادت کا گھر سب سے پہلے کعبہ ہی تھا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ یہ پہلا گھر ہے جس میں برکت رکھی گئی تھی۔ کعبہ معظمہ مسجد حرام کے درمیان بنا ہوا ہے، اس کی شکل ایک بڑے کمرے کی سی ہے۔ تقریباً مربع ہے۔ بلندی پندرہ میٹر ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم فرماتے ہیں: "تاریخ سے بھی اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ کعبہ سب سے پہلے عبادت خانہ تھا۔ رومی مورخ پیرو ڈائس نے اعتراف کیا ہے کہ اس سے قدیم تر کوئی معبد نہیں ملتا۔ ڈوزی نے بھی یہی کہا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیا والوں نے اس کی قدامت تسلیم کی۔ میور تنقید کے لئے اٹھا۔ لیکن رومی مورخ کی تائید کے سوا اور کچھ کہہ نہ سکا۔ مارگولیتھ نے خانہ کعبہ کی قدامت سے انکار کیا تھا۔ لیکن اس کے نظریے کو خود مستشرقین ہی کے گروہ میں فروغ وقبول حاصل نہ ہوا۔" [1]

۲۔ اب قرآن ہی کی زبانی یہ بھی سن لیجئے کہ اللہ کے سب سے پہلے گھر کے بانی

---

[1] سفر حجاز صفحہ ۲۵۰ ۔ ۲۵۱

کون تھے؟

سورۂ بقرہ میں ہے :۔

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک وارنا مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتک ویعلمھم الکتب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم (۱۲۷ ۔ ۱۲۹)

اور (پھر دیکھو) وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا جب ابراہیم خانۂ کعبہ کی نیو ڈال رہا تھا اور اسماعیل بھی اس کے ساتھ شریک تھا (ان کے ہاتھ پتھر چن رہے تھے اور دل و زبان پر یہ دعا طاری تھی) اے پروردگار! ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو! بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور (مصالح عالم کا) جاننے والا ہے۔ اے پروردگار (اپنے فضل و کرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار) ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو۔ خدایا! ہمیں ہماری عبادت کے (سچے) طور طریقے بتلا دے اور ہمارے قصوروں سے درگذر کر۔ بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو درگذر کرنے والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگذر کی کوئی انتہا نہیں اور خدایا! (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو جو انہی میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) ان کے دلوں کو مانجھ دے۔ اے پروردگار! بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی ہے اور سب پر غالب ہے۔

کعبہ کے سب سے پہلے معمار سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ باوا آدم کے بعد آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لخت جگر حضرت

اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ خانۂ کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی۔

۳۔ جب باپ بیٹے اللہ کا گھر تعمیر کر چکے تو اسی کے زیر سایہ اپنے بسیرے کا بھی انتظام کیا تاکہ اللہ کے گھر کی پاسبانی ہوتی رہے۔ سورۂ ابراہیم کی آیت ہے:۔

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون

اے ہم سب کے پروردگار! (تو دیکھ رہا ہے کہ) ایک ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں، میں نے اپنی بعض اولاد تیرے محترم گھر کے پاس لاکر بسائی ہے۔ اور خدایا! اس لئے بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں (تاکہ یہ محترم گھر عبادت گذاران توحید سے خالی نہ رہے) پس تو (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ لوگوں کے دل انکی طرف مائل ہو جائیں اور ان کے لئے زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق مہیا کر دے تاکہ (بے آب و گیاہ ریگستان میں وہ کبھی ضروریات معیشت سے محروم نہ رہیں اور) تیرے شکر گذار ہوں۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم کی دوسری دعا تھی۔ پہلی دعا آیت نمبر ۱۲۶ میں گذر چکی ہے۔ وہ دعا تعمیر کعبہ سے پہلے کی تھی اور یہ تعمیر کے بعد کی۔ وہاں شرک و بت پرستی سے اپنی اور اپنی اولاد کی حفاظت کی طلب تھی اور یہاں اولاد کے حق میں نماز کی پابندی اور اسباب رزق کی فراہمی کی درخواست ہے۔

۴۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی یہ کوششیں بارگاہ خداوندی میں مقبول ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو وہ مقام بخشا جو اخلاص وللٰہیت کا اونچے سے اونچا مقام ہے۔ اس کی خوشخبری سورۂ بقرہ کی ذیل کی آیت میں ملتی ہے۔

واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی وعھدنا الی ابراھیم واسمٰعیل ان طھرا بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود (۱۲۵)

اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (مکہ کے) اس گھر کو (یعنی خانۂ کعبہ کو) انسانوں کی گرد آوری کا مرکز اور امن و حرمت کا مقام ٹھہرا دیا۔ اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لئے) نماز کی جگہ بنائی جائے اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے اسے طواف کرنے والوں، عبادت کے لئے ٹھہرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے (ہمیشہ) پاک رکھنا (اور ظلم و معصیت کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا۔

۵۔ یہ مضمون مزید شرح و بسط کے ساتھ سورۂ حج کی ان آیتوں میں بیان ہوا ہے:۔

ان الذین کفروا ویصدون عن سبیل اللہ والمسجد الحرام الذی جعلناہ للناس سواء العاکف فیہ والباد ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم ہ واذبوأنا لابراھیم مکان البیت ان لا تشرک بی شیئاً وطہر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود ہ واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا وعلی کل ضامر یأتین من کل فج عمیق ہ لیشہدوا منافع لھم ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر ہ ثم لیقضوا تفثھم ولیوفوا نذورھم ولیطوفوا بالبیت العتیق ہ ذلک ومن یعظم حرمات اللہ فھو خیر لہ عند ربہ واحلت لکم الانعام الا ما یتلی علیکم فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور ہ حنفاء للہ غیر مشرکین بہ ومن یشرک باللہ فکأنما خر من السماء فتخطفہ الطیر او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق ہ ذلک ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب ہ لکم فیھا منافع الی اجل مسمیً ثم محلھا الی البیت العتیق (۲۵–۳۳)

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، اور جو اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں نیز مسجد حرام جسے ہم نے بلا امتیاز تمام انسانوں کے لئے (عبادت گاہ) ٹھہرایا ہے خواہ وہاں کے رہنے والے

ہوں یا باہر سے آنے والے (تو انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم نخیں) اور ہر اس آدمی کو جو اس میں ازراہ ظلم حق سے منحرف ہونا چاہے گا عذاب دردناک کا مزہ چکھائیں گے اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم کے لئے خانۂ کعبہ کی جگہ مقرر کردی (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرا یہ گھر ان لوگوں کے لئے پاک رکھو جو طواف کرنے والے ہوں، عبادت میں سرگرم رہنے والے ہوں، رکوع و سجود میں جھکنے والے ہوں اور (حکم دیا گیا تھا کہ) لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے، لوگ تیرے پاس دنیا کی دور دراز راہوں سے آیا کریں گے، پا پیادہ اور ہر طرح کی سواریوں پر جو (مشقت سفر سے) تھکی ہوئی ہوں گی، وہ اس لئے آئیں گے کہ اپنے فائدے پانے کی جگہ میں حاضر ہو جائیں اور ہم نے جو پالتو چارپائے ان کے لئے مہیا کر دیئے ہیں۔ ان کی قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں پس قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیر کو بھی کھلاؤ۔ پھر قربانی کے بعد وہ اپنے جسم کا میل کچیل دور کر دیں (یعنی احرام اتار دیں) نیز اپنی نذریں پوری کریں اور اس خانۂ قدیم (یعنی خانۂ کعبہ) کے گرد پھیرے پھر لیں تو دیکھو (حج کی) بات یوں ہوئی اور جو کوئی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حرمتوں کی عظمت مانے تو اس کے لئے اس کے پروردگار کے حضور بڑی ہی بہتری ہے اور (یہ بات بھی یاد رکھو کہ) ان جانوروں کو چھوڑ کر جن کا حکم قرآن میں سنا دیا گیا ہے۔ تمام چارپائے تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ پس چاہیئے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچتے رہو نیز جھوٹ بولنے سے صرف اللہ ہی کے لئے ہو کر رہو۔ اس کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہ کرو۔ جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اس کا حال ایسا سمجھو کہ جیسے بلندی سے اچانک نیچے گر پڑا، جو چیز اس طرح گرے گی اسے یا تو کوئی اچک لے گا یا ہوا کا جھونکا کسی دور دراز گوشے میں لے جا کر پھینک دے گا۔ (حقیقت حال) یہ ہے۔ پس (یاد رکھو) جس کسی نے اللہ کی نشانیوں کی عظمت مانی تو اس نے ایسی بات مانی جو فی الحقیقت

دلوں کی پرہیزگاری کی باتوں میں سے ہے۔ ان (چارپایوں) میں ایک مقررہ وقت تک تمہارے لئے (طرح طرح کے) فائدے ہیں، پھر (اس) خانۂ قدیم تک پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے۔

ان آیتوں میں بیت عتیق دوبار آیا ہے۔ عتیق کے ایک معنی تو قدیم کے ہیں۔ یہ اللہ کا سب سے قدیم گھر ہے۔ دوسرے اس لفظ کے ایک معنی آزاد کے بھی ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو اول سے آخر تک ظالموں کے دست تصرف سے محفوظ رکھا ہے۔ بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ طوفان نوح سے محفوظ تھا اس لئے عتیق کہلایا۔

۶۔ مذکورہ بالا آیتوں میں حج کی منادی کا حکم دیا گیا تھا۔ مندرجہ ذیل آیت میں حج اور عمرہ کے مزید احکام بیان ہو رہے ہیں۔ واضح رہے کہ حج کی فرضیت کے ساتھ عمرہ کو شرعی حیثیت دے کر بیت اللہ کے اکرام و فیضان کو بارہ ماسی کر دیا گیا ہے۔

سورۃ بقرہ کی آیت:۔

واتموا الحج والعمرۃ للہ فان احصرتم فما استیسر من الھدی ولا تحلقوا رؤسکم حتیٰ یبلغ الھدی محلہ فمن کان منکم مریضاً او بہ اذًی من راسہ ففدیۃ من صیام او صدقۃ او نسک فاذا امنتم فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج فما استیسر من الھدی فمن لم یجد فصیام ثلاثۃ ایام فی الحج و سبعۃ اذا رجعتم تلک عشرۃ کاملۃ ذٰلک لمن لم یکن اھلہ حاضری المسجد الحرام واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ شدید العقاب (۱۹۶)

اور دیکھو حج اور عمرہ کی جب نیت کر لی جائے تو اسے اللہ کے لئے کرنا چاہئے۔ اور اگر ایسی صورت درپیش آجائے کہ تم (اس نیت سے نکلے مگر) راہ میں گھر گئے (لڑائی کی وجہ سے یا کسی دوسری وجہ سے) تو پھر ایک جانور کی قربانی کرنی چاہئے جیسا کچھ بھی

میسر آئے اور اس وقت تک سر کے بال نہ منڈواؤ (جو اعمال حج سے فارغ ہوکر احرام اتارتے وقت کیا جاتا ہے) جب تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے، ہاں اگر کوئی شخص بیمار ہو یا اسے سر کی کسی تکلیف کی وجہ سے مجبوری ہو تو چاہیے کہ (بال اتارنے کا) فدیہ دیدے اور وہ یہ ہے، روزہ، یا صدقہ دے، یا جانور کی قربانی کرے۔ اور پھر ایسا ہو کہ تم امن کی حالت میں ہو اور کوئی شخص چاہے کہ (عمرہ حج سے ملاکر) تمتع کرے۔ (یعنی ایک ہی سفر میں دونوں عملوں کے ثواب سے فائدہ اٹھائے) تو اس کے لیے بھی جانور کی قربانی ہے۔ جیسی کچھ میسر آجائے۔ اور جس کو قربانی میسر نہ آئے تو اسے چاہیے تین روزے حج کے دنوں میں رکھے، سات روزے واپسی پر، یہ دس کی پوری گنتی ہوگی البتہ یاد رہے کہ یہ حکم (یعنی عمرہ کے تمتع کا حکم) اس کے لیے ہے جس کا گھر بار مکہ میں نہ ہو (باہر سے حج کے لیے آیا ہو) اور دیکھو ہر حال میں اللہ کی نافرمانی سے بچو اور یقین کرو وہ (نافرمانوں کو) سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

۷۔ حج بیت اللہ اور عمرے کی ایک کڑی صفا مروہ کی سعی بھی ہے اس کے متعلق سورہ بقرہ ہی میں یہ صراحت موجود ہے:

ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ أن یطوّف بھما ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم ۝ (۱۵۸)

بلاشبہ صفا اور مروہ (نامی دو پہاڑیاں) اللہ کی (علامت رحمت کی) نشانیوں میں سے ہیں۔ پس جو شخص حج یا عمرہ کی نیت سے اس گھر کا (یعنی خانہ کعبہ کا) قصد کرے تو اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان طواف کے پھیرے کرلے۔ اور جو کوئی خوش دلی کے ساتھ نیکی کا کام کرتا ہے تو اللہ ہر عمل کی اس کی منزلت کے مطابق قدر کرنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

صفا اور مروہ پہاڑیاں تھیں، اب باقی نہیں رہیں۔ درمیانی فاصلہ تقریباً ڈیڑھ فرلانگ تھا

نونہال کے لیے پانی کی تلاش میں حضرت ہاجرہ انہی پہاڑیوں کے درمیان آئی گئی تھیں سعی اسی آمد ورفت کی یادگار ہے۔ اسلام سے قبل عربوں نے ان پہاڑیوں پر ایک بت رکھ دیا تھا، صفا کا بت اساف تھا اور مروہ کا نائلہ۔ عرب ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور قربانیاں کرتے اور حج کے موقع پر پہاڑیوں کے درمیان سعی بھی کرتے تھے۔ اسلام کے آنے کے بعد مسلمانوں کو اس سابقہ عمل کی وجہ سے سعی کرنے میں تکلف ہوا، لیکن قرآن مجید میں ان کی سعی کا حکم آگیا۔ ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ الخ، سعی جاری ہوگئی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ مشلل سے قریب منات بت نصب تھا۔ اسلام سے قبل انصار اسی کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے اور صفا مروہ کی سعی سے کتراتے تھے، قبولِ اسلام کے بعد انھوں نے اللہ کے رسول سے کہا، زمانۂ جاہلیت میں ہم لوگ سعی سے گریز کرتے تھے، اب کیا ارشاد ہوتا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا اور مروہ کے طواف کو سنت قرار دیا ہے۔ پس کوئی شخص اسے ترک نہ کرے، چاہے وہ حج کررہا ہو یا عمرہ۔

۸۔ سورۂ مائدہ میں بیت اللہ اور اس کے متعلقات کے قابلِ احترام ہونے کا یہ اعلان ملتا ہے:

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس والشھر الحرام والھدی والقلائد ذلک لتعلموا ان اللہ یعلم ما فی السموٰت وما فی الارض وان اللہ بکل شیئ علیم (۹۷)

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو حرمت کا گھر بنایا ہے، لوگوں کے لیے (امن وجمعیت کے) قیام کا ذریعہ ٹھہرایا ہے نیز حرمت کے مہینوں کو اور (حج) کی قربانی کو اور (قربانی کے) ان جانوروں کو جن کی گردنوں میں (علامت کے لیے) پٹے ڈال دیتے ہیں (پس کعبہ کی اور کعبہ کے ان تمام رسوم وآداب کی حرمت قائم رکھو) یہ اس لیے کیا گیا تاکہ تم جان لو

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ سب کا حال جانتا ہے اور ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔

۹۔ اللہ کے حکم سے اس گھر سے متعلق کچھ شعائر قائم ہو گئے تھے جو عہد جاہلیت میں بھی ملحوظ رہے۔ جہاں خلاف ورزی کے آثار نظر آئے فوراً تنبیہ فرما دی۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یاایھا الذین اٰمنوا لا تحلوا شعائر اللہ ولا الشھر الحرام ولا الھدی ولا القلائد ولا اٰمین البیت الحرام یبتغون فضلاً من ربھم ورضواناً۔ واذا حللتم فاصطادوا ولا یجرمنکم شنآن قوم أن صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا وتعاونوا علی البر والتقوٰی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب (۲)

مسلمانو! خدا کے شعائر کی (یعنی خدا پرستی کی مقرر کی ہوئی نشانیوں اور آداب و رسوم کی) بے حرمتی نہ کرو اور نہ مہینوں کی بے حرمتی کرو جو حرمت کے مہینے ہیں اور نہ (حج کی) قربانی کی۔ نہ ان جانوروں کی جن کی گردنوں میں (بطور علامت) پٹے ڈال دیتے ہیں (اور کعبہ پر چڑھانے کے لیے دور دور سے لائے جاتے ہیں) نیز ان لوگوں کی بھی بے حرمتی نہ کرو (یعنی ان کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالو اور انھیں کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ) جو بیت حرام (یعنی کعبہ) کا قصد کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی ڈھونڈتے ہیں۔ اور جب تم احرام کی حالت سے باہر آجاؤ (یعنی حج اور عمرہ سے فارغ ہو کر احرام اتار دو) تو پھر شکار کر سکتے ہو اور (دیکھو) ایسا نہ ہو کہ ایک گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ زیادتی کرنے لگو کیونکہ انھوں نے مسجد حرام سے تمہیں روک دیا تھا۔ (تمہارا دستور العمل تو یہ ہونا چاہیے کہ) نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں

ایک دوسرے کی مدد کرو گناہ اور ظلم کی بات نہ کرو اور (دیکھو) اللہ کی نافرمانیوں کے نتائج) سے ڈرو، یقیناً وہ (پاداشِ عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے۔

یعنی زائرینِ بیت اللہ کے قتل و خونریزی کو حلال نہ سمجھو اور نہ انھیں کعبہ کی زیارت سے روکو روایت ہے کہ حطم بن ہند بکری نے مدینہ کی چراگاہوں پر حملہ کر دیا، پھر اگلے سال عمرہ کی غرض سے نکلا، بعض صحابہ نے اس کی راہ روکنی چاہی، اس پر یہ آیت اُتری۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ پروانۂ امن نہ ہونے کی صورت میں بیتِ حرام یا بیت المقدس کے مشرک زائرین کو قتل کیا جاسکتا ہے، مندرجۂ بالا آیت میں جو حکم دیا گیا ہے اس سے یہ لوگ مستثنیٰ ہیں۔

۱۰۔ سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ آپؐ مکہ مکرمہ میں داخل ہو کر کعبۃ اللہ کا طواف کر رہے ہیں، حضورؐ نے صحابۂ کرامؓ کو اس کی اطلاع دی، ایک جم غفیر عمرہ کی نیت سے پابرکاب ہو گیا مگر حدیبیہ کے مقام پر کفارِ مکہ نے پرستارانِ حق کی اس جماعت کو مسجدِ حرام میں داخل ہونے سے روک دیا۔ حالانکہ مسلمان عمرہ کی نیت کر کے نکلے تھے اور ستر اونٹ ساتھ تھے، اس موقع پر سورۂ فتح کی یہ آیت نازل ہوئی۔

ھم الذین کفروا وصدوکم عن المسجد الحرام والھدی معکوفا ان یبلغ محلہ ولولا رجال مؤمنون ونساء مؤمنات لم تعلموھم ان تطوؤھم فتصیبکم منھم معرۃ بغیر علم لیدخل اللہ فی رحمتہ من یشاء لو تزیلوا لعذبنا الذین کفروا منھم عذابا الیما ۝

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور نیز قربانی کے جانور کو جو رکا ہوا رہ گیا، اس کے موقع میں پہنچنے سے روکا اور اگر (مکہ میں اس وقت) بہت سے مسلمان مرد اور بہت سی مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن کی تم کو خبر نہ تھی یعنی

ان کے پس جانے کا احتمال نہ ہوتا جس پر ان کی وجہ سے تم کو بھی بے خبری میں ضرر پہنچتا (تو سب قصہ طے کر دیا جاتا لیکن ایسا اس لیے نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرے، اگر یہ ٹل گئے ہوتے تو ان میں جو کافر تھے ہم ان کو دردناک سزا دیتے۔

۱۱۔ جب صلح کی شرطیں طے پائیں کہ مسلمان اس سال واپس جائیں، آئندہ سال آکر عمرہ کریں تو بعض صحابہ خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی، آخر انھوں نے پوچھ ہی دیا، کیا آپ نے ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ ہم کعبہ جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ فرمایا ہاں۔ مگر کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سال جاؤ گے؟ کہا نہیں۔ حضور نے فرمایا بلاشبہ تم کعبہ جاؤ گے اور اس کا طواف کرو گے۔ حضرت ابو بکر نے بھی حضرت عمر کو ہو بہو یہی جواب دیا۔ سورۂ فتح کی یہ آیتیں اسی موقعہ پر نازل ہوئیں۔

لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین محلقین رؤسکم و مقصرین لا تخافون فعلم مالم تعلموا فجعل من دون ذلک فتحا قریبا ٥ (۲۷)

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ انشاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہوگے اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمھیں کوئی خوف نہ ہوگا، وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے، اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔

۱۲۔ اہلِ حرم امن چین سے رہتے سہتے تھے، اس کے برعکس اطراف و اکناف کے بدوؤں میں لوٹ کھسوٹ اور قتل و خونریزی کا دور دورہ رہتا تھا، کفارِ مکہ کو معلوم تھا کہ ان کے دن اور چین کی راتیں حرم کا صدقہ ہیں، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بانی حرم کا مذہب کیا تھا اور ان کی زندگیاں اس مذہب سے کس قدر دور جا پڑی تھیں، تاہم وہ باطل پر مصر اور اللہ کے احسان کے منکر تھے،

چنانچہ سورۂ عنکبوت میں یہی بات کہی ہے:

اولم یروا انا جعلنا حرما آمنا ویتخطف الناس من حولهم افبالباطل یومنون وبنعمة الله یکفرون ۵ (۶۷)

کیا ہماری اس قدرت کی نشانی کو لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم مکہ کو (جو ایک غیر معروف بے رونق خطہ تھا) امن وحفاظت کا گھر بنا دیا اور ایک عالم نے اس کے اردگرد ہجوم کیا؟ پھر کیا لوگ باطل پر ایمان لاتے اور اللہ کی نعمتوں کو جھٹلاتے ہیں۔؟

کفار کہتے تھے اگر ہم آپ کا کہا مان لیں تو قرب وجوار کے مشرک قبیلوں سے کٹ جائیں گے بلکہ اندیشہ ہے کہ یہ سب ہم ٹوٹ پڑیں گے اور درپئے آزار ہوں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے وطن میں بھی چین سے گزر بسر نہ کرسکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ معذرت نقل کی ہے اور یہ کہہ کر اس کا رد کیا ہے کہ یہ معذرتیں بے بنیاد ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے تمہیں امن وامان کی جگہ یعنی حرم محترم میں رکھا، حرم کی یہ روایت اول دن سے چلی آرہی ہے، تم اس سے مستفید ہو رہے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کفار ومشرکین کے لیے تو حرم امن کی جگہ ہو مگر مسلمانوں اور مومنوں کے لیے یہاں جینا دوبھر ہو جائے؟ پھر تمہیں گھر بیٹھے ہر قسم کا سامان خورد ونوش دستیاب ہوتا رہتا ہے ہمارے ہی فضل وکرم نے یہ سارے بندوبست کیے ہیں۔ چنانچہ سورۂ قصص میں بھی یہی بات دہرائی ہے۔

۱۳- وقالوا ان نتبع الهدى معك نتخطف من ارضنا اولم نمكن لهم حرما آمنا یجبى الیه ثمرات كل شيء رزقا من لدنا ولكن اكثرهم لا یعلمون ۵ (۵۷)

وہ کہتے ہیں، اگر ہم تمہارے ساتھ ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پرامن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟

مگر ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

مسجد حرام کی وجہ سے باشندگانِ مکہ خصوصاً قریش کو بڑی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ دُور دُور تک ان کا وقار اور دبدبہ قائم تھا، اللہ کے گھر کے پڑوسی اور پاسبان کی حیثیت سے ان کا بڑا احترام تھا، ساتھ ہی ان کا یہ مقام بعض مقامات پر کھٹکتا بھی تھا۔ یہی چیز حاکم حبشہ ابرہہ کو بھی کھلی اور وہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے فوجی مہم لے کر چلا، مقصود یہ تھا کہ عرب کے حاجیوں کی توجہ کعبہ سے پھیر دی جائے، یہ لشکر ہاتھیوں کے ساتھ ہر طرح مسلح حجاز کی طرف چلا اور اس نے مکہ سے قریب مغمس نامی مقام پر ڈیرے ڈالے۔ یہاں عربوں اور حبشیوں کے درمیان کچھ جھڑپیں ہوئیں، مگر ابرہہ کی فوج نے منہ کی کھائی۔ اس شکست کے اسباب کئی ایک تھے۔ حملہ آور فوج یمنی اور حجازی قبائل کے جوابی حملوں کی تاب نہ لاسکی، پھر اس فوج میں بیماریاں پھوٹ پڑیں اور وہ بات بھی پیش آئی جس کا ذکر اس سورت میں آیا ہے۔ یعنی پرندوں نے حبشی فوج پر ایسی کنکریاں پھینکیں جن سے فوج کا بڑا حصہ ختم ہوگیا، ابرہہ ناکام و نامراد الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ عرب کی تقویم میں یہ سال عام الفیل کہلاتا ہے۔ روایت ہے کہ ولادت باسعادت اسی سال ہوئی تھی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

۱۴۔ سورۂ فیل میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ اللہ نے ایک دشمن کے حملے سے اپنے گھر کی حفاظت تو کی ہی، ساتھ ہی بالواسطہ متولیانِ حرم کی ساکھ بھی قائم رکھی۔

الم تر کیف فعل ربک باصحٰب الفیل ۝ الم یجعل کیدھم فی تضلیل ۝ وارسل علیھم طیرا ابابیل ۝ ترمیھم بحجارۃ من سجیل ۝ فجعلھم کعصف ماکول ۝

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ جھنڈ بھیج دیے جو ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے جانوروں کا کھایا

ہوا بھُوسا ہے۔

۱۵- ایسا ہی احسان سورۂ قریش میں بھی یاد دلایا گیا ہے:

لایلاف قریش ۵ ایلافھم رحلۃ الشتاء والصیف ۵ فلیعبدوا رب ھذا البیت ۵ الذی اطعمھم من جوع و اٰمنھم من خوف ۵

چونکہ قریش مانوس ہوئے (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس، لہٰذا ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انھیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔

ترتیب کے لحاظ سے یہ سورت سورۂ فیل کے بعد درج ہے، ویسے دونوں سورتیں مکی ہیں۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ قریش کو اپنے احسانات کو یاد دلا رہا ہے، کہ انھیں کعبہ دے کر عزت دی، ابرہہ جیسے دشمن سے اس گھر کی حفاظت کی جو ان کے لیے باعثِ صد افتخار ہے، پھر انھیں اپنے گھر کے زیرِ سایہ جگہ دی وہیں بسایا۔ اور دنیا بھر میں شرف و عزت اور امن واطمینان کی زندگی عطا کی، سرما میں یمن کا سفر، گرما میں شام کا سفر، مالِ تجارت ساتھ، کوئی تعرض کرنے والا نہیں، کسی سے گزند کا اندیشہ نہیں، یہ ساری نعمتیں کیا اس کا تقاضا نہیں کرتیں کہ اہالیانِ حرم ذاتِ واحد ہی کی بندگی کریں؟ اس کا فضل و کرم نہ ہوتا تو وادیِ غیر ذی زرع میں کیسی سیری اور کہاں کی سیر شکمی؟ پھر رہزنوں اور اچکوں کا راج ہوتا تو انھیں اطمینان اور سکون کیسے نصیب ہو سکتا تھا؟ سفر و قیام کی یہ سہولتیں اور آسائشیں خدائے واحد ہی کی ربوبیت کا کرشمہ ہیں۔

۱۶- اللہ کے قانون نے باشندگانِ مکہ کو مہلتوں پر مہلتیں دیں مگر وہ راہِ راست پر نہ آئے نہ بیت اللہ کو خدائے واحد کی یاد کے لیے خاص کیا اور نہ ایسا کرنے والوں کے لیے جگہ خالی کی، نہ صرف یہ کہ اہلِ حق کو اس میں داخل ہونے سے روکتے تھے بلکہ انھوں نے اسے

باطل کے پرچار کا مرکز بنالیا تھا اور جانتے بوجھتے اس کی تخریب کا باعث بنے ہوئے تھے۔
چنانچہ سورۂ بقرہ میں ایسے تخریب کاروں کو ظالم کہا گیا ہے۔

ومن اظلم ممن منع مساجد اللّٰہ ان یذکر فیھا اسمہٗ وسعیٰ فی خرابھا
اولئک ماکان لھم ان یدخلوھا الا خائفین۰ لھم فی الدنیا
خزی ولھم فی الاٰخرۃ عذاب الیم ۰ (۱۱۴)

اور غور کرو اس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان کون ہو سکتا ہے، جو اللہ کی
عبادت گاہوں میں اس کے نام کی یاد کو روکے اور ان کی ویرانی میں کوشاں ہو؟
جن لوگوں کے ظلم کا یہ حال ہے یقیناً وہ اس لائق نہیں کہ خدا کی عبادت گاہوں میں
قدم رکھیں بجز اس حالت کے کہ (دوسروں کو اپنی طاقت سے ڈرانے کی جگہ خود
دوسروں کی طاقت سے) ڈرے سہمے ہوں۔ یاد رکھو! ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں
بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی سخت عذاب ہے۔

یہاں مشرکینِ مکہ مراد ہیں، جنھوں نے حدیبیہ کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو
مکۂ مکرمہ میں داخل ہونے سے روکا تھا، اس صورت میں تخریب سے مراد کعبۃ اللہ کی عمارت
کا ڈھا دینا نہیں ہے بلکہ اللہ کی یاد سے روک کر اس کی ویرانی کا باعث بننا ہے۔

۱۷۔ جب قریش نے اپنی جگہ خالی نہیں کی تو اللہ کی قدرت نے خالی کرادی، نااہلوں کی
معزولی اور اہل لوگوں کی بحالی کا قانون رفتہ رفتہ نافذ ہونے لگا، اس سلسلہ کی پہلی کڑی یہ
تھی کہ ہجرت کے بعد کفارِ مکہ عذابِ الٰہی کا شکار ہوئے، اب تک جو عذاب رکا ہوا تھا وہ
اس لیے تھا کہ ذاتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سپر بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ سورۂ انفال میں
ارشاد ہو رہا ہے:

وما لھم الا یعذبھم اللّٰہ وھم یصدون عن المسجد الحرام وما
کانوا اولیاءہٗ ۰ ان اولیاؤہٗ الا المتقون ولکن اکثرھم لا یعلمون۰

وما کان صلاتهم عند البیت إلا مکاء وتصدیة فذوقوا العذاب
بما کنتم تکفرون ○ (۳۴-۳۵)

(لیکن (اب کہ تجھے مکہ چھوڑ دینے پر انھوں نے مجبور کر دیا) کونسی بات رہ گئی کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے، حالانکہ وہ مسجدِ حرام سے مسلمانوں کو روک رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے متولی ہونے کے لائق نہیں اس کے متولی اگر ہو سکتے ہیں تو ایسے لوگ ہی ہو سکتے ہیں جو متقی ہوں (نہ کہ مفسد و ظالم) لیکن ان میں سے اکثروں کو (یہ حقیقت) معلوم نہیں، اور خانۂ کعبہ میں ان کی نماز اس کے سوا کیا تھی کہ سیٹیاں بجائیں اور تالیاں پیٹیں با تو دیکھو جیسے کچھ کفر کرتے رہے ہو اب (اس کی پاداش میں) عذاب کا مزہ چکھ لو!

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مقدس کی برکت سے مشرکینِ مکہ پر عذاب نازل نہیں ہوا! جب آپ ہجرت کر کے تشریف لے گئے تو عذاب نازل ہو کر رہا۔ چنانچہ قریش کے بڑے بڑے سردار معرکۂ بدر میں قتل بھی ہوئے اور قید بھی یہ لوگ مسجدِ حرام پر ناجائز قبضہ جمائے بیٹھے تھے وہی اس کے متولی اور مجاور تھے۔ حالانکہ کعبہ کی تولیت و مجاوری متقیوں کا حق ہے اور فریقین میں وہ فریق متقی ہے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرامؓ پر مشتمل تھا۔

بلاشبہ مشرکین کعبۃ اللہ کا احترام کرتے تھے مگر طواف وغیرہ کے دوران ایسی حرکتیں کرتے تھے جو سرتاپا بچکانی اور احترام کعبہ کے منافی تھیں۔

۱۸- حکم ہوا جن لوگوں نے صلح حدیبیہ کی شرطیں ملحوظ رکھتے ہوئے جوارِ حرم میں مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا ان پر مسلمان بھی حملہ نہ کریں، اگر اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہو تو مسلمانوں کو بھی اختیار ہے کہ ترکی بہ ترکی جواب دیں۔ سورۂ توبہ کی آیت ہے۔

کیف یکون للمشرکین عهد عند الله وعند رسوله إلا الذین
عاهدتم عند المسجد الحرام فما استقاموا لکم فاستقیموا لهم
إن الله یحب المتقین ○ (۷)

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ (ان) مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں! جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب (حدیبیہ) میں عہد و پیمان باندھا تھا (اور انھوں نے اسے نہیں توڑا) تو (ان کا عہد) ضرور عہد ہے اور جب تک وہ تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہو، اللہ انھیں دوست رکھتا ہے جو (اپنے کاموں میں) متقی ہوتے ہیں۔

۱۹۔ مشرکین مکہ خانۂ کعبہ کے رسمی پاسبان تھے، اور ویسے ہی پاسبان تھے جیسے دودھ کی رکھوالی بلّی۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ مسجدِ حرام کی حرمت پوری طرح ملحوظ رکھیں، ہاں دفاع ناگزیر ہو جائے تو مسجدِ حرام میں بھی تلوار اٹھانے کی اجازت ہے، کعبہ کے نام نہاد متولیوں کو خود ان کے گھروں میں سزا ملنی چاہیے، چنانچہ سورۂ بقرہ میں فرمایا!

واقتلوا ھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد من القتل، ولا تقاتلوھم عند المسجد الحرام حتی یقاتلوکم فیہ فان قاتلوکم فاقتلوھم۔ کذٰلک جزاء الکافرین (۱۹۱)

(اہل مکّہ نے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے تو تمہاری طرف سے بھی اعلان جنگ ہے) جہاں کہیں پاؤ انھیں قتل کرو اور جس جگہ سے انھوں نے تمہیں نکالا ہے تم بھی انھیں لڑ کر نکال باہر کرو، اور فتنہ قائم رہنا قتل و خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے (باقی رہا حرم کی حدوں کا معاملہ کہ ان کے اندر لڑائی کی جائے یا نہ کی جائے تو اس بارے میں حکم یہ ہے کہ) جب تک وہ خود مسجدِ حرام کے حدود میں لڑائی نہ کریں تم بھی اس جگہ ان سے لڑائی نہ کرو پھر اگر ایسا ہو کہ انھوں نے لڑائی کی تو تمہارے لیے بھی یہی ہوگا کہ لڑو، منکرینِ حق (کی ظالمانہ پیش قدمیوں) کا یہی بدلہ ہے۔

۲۰۔ رفتہ رفتہ مشرکینِ مکّہ کا موقف کمزور ہوتا جاتا تھا اور اسی تناسب سے مسلمان

بالادست ہوتے جاتے تھے مشرکین کی ہٹ اور ضد اس وقت شباب پر تھی، جب مسلمان بے بسی کی تصویر تھے، جب کایا پلٹ ہوگئی تو مشرکین کے لب ولہجہ میں انکار کے بجائے سوال اور قطعیت کے بجائے معذرت ظاہر ہونے لگی۔ سورۂ بقرہ کی یہ آیت اسی حقیقت کی غمازی کر رہی ہے۔

يسئلونك عن الشهر الحرام قتال فيه قل قتال فيه كبير وصد عن سبيل الله وكفر به والمسجد الحرام واخراج اهله منه اكبر عند الله والفتنة اكبر من القتل ولا يزالون يقاتلونكم حتى يردوكم عن دينكم ان استطاعوا ومن يرتدد منكم عن دينه فيمت وهو كافر فاولئك حبطت اعمالهم فى الدنيا والآخرة واولئك اصحب النار هم فيها خالدون (۲۱۷)

اے پیغمبر! لوگ تم سے پوچھتے ہیں جو مہینہ حرمت کا مہینہ سمجھا جاتا ہے اس میں لڑائی کرنا کیسا ہے؟ ان سے کہہ دو اس میں لڑائی لڑنا بڑی برائی کی بات ہے مگر (ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو کہ) انسان کو اللہ کی راہ سے روکنا (یعنی ایمان اور خدا پرستی کی راہ اس پر بند کردینی) اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام میں نہ جانے دینا نیز مکہ سے وہاں کے بسنے والوں کو نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برائی ہے اور فتنہ (یعنی ظلم وفساد) قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور (یاد رکھو) یہ لوگ تم سے برابر لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر بن پڑے تو تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کردیں اور دیکھو تم میں سے جو شخص اپنے دین سے برگشتہ ہوجائے گا اور اسی حالت برگشتگی میں دنیا سے جائے گا تو یاد رکھو اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جن کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی گروہ ہے ہمیشہ عذاب میں رہنے والا!

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش کو ۲ھ میں ایک سریہ کا سردار بنایا انھیں ایک خط لکھوا کر دیا، تاکید فرمادی کہ دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد ہی یہ خط کھولیں۔

ساتھیوں کو پڑھ کر سنائیں، اور جو مہم انھیں درپیش ہے اس کے سر کرنے میں کوئی ساتھی کوتاہی نہ کرے، خود حضورؐ کے الفاظ میں مہم یہ تھی کہ "تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وادیٔ نخلہ جاؤ۔ جو نجد اور طائف کے درمیان واقع ہے ــــ وہاں قریش کے تجارتی قافلہ پر نظر رکھو اور اس کی خبریں ہمیں پہنچاؤ"، اس خط میں لڑائی جھگڑے کا ذکر مذکور کچھ نہیں تھا، مقصد صرف اس قدر تھا کہ دشمن کی نقل وحرکت معلوم کی جائے۔ مگر نامۂ مبارک پڑھ سُن لینے کے بعد جو صورتِ حال پیش آئی وہ یہ تھی کہ اس سریہ کے دو آدمی سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان اپنے گم شدہ اونٹوں کی تلاش میں نکلے، قریش نے انھیں قید کرلیا، پھر قریش کا تجارتی قافلہ نخلہ سے گذرا، عمرو بن حضرمی اس کا سردار تھا، رجب کی آخری تاریخ تھی، ادھر قریش نے ہجرت کے وقت بعض مسلمانوں کی دولت مکہ میں روک لی تھی۔ ایسے دل جلے بھی اس سریہ میں کچھ لوگ تھے، انھوں نے باہمی صلاح ومشورہ کیا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں، قافلہ سے تعرض نہیں کریں گے تو وہ شب بھر میں حدودِ حرم میں داخل ہو جائے گا۔ اس طرح قریش کے روکے ہوئے مال ودولت کی تلافی کا سنہری موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آخر انھوں نے حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ عمرو بن حضرمی کو مار ڈالا۔ دو مشرکوں کو قید کرلیا اور کچھ غنیمت بھی حاصل کی، جب مدینہ لوٹ آئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں غنیمت کا پانچواں حصہ پیش کیا تو آپ نے لینے سے انکار کردیا، ان کے اقدام کو ناپسند فرمایا بلکہ صاف طور پر کہہ دیا کہ میں نے تو تمھیں حرمت کے مہینہ میں لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ پھر مدینہ کی ساری مسلم آبادی بھی اس سریہ کے لوگوں سے بددل سی ہوگئی، یہ آیت اسی موقعہ پر نازل ہوئی تھی۔

اُدھر کفّار نے طعنہ دیتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ محمدؐ اللہ کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ دیکھو! اسی نے حرمت کے مہینہ کو حلال کرنے میں پہل کی اور ہمارے آدمی کو ماہ رجب میں مروا ڈالا۔ مسلمانوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ یہ قتل جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخ کو ہوا تھا۔ جب رجب شروع ہوا تو مسلمانوں نے اپنی تلواریں نیام میں کرلیں۔

تاریخِ قتل سے متعلق یہ توجیہ ابن کثیر کی روایت میں ملتی ہے، محمد فرید وجدی نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو جمادی الاخریٰ اور رجب کے بارے میں شبہ ہو گیا تھا۔ وہ اس خیال میں تھے کہ ابھی رجب شروع نہیں ہوا ہے، بہرحال غلطی مسلمانوں کی تھی، کفّار نے پروپیگنڈے کی مہم تیز کر دی اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت کے اونٹ اور کافروں کے قیدی ماہ رجب کے احترام کے طور پر اہل مکّہ کو لوٹا دیے۔

اللہ تعالیٰ مشرکین سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ فرض کرو مسلمانوں نے یہ جرم کیا مگر.... تم نے تو اس سے بھی بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے یعنی اللہ کا انکار کیا، محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو مسجدِ حرام سے روکا حالانکہ مسجدِ حرام کے حقدار تو وہی تھے۔ یہ سو جرموں کا ایک جرم ہے اور اللہ کی نظر میں قتل وخوں ریزی سے بڑھ کر سنگین ہے۔

۲۱- قریش نے کعبہ اور زائرینِ کعبہ کی خدمت کے لیے کچھ محکمے قائم کر لیے تھے، مثلاً کعبہ کی تولیت حجابہ کہلاتی تھی، حاجیوں کی خاطر تواضع کے لیے افادہ اور سقایہ موجود تھے۔ ان مناصب کے لیے مختلف قبائل میں اچھی خاصی رسہ کشی بھی رہتی تھی کیونکہ یہ اعزاز واکرام کے عہدے سمجھے جاتے تھے۔ ان اعمال کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا، مگر اس صورتِ حال کا کیا علاج کہ یہ رواجی نیکیاں روحِ ایمان سے خالی تھیں، مشرکین سمجھتے تھے یہ سرگرمیاں ایمان وجہاد سے افضل نہیں تو ان کے برابر تو ضرور ہیں حتیٰ کہ بدری قیدی عباس بن عبدالمطلب نے بھی یہ بات دہرائی تھی، قرآن نے اس زعمِ باطل کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ کجا ایمان وجہاد کی سرفروشانہ زندگی اور کجا خدمتِ حجاج کی سہل پسندی۔ ہر فریقین کے اعمال میں زمین آسمان کا فرق ہے، لہٰذا دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا نہیں جا سکتا۔ یہ مضمون بڑی صفائی اور وضاحت کے ساتھ سورۂ توبہ میں بیان ہوا ہے۔

ماکان للمشرکین ان یعمروا مسٰجد اللّٰہ شاھدین علٰی انفسھم بالکفر
اولٰئک حبطت اعمالھم وفی النار ھم خالدون ۝ انما یعمر

مسٰجد اللہ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر واقام الصلوٰۃ و
اٰتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ فعسیٰ اُولٰئک ان یکونوا من
المھتدین ۵ اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام
کمن اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وجاھد فی سبیل اللہ لا یستوٗن
عند اللہ واللہ لا یھدی القوم الظٰلمین ۵ (۱۷-۱۹)

مشرکوں کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا ...... کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، ایسی
حالت میں کہ وہ خود اپنے کفر کا اعتراف کر رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے
سارے عمل اکارت گئے اور وہ عذاب آتش میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، فی الحقیقت
مسجدوں کو آباد کرنے والا تو وہ ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا،
نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ مانا، جو لوگ ایسے ہیں
انہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ (سعادت و کامیابی کی) راہ پانے والے ثابت
ہوں گے! کیا تم لوگوں نے یوں ٹھہرا رکھا ہے کہ حاجیوں کے لیے سبیل لگانا اور
مسجد حرام کو آباد رکھنا اس درجہ کا کام ہے، جیسا اس شخص کا جو اللہ پر اور آخرت
کے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر
نہیں اور اللہ (کا قانون ہے کہ وہ) ظلم کرنے والوں پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا۔

یہاں ایک قرأت میں مساجد کی بجائے مسجد واحد آیا ہے، اس صورت میں کعبۃ اللہ مراد
ہے، جمع کی صورت میں ساری ہی مسجدیں مقصود ہیں، دونوں صورتوں میں یہ حکم عام ہے کہ ان میں
عبادت گزاری کے حقدار وہی لوگ ہیں جو خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہیں، غیروں کا ان میں
کوئی حصہ نہیں۔

۲۲۔ یہاں یہ فرمایا ہے کہ شرک و بت پرستی کرنے والے بیت اللہ کے آباد کار نہیں
ہو سکتے، آگے چل کر یہ بات بھی صاف کر دی کہ شرک کی آلائشوں میں ملوث لوگ بیت اللہ کے

قریب بھی پھٹکنے نہ پائیں، آبادکاری کا تو سوال ہی نہیں، چنانچہ فرمایا:

یا ایھا الذین اٰمنوا انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھٰذا وإن خفتم عیلۃ فسوف یغنیکم اللّٰہ من فضلہ ان شاء ان اللّٰہ علیم حکیم (۲۸)

مسلمانو! حقیقت حال اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مشرک نجس ہیں (یعنی شرک نے ان کے دلوں کی پاکی سلب کر لی ہے) پس چاہیے کہ اب اس برس کے بعد سے (یعنی سنہ ۹ھ کے بعد سے) مسجد حرام کے نزدیک نہ آئیں اور اگر تم کو (ان کی آمد و رفت بند ہو جانے سے) فقر و فاقہ کا اندیشہ ہو (کہ وہ ہر طرح کی ضروری چیزیں باہر سے لاتے اور تجارت کرتے ہیں) تو گھبراؤ نہیں، اللہ چاہے گا تو عنقریب تمہیں اپنے فضل سے تونگر کر دے گا، اللہ سب کچھ جانتا اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

یہ آیت سنہ ۹ھ میں نازل ہوئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امیر حج مقرر فرمایا، چند دن بعد حضرت علی کے ذریعہ "برامت" کی آیتیں مکہ مکرمہ روانہ فرمائیں کہ کفار مکہ کو پڑھ کر سنا دی جائیں اور یہ اعلان بھی کر دیا جائے کہ آئندہ سال سے کوئی مشرک کعبہ کا قصد بھی نہ کرے۔ ننگا طواف کرنا تو بعد کی بات ہے، یہاں مسجد حرام سے مراد سارے حدود حرم ہیں۔

۲۳- مسجدِ حرام کی حرمت ہی سے متعلق ایک اہم بات تحویلِ قبلہ ہے، مدینۂ منورہ میں قبلۂ اول سولہ سترہ مہینے تک تھا، جب تک بیت المقدس کی طرف قبلہ رہا یہودی بہت خوش تھے لامحالہ قبلہ کی تبدیلی انھیں ناگوار گزری، اس پر سورۂ بقرہ میں فرمایا:

قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضٰھا فول وجھک شطر المسجد الحرام وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہٗ وان الذین اوتوا الکتاب لیعلمون انہ الحق من ربھم وما اللّٰہ بغافل عما یعملون ○ (۱۴۴)

(اے پیغمبر!) ہم دیکھ رہے ہیں کہ (حکم الٰہی کے شوق و طلب میں) تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اُٹھ اُٹھ جاتا ہے تو یقین کرو، ہم عنقریب تمہارا رخ ایک ایسے قبلے کی طرف پھیر دینے والے ہیں جس سے تم خوشنود ہو جاؤ گے (اور اب کہ اس معاملہ کے ظہور کا وقت آگیا ہے) تو چاہیے کہ تم اپنا رخ مسجد حرام (یعنی خانۂ کعبہ) کی طرف پھیر لو اور جہاں کہیں بھی تم اور تمہارے ساتھی ہوں ضروری ہے کہ (نمازیں) رخ اسی طرف کو پھر جایا کرے، اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے (یعنی یہود و نصاریٰ) وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے (کیونکہ ان کے مقدس نوشتوں میں اس کی پیشین گوئی موجود ہے) اور جیسے کچھ ان کے اعمال ہیں اللہ ان سے غافل نہیں ہے!

۴۲- اسی سلسلۂ کلام میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

ومن حیث خرجت فول وجھک شطر المسجد الحرام وانہ للحق من ربک وما اللہ بغافل عما تعملون ٥ ومن حیث خرجت فول وجھک شطر المسجد الحرام وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ لئلا یکون للناس علیکم حجۃ إلا الذین ظلموا منھم فلا تخشوھم واخشونی ولاتم نعمتی علیکم ولعلکم تھتدون ٥ (۱۴۹-۱۵۰)

اور (اے پیغمبر) تم کہیں سے بھی نکلو (یعنی کسی سمت اور کسی مقام میں بھی ہو) لیکن (نماز میں) رُخ اسی طرف کو پھیر لو، اور (اے پیروان دعوت قرآنی) تم بھی اپنا رُخ اسی طرف کو کر لیا کرو، خواہ کسی جگہ اور کسی سمت میں ہو، اور یہ (جو تقرر قبلہ پر اس قدر زور دیا گیا ہے تو یہ) اس لیے ہے تاکہ تمہارے خلاف لوگوں کے پاس کوئی دلیل باقی نہ رہے (اور یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ معبد ابراہیمی ہی تمہارا قبلہ ہے)، البتہ جو لوگ حق سے گزر چکے ہیں (ان کی مخالفت ہر حال میں جاری رہے گی) تو ان سے نہ ڈرو

مجھ سے ڈرو اور علاوہ بریں یہ (حکم) اس لیے بھی (دیا گیا) ہے کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کر دوں، نیز اس لیے کہ (سعی و عمل کی) سیدھی راہ پر تم لگ جاؤ۔

تحویلِ قبلہ کی بات سورۂ بقرہ میں تین مرتبہ دہرائی گئی ہے پہلی بار فرمایا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول ہوگی اور انھیں دل پسند قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا جائے گا، دوسری بار فرمایا یہی موقف حق ہے، من جانب اللہ ہے، اور رسول کی پسند کے موافق ہے، تیسری مرتبہ مخالفین کی دلیل کا رد کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ان کی کتابوں میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ نیا قبلہ کعبہ ہوگا۔

مسجد اقصیٰ

۲۵۔ مسجدِ حرام کے بعد قرآن مجید میں مسجد اقصیٰ کا ذکر بھی آیا ہے، چنانچہ بنی اسرائیل کی پہلی ہی آیت میں تصریح کی گئی ہے کہ قبلہ اوّل سفرِ معراج میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری منزل تھی، سائنس اور ٹکنالوجی کی طفولیت کے زمانے میں سفرِ معراج اور اس کی کیفیت ہے باعثِ خلش اور محتاجِ تشریح رہی ہو، اب جبکہ یہ علوم معراجِ کمال کو پہنچ چکے ہیں اور انسان نے اللہ کی دی ہوئی عقل اور دانائی سے کام لے کر پرندوں کی طرح اڑنا، ہوا سے باتیں کرنا اور آواز بلکہ روشنی سے زیادہ تیز سفر کرنا سیکھ لیا ہے یہ باتیں خود بخود سمجھ میں آسکتی ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ہوا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا تابع بنا دیا تھا اور پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر عرش و سمار کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا آیت ملاحظہ ہو:

سبحان الذی أسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ لنریہ من اٰیاتنا انہ ھو السمیع البصیر ہ

پاکی ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے کو (یعنی پیغمبر اسلام کو) راتوں رات

مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کہ اس کے اطراف ہم نے بڑی ہی برکت دی ہے سیر کرائی اور اس لیے سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں اسے دکھا دیں، بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی دیکھنے والی ہے!

مولانا ابوالکلام آزادؒ لکھتے ہیں "یہاں مسجدِ حرام سے مقصود مکہ ہے اور مسجدِ اقصیٰ سے بیت المقدس ہیکل، اسے اقصیٰ اس لیے فرمایا کہ عرب کے لیے قریب کی عبادت گاہ خانۂ کعبہ تھی اور دور کی عبادت گاہ ہیکل"۔[1]

مسجدِ اقصیٰ کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حسب ایماء جنوں نے بنایا تھا۔ یہ عمارت دسویں صدی قبل مسیح میں وجود میں آئی ہیکل سلیمانی کہلاتی ہے، یروشلم میں موریا نامی پہاڑیوں واقع ہے، قریب ہی گنبد صخرہ واقع ہے۔ تعمیر کے چار سو سال بعد ۵۸۶ ق م میں بخت نصر نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، پچاس ساٹھ برس بعد دوبارہ تعمیر ہوئی تو سکندر اعظم کے ایک جانشین نے ۱۶۷ ق م میں اسے مندر میں تبدیل کر دیا، پھر عیسوی سن کے ابتدائی سالوں اس کی قدیم حیثیت بحال ہوئی، شہنشاہ ٹیٹس نے ۷۰ء میں اسے پھر زمین کے برابر کر دیا۔

۲۶۔ اسی سورت میں ذرا آگے چل کر مسجدِ اقصیٰ کی انہی بار بار کی بربادیوں کا ذکر کیا گیا ہے:

إن احسنتم احسنتم لأنفسكم وان اسأتم فلها، فاذا جاء وعد الآخرة ليسوءا وجوهكم وليدخلوا المسجد كما دخلوه اول مرة وليتبروا ما علوا تتبيرا (۷)

اگر تم نے بھلائی کے کام کیے تو اپنے ہی لیے کیے اور اگر برائیاں کیں تو بھی اپنے ہی لیے کیں، پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو بھیج دیا) تاکہ تمہارے چہروں پر رسوائی پھیر دیں اور اسی طرح (ہیکل کی) مسجد میں داخل

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۴۶۔

ہو جائیں جس طرح پہلی مرتبہ حملہ آور گھسے تھے اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم لکھتے ہیں "آیت نمبر ۴ میں کتاب سے مقصود انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفے ہیں، چنانچہ یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقیل کی کتابوں میں بنی اسرائیل کے دو بڑے فسادوں اور دو بڑی بربادیوں کی خبر دے دی گئی تھی، پہلی بربادی بابل کے بادشاہ بنوکدنزر (بخت نصر) کے حملہ سے ہوئی، دوسری رومیوں کے حملے سے جو ٹیٹس کے زیر قیادت ہوئی تھی۔ بابل کے حملے نے صرف یہودیا کی آبادیوں ہی کو پامال نہیں کیا تھا، بلکہ بنی اسرائیل کی نسل و قومیت بھی ہلاک و منتشر ہو گئی تھی۔ لیکن ایک صدی کے بعد گردشِ زمانہ نے پھر پلٹا کھایا اور کارسازِ قدرت نے وقت کی سب سے بڑی فاتح شہنشاہیت کو ان کی اعانت و دست گیری کے لیے کھڑا کر دیا، یعنی شہنشاہِ فارس کو، اب یہودیا کی تمام اجڑی بستیاں پھر آباد ہو گئیں، اور یہودی جمعیت کا جسم مردہ پھر زندہ ہو گیا، آیت نمبر ۶ میں اسی عہد کی طرف اشارہ کیا ہے، فرمایا اگر تم نے اچھے کام کیے تھے تو اپنے ہی لیے کیے تھے، یعنی اس کے نتائج تمہارے ہی حصے میں آئے اور بدعملیاں کی تھیں تو وہ بھی اپنے ہی لیے کی تھیں۔ اس کی پاداش بھی تمہارے ہی حصے میں آئی، چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اس دوسری مہلت کی بھی تم نے قدر نہ کی اور اپنی توبہ و انابت کے وہ تمام عہد بھلا دیے جو بابل کی اسیری کے زمانے میں کیے تھے، تو پھر دوسری ہلاکت کا وقت نمودار ہو گیا، یعنی رومی حملہ کا یہ بنی اسرائیل کی آخری ہلاکت تھی، اس کے بعد پھر نہ سنبھل سکے[1]

مسجدِ نبوی، مسجدِ قبا، مسجدِ ضرار

۲۷۔ مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ کے بعد قرآن پاک میں مسجدِ نبوی اور مسجدِ قبا کا ذکر بھی آیا ہے اور منافقوں کی بنائی ہوئی اس مسجد کا بھی جو مسجد ضرار کے نام سے مشہور رہوئی، سورۂ توبہ میں فرمایا۔

والذین اتخذوا مسجدا ضرارا وکفرا وتفریقا بین المومنین وارصادا

---

[1] ترجمان القرآن: جلد ۲ ص: ۳۴۶ - ۳۴۸۔

المن حارب اللہ ورسولہ من قبل ولیحلفن ان اردنا الا الحسنی واللہ یشہد انہم لکذبون ٥ لا تقم فیہ ابدا لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق أن تقوم فیہ، فیہ رجال یحبون ان یتطہروا واللہ یحب المطہرین ٥ افمن اسس بنیانہ علی تقوی من اللہ ورضوان خیرام من اسس بنیانہ علی شفا جرف ھار فانہار بہ فی نار جہنم واللہ لا یہدی القوم الظالمین ٥ لا یزال بنیانہم الذی بنوا ریبۃ فی قلوبہم الا ان تقطع قلوبہم واللہ علیم حکیم (١٠٧-١١٠)

اور (منافقوں میں سے وہ لوگ بھی ہیں) جنھوں نے اس غرض سے ایک مسجد بنا کر کھڑی کی کہ نقصان پہنچائیں، کفر کریں، مومنوں میں تفرقہ ڈالیں اور ان لوگوں کے لیے ایک کمین گاہ پیدا کر دیں جو اب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکے ہیں، وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی ہو، لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں، (اے پیغمبر!) تم کبھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا - اس بات کی کہ اس میں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) وہی مسجد حقدار ہے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (مسجد قبا اور مسجد نبوی) اس میں ایسے لوگ (آتے) ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک وصاف رہیں اور اللہ بھی پاک وصاف رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔ کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی (جو کبھی ہلنے والی نہیں) یا وہ جس نے ایک کھائی کے گرتے ہوئے کنارے پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھی اور وہ مع اپنے مکین کے آتش، دوزخ (کے گڑھے) میں جا گری؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ انھیں (کامیابی وسعادت کی) راہ نہیں دکھاتا جو

ظلم کا شیوہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے (یعنی مسجد ضرار) ہمیشہ ان کے دلوں کو شک وشبہ سے مضطرب رکھے گی (یہ کانٹا نکلنے والا نہیں) مگر یہ کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں (کیونکہ یہ ان کے نفاق کی ایک بہت بڑی شرارت تھی جو چلی نہیں اس لیے ہمیشہ اس کی وجہ سے خوف وہراس کی حالت میں رہیں گے) اور اللہ سب کا حال جاننے والا (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا چار آیتوں میں تین مسجدوں کا ذکر ہے۔ مسجدِ قبا، مسجدِ نبوی، اور ضرار، چلتے چلتے ان مسجدوں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال لیجیے:

"قبا مدینہ سے جنوب مغربی سمت تقریباً ڈیڑھ میل پر ایک آبادی ہے۔ جہاں مختلف میووں کے باغات ہیں اور یہیں مسجدِ قبا واقع ہے جو اسلام کی سب سے پہلی مسجد کہلاتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں نماز پڑھنے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ہجرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری منزل تھی۔ یہاں آپ نے مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے چار روز تک قیام فرمایا تھا، جس جگہ آپ نے قیام فرمایا تھا یہ مسجد اسی جگہ تعمیر ہوئی۔ قبا اگرچہ مدینہ منورہ سے باہر ہے لیکن مدینہ منورہ سے اس کا تعلق ایسا ہی ہے جیسا کسی محلّہ کا ہوتا ہے۔ شنبہ کے دن قبا جانا اور اس مسجد میں نفل ادا کرنا مستحب ہے۔ حضورؐ کا معمول تھا، شنبہ کے روز یہاں تشریف لے جایا کرتے تھے"۔ [1]

ہجرت کے پہلے سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ مل کر اپنے دستِ مبارک سے اس مسجد کی تعمیر کی، اس کے لیے وہی جگہ پسند فرمائی جہاں ہجرت کے موقع پر آپؐ کی اونٹنی بیٹھی تھی۔ مسجد کی زمین آپ نے اس کے مالکوں سے قیمت ادا کر کے حاصل کی، ہجرت کے ساتویں سال آپؐ نے توسیع کر کے اسے مربع شکل میں کر دیا۔

---

[1] جزیرۃ العرب ص: ۲۰۸ ملخصاً۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد میں ایک نماز کی فضیلت ہزار نمازوں کے مساوی بتائی:
صلوٰۃ فی مسجدی ھٰذا خیر من الف صلوٰۃ فیما سواہ إلا المسجد الحرام
(مسلم) یہ درمیان شہر میں واقع ہے، اس کے جنوب مشرق میں ایک شاندار گنبد بنا ہوا ہے اور یہی گنبد

آرام گہِ پاکِ رسولِ عربی ہے

مدینہ میں خزرج کا ایک شخص تھا، ابو عامر، عیسائی ہو گیا تھا۔ عیسائی علوم بھی حاصل کیے تھے، اپنے قبیلے میں اثر و رسوخ رکھتا تھا، بدر میں مسلمانوں کی جیت ہوئی اور ہر سو اسلام کا ڈنکا بجنے لگا تو اس حاسد کو یہ باتیں ناگوار گزریں، کفار مکہ کے پاس پہنچا، انھیں مسلمانوں سے دوبارہ لڑنے پر آمادہ کیا، نتیجۃً معرکہ احد پیش آیا۔ اس ناہنجار نے احد میں بعض گڑھے بھی کھدوائے تھے، ایک میں خود حضورؐ گر پڑے، چہرۂ مبارک پر زخم آئے دندانِ مبارک شہید ہوا۔ اس نے انصار کو اپنا ہمنوا بنانا چاہا، مگر کامیاب نہ ہو سکا، حضورؐ نے اسے اسلام کی دعوت بھی دی، مگر اس نے ٹھکرا دی، آپ نے اس کے لیے بد دعا فرمائی: اسی کی تحریک و ترغیب پر منافقین نے مسجدِ قبا کے قریب ایک اور مسجد بنالی، جب آپ تبوک کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو مسجد مکمل تھی اور اس کے بانیوں نے آپ سے اس کے افتتاح کی درخواست کی اور کہا بڑوں بوڑھوں اور بیماروں کے لیے ہم نے یہ انتظام کیا ہے، خصوصاً جاڑوں کی سرد راتوں کا خیال اس کا محرک ہوا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہم سفر پر جا رہے ہیں، اللہ نے چاہا تو واپسی میں دیکھا جائے گا واپسی میں یہ آیتیں اتریں، راستہ ہی سے آدمی بھیجے گئے جنھوں نے یہ مسجد منہدم کر دی۔ روایتوں میں اس مسجد کے بنانے والے بارہ آدمیوں کے نام آئے ہیں، قرآن پاک نے ان کی نیتیں بھی واضح کر دیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں نماز پڑھنے پڑھانے سے روک دیا:

کعبۂ آسمانی

۲۸- ان ارضی عبادت گاہوں کے علاوہ قرآن پاک میں ایک آسمانی عبادتگاہ کا ذکر بھی آیا ہے۔

سورۂ طور کی ابتدائی آیتوں میں فرمایا:

والطور ٥ وکتاب مسطور ٥ فی رق منشور ٥ والبیت المعمور ٥

والسقف المرفوع ٥ والبحر المسجور ٥ (۱-٦)

قسم ہے طور (پہاڑ) کی، اور اس کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ میں لکھی ہے۔ اور (قسم ہے) بیت معمور کی اور (قسم ہے) اونچی چھت کی (مراد آسمانی ہے) اور (قسم ہے) دریائے شور کی جو (پانی سے) پر ہے۔

صحیحین میں مذکور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعۂ معراج بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ساتویں آسمان پر مجھے بیت معمور لے جایا گیا۔ اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں عبادت اور طواف کرتے ہیں، جیسے کعبہ کا طواف ہوتا ہے اسی طرح بیت معمور کا بھی ہوتا ہے، یہ ساتویں آسمان والوں کا کعبہ ہے چونکہ حضرت ابراہیمؑ ارضی کعبہ کے بانی تھے اس بنا پر انھیں بیت معمور میں جگہ دی گئی ہے جو آسمانی کعبہ ہے اور آسمان پر ٹھیک کعبہ کی سیدھ میں ہے۔

مساجد سے متعلق بعض احکام

۲۹- سورۂ جن میں مساجد کی نسبت اللہ کی طرف کی ہے اور ذات واحد کے سوا ان میں کسی دوسری ہستی کو پکارنے سے روکا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا ٥ وانہ لما قام عبد اللہ

یدعوہ کادوا یکونون علیہ لبدا ٥ (۱۸-۱۹)

اور یہ کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں۔ لہٰذا ان میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔

اس آیت کے شان نزول میں متعدد اقوال ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم لکھتے ہیں۔

برہان

ایڈیٹر
سعید احمد اکبرآبادی

معاون ایڈیٹر
عمید الرحمٰن عثمانی

سالانہ چندہ
چالیس روپے

قیمت فی پرچہ
تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۵ | رجب المرجب ۱۴۰۵ھ مطابق مارچ ۱۹۸۵ء | شمارہ ۳

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

محمد اظہر صدیقی

گذشتہ ماہ "نظرات" میں حضرت مدیر محترم نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ "مسلمانانِ ہند کو اپنا ایک کنونشن منعقد کرنا چاہیئے جس میں وہ ملک کے اندرونی اور بیرونی حالات کا معروضی نقطۂ نظر سے کھلے دماغ سے جائزہ لیں اور مستقبل کے لئے ایک واضح اور روشن پروگرام مرتب کریں"

ظاہر ہے کہ اس تجویز کی معقولیت و افادیت سے کسی ہوشمند مسلمان کو انکار نہیں ہوسکتا بلکہ اس قسم کا کنونشن اب سے کئی ماہ پہلے ہوتا تو اس سے زیادہ بہتر نتائج کی توقع کی جاسکتی تھی مگر افسوس ہے کہ مسلم جماعتوں اور ملی رہنماؤں نے بروقت اس کی طرف توجہ نہیں دی کہ کوئی مشترکہ اور متفقہ اقدام اور فیصلہ کر کے مسلمانوں کو نئے حالات میں رہنمائی دیتے تاکہ اس کی روشنی میں وہ کوئی راہ متعین کر سکتے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مسلم جماعتیں ملت کے اہم ترین مفادات کی خاطر بھی اپنے اختلافات اور جماعتی مفادات سے دست کش ہونے کو تیار نہیں ہوتیں حالانکہ گذشتہ سینتیس سال کے عرصہ میں ان کو بار بار یہ تجربہ و اندازہ ہو چکا ہے کہ آپس کے اختلافات کو ختم کئے بغیر وہ مسلمانوں کی کوئی ٹھوس، تعمیری اور مفید خدمت کر سکتی ہیں اور نہ ہی ملک میں مسلمانوں کو کوئی باعزت مقام دلا سکتی ہیں اور نہ ہی یہاں کے سماج کو اخلاق شرافت انسانیت و روحانیت کا وہ راستہ دکھا سکتی ہیں جس کے لئے خدا نے ان کو اس دنیا میں بھیجا ہے حالانکہ تجربہ و مشاہدہ اس کا گواہ ہے کہ جب جب

ملی رہنماؤں نے متحد اور مشترک انداز میں کوئی قدم اٹھایا ہے، کوئی فیصلہ کیا ہے اس کے بہتر سے بہتر نتائج ضرور ظاہر ہوئے ہیں۔

اس موقع پر مسلمانانِ ہند کے سب سے مخلص سب سے بے لوث اور دردمند رہنما حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کی یاد دل کے دروازہ پر دستک دیتی اور فکر و شعور کے دریچوں میں جھانکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کہ ایسے اہم موقعوں پر ان کی فعال، دردمند، صاحبِ بصیرت، ہوشمند اور تجربہ کار موثر و محترم شخصیت ہمیشہ آگے بڑھتی اور ایسے مشترک اجتماعات کا نظم کرتی ہوئی نظر آتی تھی اور ان کی آواز پر پورے ملک میں یہاں سے وہاں تک اور اِدھر سے اُدھر تک توجہ دی جاتی تھی اور وہ بڑے بڑے کام انجام پا جاتے تھے جو پوری پوری جماعتوں اور اداروں کے بس کا روگ نہیں۔

کیا شک ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے ظلمت و تاریکی بلکہ مایوسی کی گہری، مہیب اور سیاہ گھٹاؤں میں اپنے عزم و حوصلہ، اخلاص اور عزم کے چراغ روشن کر کے پوری ملت کو فکر و عمل کا راستہ دکھایا اور اپنی دانشمندانہ، بصیرت افروز اور تجربوں کی بھٹی سے کندن بن کر نکلی ہوئی شخصیت اور اخلاص بے کراں سے حالات کے تیکھے تیوروں اور ماحول کی گرمی و تلخی کے باوجود ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے سمجھنے کی سعی کی، ماضی کے تجربوں اور حال کے تقاضوں کو بھی سامنے رکھا اور اسی کے ساتھ ساتھ مستقبل کے ماتھے پر ابھرنے والی لکیروں کو بھی اپنی نگاہِ فہم و فراست سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اور نازک سے نازک مرحلہ اور خطرناک سے خطرناک موڑ پر بھی عقل کو جذبات پر غالب رکھ کر فیصلہ کیا۔ مورخ جب کبھی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۲ء تک کے حالات کا جائزہ لے گا اور دیکھے گا کہ اس عرصہ میں جن خوفناک، پریشان کن کھولتے ہوئے اور بھڑکتے ہوئے مسائل سے واسطہ پڑا اور ان میں حضرت

مفتی صاحبؒ جیسے دانشمند ارباب ہمت وعزم نے اپنے حوصلوں کو پست ہونے دیا نہ مایوسی کو مسلمانوں کے قلب وروح اور ذہن وشعور پر حاوی ہونے دیا تو وہ یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے گا کہ مسلمانانِ ہند کو ایسے نازک حالات سے بچا کر لے جانے والے رہنما تاریخ میں بے مثال مقام ومرتبہ کے مالک ہیں۔

بلاشبہ حضرت مفتی صاحبؒ کی گراں مایہ زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جب ملت اسلامیہ کے تعلیمی، اقتصادی، سماجی، اخلاقی اور معاشرتی مسئلوں کو حل کرنے کی فکر ولگن نہ رہی ہو۔ درد وسوز اور خلوص وہمدردی کے جن جذباتِ فراواں سے اللہ رب العٰلمین نے ان کو نوازا تھا، یہی جذبۂ پنہاں تھا جو ان کو ایک اندرونی لگن بن کر ہر وقت ملت کے مسئلوں کے حل کی تلاش میں سرگرداں رکھتا تھا۔

لگن جو چپکے چپکے روح کا دامن مسلتی ہے
لگن جو دھیرے دھیرے آگ بن کر دل میں جلتی ہے

آیئے سنجیدگی ومتانت کے ساتھ ہم حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے درد وسوز میں ڈوبے ہوئے الفاظ وخیالات سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کریں شاید اپنے اس انقلابی کروٹ لیتے ہوئے ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں ہمیں حضرت مفکر ملت کی دانشمندی، بصیرت، فکر وشعور اور تجربات کی روح اور ان کی حقیقی اسپرٹ سے کچھ رہنمائی مل سکے۔

"مسلمان مختلف ملتوں میں سے ایک ملت نہیں ہیں بلکہ خدا نے انھیں خیر امت کی حیثیت سے مبعوث کیا ہے، ان کا کام دنیا سے شر کو مٹانا اور خیر کو عام کرنا ہے، منکرات کا ازالہ اور معروفات کا قیام کمزوروں کی پشت پناہی اور مظلوموں کو ظلم سے بچانا ہے۔

اس لئے صرف اپنے دکھ درد کا علاج ہی تلاش کرنا نہیں ہے بلکہ دوسروں کا بھی مداوا بننا ہے۔ ملکی سماج کی اصلاح کرنا اور اخلاقی قیادت فراہم کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔“

”ہم تنگ دل نہیں، ہم عدم رواداری نہیں، ہم بے عقلی کا شکار نہیں، ہم میں فکر و عمل کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ ہمارا ماضی بھی گواہی دیتا ہے کہ ہم جہاں رہے ہیں وہاں ہم نے اپنی افادیت کو عام کیا ہے اور انسانی زندگی کے ہر گوشے کو بہاریں عطا کی ہیں، علوم، عقیدہ، لٹریچر، فنون، عوامی خدمت، فن تعمیر، تجارت، صنعت و حرفت، قانون، زراعت سب پر ہماری چھاپ ہے۔ یہ نقش ہم اب بھی ثبت کر سکتے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر مجھ سے کوئی دریافت کرے کہ اس چوتھائی صدی کا سب سے بڑا حادثہ کیا ہے جو اس ملت کو پیش آیا ہے تو میں یہی کہوں گا کہ وہ اس عرصے میں اپنے مسائل میں اتنی الجھا دی گئی ہے کہ ملک کی تعمیر اور سماج کی اصلاح میں وہ اپنے عزائم کو روبہ عمل نہیں لاسکی ہے۔ ملکی جماعتوں نے یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ ۱۶ کروڑ باصلاحیت انسان اگر اپنی توانائی کا بھرپور استعمال نہ کرسکیں تو جہاں اس سے مسلم معاشرے کو نقصان پہونچ رہا ہے وہیں پورے ملک اور سماج کی پس ماندگی بھی بڑھ رہی ہے۔“

(خطبۂ صدارت اجلاس آل انڈیا مجلس مشاورت ۱۹۷۸ء)

مسلم دانشوروں، مذہبی و سیاسی اور سماجی کارکنوں اور رہنماؤں کو خطاب کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحب پورے خلوص اور زور و اثر کے ساتھ برابر آگاہی

دیتے رہے ہیں کہ وہ اپنے سماج، اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کے مہلک و تباہ کن امراض کا خود ہی علاج سوچیں تاکہ ہمارا معاشرہ ایک ایسا صالح اور صاف ستھرا معاشرہ بن سکے جو دوسروں کو بھی اخلاق و شرافت اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے جوہروں سے مالا مال کر سکے۔ حسن اخلاق اور حسن معاملات جس طرح ہمارے خاندانوں، شہروں، بستیوں، محلوں اور گاؤں سے ختم ہوتے جا رہے ہیں اس پر بھی ہمیں پوری توانائی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے اور ان برائیوں کی اصلاح کی طرف پہلی فرصت میں توجہ کرنی چاہیئے۔

ہماری آرزو ہے کہ ملت کے درد مند اصحاب فکر و نظر اٹھیں اور متحد و متفق ہو کر تمام مسائل پر سوچ بچار کر کے تعمیری انداز میں مسلمانوں کے تعلیمی، اقتصادی، معاشرتی اور شہری مسائل کا مفید حل تلاش کریں اور ان میں (مسلمانوں میں) یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ اپنے مقام و منصب کو پہچان کر دین و دنیا اور انسانیت کی خدمت کی جو ذمہ داری حق تعالیٰ نے ان پر ڈالی ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کی مخلصانہ کوشش کریں۔

معاونین ادارہ کی خدمت میں

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی علیہ الرحمہ بانی ادارہ ندوۃ المصنفین کی وفات حسرت آیات کو دس ماہ گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں اس علمی ادارہ کو برادر عزیز عمید الرحمٰن عثمانی نے قائم رکھا اور اس کے

(باقی صدا۶ پر)

عہدِ سلطنت کے فقہی لٹریچر کا تنقیدی جائزہ

جناب ظفرالاسلام صاحب، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

فقہی مسائل سے سلاطین کی دلچسپی خواہ نظم ونسق میں شرعی قوانین سے واقفیت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو یا معاصر علماء و فقہاء کے اثرات سے۔ یہ بہر حال فقہی علوم کی نشرواشاعت کا ایک اہم ذریعہ بنی۔ سلاطین کی علم دوستی اور معارف پروری سے فیضیاب ہوکر علماء نے تالیفی وتصنیفی کارنامے انجام دیے اور اپنے ذہنی رجحانات کی رعایت سے اور مذہبی علوم وفنون میں فقہ کی مقبولیت کے پیش نظر اسی میدان میں خاص طور سے اپنی صلاحیتیں اجاگر کیں، دوسری جانب بعض سلاطین نے خود فقہی علوم کی ترویج وترقی میں براہ راست حصہ لیا اور اپنے زیر نگرانی فقہی کتابیں مرتب کرائیں جیساکہ آنے والی تفصیلات سے واضح ہوگا۔ فقہ کی عام مقبولیت اور فقہی علوم کی نشرواشاعت میں سلاطین وعلماء دونوں کی دلچسپی کے باعث عہد سلطنت میں فقہی تالیفات کا ایک ایسا معتدبہ سرمایہ اکٹھا ہوا جو آج بھی ہمارے لئے قابل قدر اور لائق توجہ ہے۔

ہندوستان میں فقہ کی کتابیں لکھنے کا سلسلہ فتوحات کے دور سے ہی شروع

ہوا جبکہ ابھی یہاں مسلم حکومت کا باقاعدہ قیام بھی عمل میں نہیں آیا تھا۔[1] لیکن فقہی علوم کی نشر و اشاعت کے اعتبار سے تغلق سلاطین بالخصوص اول تین کا عہد حکومت (۱۳۲۰-۱۳۸۸) سب سے زیادہ ممتاز و نمایاں ہے اسی لئے چودھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کو فقہ کے عروج کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں فقہ اور فقہی لٹریچر کے میدان میں جو سرگرمی دکھائی دیتی ہے اس کی نظیر کسی دوسرے عہد میں ملنی مشکل ہے۔ یہ وہ دور ہے جب دربار سے لے کر علمار کی ذاتی مجلسوں تک فقہ کا چرچا سنائی دیتا ہے اور علمار و فضلار سے قطع نظر سلاطین و امرار کے یہاں بھی اس کی مقبولیت کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق اور فیروز شاہ تغلق اپنے مذہبی رجحانات اور دینی میلانات کے لئے معروف ہیں۔ انھیں چھوڑ دیجئے محمد بن تغلق جو عام طور پر اپنی طبیعت کے تضاد، روایت سے انحراف، عقلیت پسندی اور علمار سے اختلاف کے لئے مشہور ہے، فقہ میں کافی شغف رکھتا تھا۔ اس کی بابت یہ شہادت ملتی ہے کہ ہدایہ اسے زبانی یاد تھی[2] اور یہ کہ روزانہ اس کے دسترخوان پر تقریباً دو سو فقہار موجود رہتے تھے[3] سفر و حضر دونوں حالت میں علمار سے مختلف مسائل پر اس کے تبادلۂ خیال

---

[1] اس دور میں مرتب کی جانے والی فقہ کی کتابوں میں "مجموع سلطانی" بھی شامل ہے، اسے بالعموم محمود غزنوی کے عہد سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض جدید اسکالرس نے اس خیال سے اختلاف ظاہر کیا ہے اور اسے بعد کے دور کی تالیف بتایا ہے، ملاحظہ کیجئے ایونو، ڈسکرپٹیو کیٹیلاگ آف پرشین مینوسکرپٹ ان دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۹۲۴ء، ص ۵۰۸ (ع ۱۰۴۶)

[2] مسالک الابصار، ص ۳۷۔

[3] صبح الاعشیٰ، ص ۹۶-۹۷۔

کا ذکر ملتا ہے[۱] اور ساتھ ہی تاریخی ماخذ سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس نے دربار میں چار مفتیوں کو مامور کیا تھا اور جرائم کے مقدمات کو فیصل کرتے وقت بالخصوص کسی کو سزائے موت دینے سے قبل ان کی رائے ضرور معلوم کرتا تھا۔[۲] مذہبی علوم و فنون خاص کر فقہ سے اس کی دلچسپی اس امر سے بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اس نے سمرقند کے مشہور عالم برہان الدین ساغرجی اور شیراز کے مایۂ ناز فقیہ قاضی مجد الدین کو ہندستان بلانے کے لئے اپنے مخصوص سفرار روانہ کیے تھے اور ان علمار کے اخراجات سفر کے لیے خطیر رقمیں بھی ارسال کیں۔[۳] مزید براں اس نے دوسرے ممالک سے فقہ کی نادر کتابیں منگوانے کے علاوہ اپنے عہد کے مشہور عالم معین الدین عمرانی کے ذریعہ قاضی عضد سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ "مواقف" نامی اپنی تالیف اس کے نام معنون کردیں۔[۴] سلطان نے فقہی علوم کی اشاعت کی جانب بھی توجہ مبذول کی، اس کے عہد میں مدارس کے نصاب میں فقہ کی تعلیم پر خاص زور دیا گیا جیسا کہ بعض عربی مورخین کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔[۵] معاصر

۱۔ صبح الاعشیٰ، ص ۹۵ ۲۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۹۷۔

۳۔ رحلہ ابن بطوطہ، ص ۴۴، مسالک الابصار، ص ۴۲-۴۳، برہان الدین کو لانے کے لئے شیخ ابوبکر بن خلال چالیس ہزار تنکوں کے ساتھ روانہ کیے گئے تھے اور قاضی مجد الدین کی خدمت میں شیخ زادہ دمشقی کو مع دس ہزار تنکہ بھیجا گیا تھا۔

۴۔ اخبار الاخیار، ص ۱۴۵، نیز دیکھئے رحلہ، محولہ بالا، ص ۴۴، حدائق الحنفیہ، ص ۳۰۴-۳۰۵، رحمان علی خاں، تذکرہ علماء ہند، نولکشور، ۱۹۱۴ء، ص ۲۲۸-۲۲۹۔

۵۔ بقول شہاب الدین العمری (مسالک الابصار، ص ۲۴) اور القلقشندی (صبح الاعشیٰ، ص ۶۹) محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی میں ہزار مدرسے تھے اور ایک کے علاوہ باقی تمام میں حنفی مسلک کے مطابق فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی، مدارس پر اس تبصرہ میں خصوصیت سے فقہ کا ذکر قابل غور ہے۔

ماخذ سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس نے مکاتب و مدارس میں درس و تدریس کے لیے ہزاروں فقہار مقرر کیے تھے جن کے اخراجات حکومت خود برداشت کرتی تھی۔[۱]

محمد بن تغلق کے عہد میں دینی و علمی حلقوں میں فقہ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ علمار کے ساتھ صوفیار کی اس فن سے دلچسپیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ محمد بن تغلق کے معاصر اور مشہور چشتی بزرگ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی فقہ میں اپنی مہارت کے سبب "ابو حنیفہ ثانی" کے لقب سے معروف تھے[۲] شیخ فخر الدین زرادی[۳] اور قاضی محی الدین کاشانی جو شیخ نظام الدین اولیاء کے خاص مریدین میں شامل تھے فقہ پر عبور رکھتے تھے[۴] اسی دور کے ایک دوسرے عالم اور بزرگ حسام الدین ملتانی کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں ہدایہ کی دونوں جلدیں زبانی یاد تھیں[۵] بعض صوفیار نے فقہ کے موضوعات پر اپنی تحریری کاوشیں بھی پیش کیں۔ شیخ نصیر الدین کے خلیفہ شیخ یوسف "تحفۃ النصائح" نامی ایک منظوم کتاب کے مصنف تھے جس میں عبادات اور فرائض وسنن کی تفصیلات کے علاوہ شریعت کے اور بہت سے احکام مذکور ہیں[۶] شیخ نصیر الدین کی صحبت سے

---

[۱] مسالک الابصار، ص ۳۹

[۲] خیر المجالس (ملفوظات شیخ نصیر الدین چراغ دہلی) مرتبہ حمید قلندر، تصحیح پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ، ص ۱۲، ۳۴۔

[۳] سید محمد بن مبارک کرمانی، سیر الاولیاء، لاہور، سنہ ۱۹۶۸ء، ص ۲۷۲-۲۷۶۔

[۴] اخبار الاخیار، ص ۹۸، فقیر محمد جہلمی، حدائق الحنفیہ، نولکشور، لکھنؤ سنہ ۱۹۰۶ء، ص ۲۷۶، سیر الاولیاء، ص ۳۰۴-۳۰۵۔

[۵] سیر الاولیاء، ص ۲۵۶۔

[۶] تذکرہ علمار ہند، محولہ بالا، ص ۲۵۶، حدائق الحنفیہ، ص ۲۹۴، فہرست مخطوطات شیرانی، لاہور، سنہ ۱۹۶۹ء، جلد دوم، ص ۲۷۵۔

فیض یافتہ ایک دوسرے عالم رکن الدین نے فقہی مسائل سے متعلق ایک طویل مثنوی تقریباً تیس ہزار اشعار پر مشتمل تحریر کی جو "طرفۃ الفقہاء" کے نام سے معروف ہوئی۔[۱] مزید براں سہروردی سلسلہ کے ایک صوفی شیخ فضل اللہ بن محمد بن نے (جو ماجو کے لقب سے مشہور تھے) "فتاوای صوفیہ" مرتب کیا گرچہ متعدد مسائل میں فقہاء کے عام مسلک سے اختلاف کی وجہ سے اسے تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔[۲]

فقہ سے دلچسپی اور فقہی علوم کی نشر و اشاعت کا جو ماحول محمد بن تغلق کے دور میں گرم ہوا تھا وہ ان کے جانشین فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں نہ صرف باقی رہا بلکہ مزید پروان چڑھا۔[۳] اس میں سلطان کے ذاتی رجحانات کو خاص دخل تھا۔ فیروز شاہ ایک مذہب پسند سلطان تھا اسے دینی امور میں دلچسپی اور مذہبی امور سے خاص رغبت تھی اور سیرت فیروز شاہی کے مطابق اسے فقہ پر "عبور تام" حاصل تھا۔[۴] سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں احکام شرعی کے نفاذ کا نہ صرف خواہشمند تھا بلکہ اس کے لیے اس نے سنجیدہ کوشش بھی کی جس کا کھلے لفظوں میں اعتراف معاصر

۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۲۸۸، فہرست مخطوطات شیرانی، جلد دوم، ص ۲۹۳-۲۹۴۔

۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۰۵-۳۰۶۔

۳۔ عہد فیروز شاہی میں فقہ کے عروج پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں فقہ اور تصوف کے درمیان جس کشمکش کا پہلا اظہار غیاث الدین تغلق کے عہد میں ہوا تھا وہ فقہ کی صورت میں اب ختم ہوتا نظر آرہا تھا (سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، محولہ بالا، ص ۳۸۹۔

۴۔ سیرت فیروز شاہی، قلمی نسخہ، مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن، فارسیہ اخبار، ۱۱۱، ص ۳۹۰-۳۹۱۔

مورخین کے یہاں ملتا ہے[1]۔ اسی کوشش کا ایک حصہ فقہی علوم کی نشر و اشاعت تھا، سلطان نے اس کی ترویج میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے علماء، بالخصوص ماہرینِ فقہ کی حوصلہ افزائی میں نہایت فیاضی و فراخ دلی سے کام لیا[2]۔ مذہبی علوم و فنون کی ترویج و ترقی کے لیے اس نے متعدد مدارس قائم کیے جن کے جملہ اخراجات کی تکمیل شاہی خزانے سے ہوتی تھی[3]۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں عہدِ فیروز شاہی کا امتیاز یہ ہے کہ فقہ کی قدیم کتابوں پر شروح و حواشی اور مختصر فقہی رسائل کے علاوہ فقہ کی چند مبسوط کتابوں کی تالیف اور فتاویٰ کے مجموعوں کی ترتیب بھی عمل میں آئی۔ سلطان نے خود اپنی نگرانی میں فتاویٰ کا ایک اہم مجموعہ مرتب کرایا جو فتاوای فیروز شاہی یا فقہ فیروز شاہی کے نام سے مشہور رہا۔ اس مجموعہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے دیگر فتاویٰ کے برخلاف باقاعدہ استفتاء و فتویٰ کے پیرایہ میں ہے اور اس کا بیشتر حصہ بالخصوص سوالات و جوابات فارسی میں ہے۔ یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ تغلق سلاطین کے زمانہ میں امراء یا اعیانِ سلطنت بھی فقہ میں دلچسپی رکھتے تھے جیسا کہ شہاب الدین العمری اور برنی دونوں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے[4]۔ فیروز شاہ کے عہد میں اس کا عملی ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ ان کے علم دوست وزیر تاتارخاں نے اپنے زیرِ اہتمام

---

[1] برنی، ص ۵۴۸-۵۵۲، ۵۶۱-۵۶۲، عفیف ص ۹۸، ۹۹، فتوحات فیروز شاہی، ص ۲، انشاء ماہرو، ص ۱۶۔

[2] برنی، ص ۵۵۹، عفیف، ص ۱۷۹۔

[3] سیرت فیروز شاہی، ص ۱۴۷، فتوحات فیروز شاہی، ص ۱۱-۱۲، طبقات اکبری، محولہ بالا، ص ۱۲۱۔

[4] مسالک الابصار، ص ۲۷، برنی، ص ۵۷۹۔

"فتاوی تاتارخانی" کے نام سے ایک ایسا مجموعہ تیار کرایا جو آج بھی قابل یادگار اور لائق استفادہ ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں یہ کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ پورے عہد سلطنت میں فیروزشاہ کا دور فقہی کارناموں کے لئے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل اور ممتاز ہے۔

فیروزشاہ کے بعد تقریباً ربع صدی تک دہلی سلطنت انتشار و افتراق کا شکار رہی علمی و تمدنی ترقی بھی اس سے متاثر ہوئی۔ سیاسی عدم استحکام کے اس عرصہ میں مذہبی علوم و فنون کے میدان میں کوئی ایسا کام انجام نہیں پایا جسے ذکر کیا جا سکے۔ اس کے بعد سید و لودی سلاطین کے عہد میں جسے دہلی سلطنت کا آخری حصہ کہا جا سکتا ہے علمی و فنی سرگرمیاں پھر شروع ہوئیں اور دیگر علوم کے ساتھ علم فقہ بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ لودی خاندان کے سلاطین میں سکندر لودی کے زمانہ میں اس طرح کی ترقیاں زیادہ نمایاں ہوئیں وہ علم کا دلدادہ اور علماء کا قدرداں تھا اور زیر بحث موضوع کے لحاظ سے سب سے اہم یہ کہ وہ فقہی مسائل سے دلچسپی رکھتا تھا اور اہم مسائل کی تحقیق کے لئے علمار کی مجلسیں بھی منعقد کراتا تھا اور ان کے بحث و مباحثہ سے مستفید ہونے کے لئے ان میں خود بھی شریک ہوتا تھا[1] یہ علمی ماحول خاص کر علم فقہ سے تعلق بعد کے دور میں بھی برقرار رہا۔ اس کا ایک بدیہی ثبوت سور خاندان کے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانہ میں "فتاوای ابراہیم شاہی" کی تالیف ہے جسے عہد سلطنت کی فقہی تالیفات میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

عہد سلطنت کے فقہی لٹریچر پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالنے سے چند اہم نتائج

---

[1] واقعات مشتاقی، ص ۴۹، تاریخ داؤدی، ص ۴۰، تاریخ شاہی ص ۴۶، زبدۃ التواریخ، ص ۷۲۔

برآمد ہوتے ہیں یہاں ان کی وضاحت افادیت سے خالی نہ ہوگی۔ اول یہ کہ فقہی دنیا میں اس وقت سب سے پسندیدہ طرزِ تالیف فتاویٰ کے مجموعے مرتب کرنا تھا۔ اس دور کی اہم فقہی تالیفات بالخصوص وہ جن کی ترتیب وتکمیل سلاطین و امراء کی زیرِ نگرانی عمل میں آئی یا ان کے نام منسوب ہیں۔ زیادہ تر فتاویٰ کے مجموعے ہیں مثلاً فتاوای غیاثیہ فتاوای فیروز شاہی، فتاوای تاتارخانی، فتاوای ابراہیم شاہی وغیرہ۔ فتاویٰ کی صورت میں فقہی مسائل کی تشریح وتوضیح یا احکام شرعی تبیین کا طریقہ عہد وسطیٰ میں ہندستان سے قبل دیگر مسلم ممالک میں بھی رائج رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی فقہی تالیف کے نام میں لفظ "فتاویٰ" کی شمولیت سے یہ عمومی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس میں سوال وجواب یا استفتاء وفتویٰ کے پیرایہ میں فقہی مسائل زیرِ بحث آئے ہوں گے اور ان میں معاصر علماء کے خیالات کی بھی ترجمانی کی گئی ہوگی لیکن اس دور میں مرتب کیے گئے فتاویٰ کے مجموعوں میں ایک دو کو چھوڑ کر باقی تمام متن کی صورت میں ملتے ہیں اور ان کا انداز بیان بھی فقہ کی متداول کتابوں جیسا ہے ان میں معاصر ماہرین فقہ کے بجائے فقہاء متقدمین کے نتائج فکر کو زیادہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عہد سلطنت کے فتاویٰ میں مجھے صرف فتاوای فیروز شاہی ایسا ملا پایا ہے جو استفتاء وفتویٰ کے پیرایہ میں مرتب کیا گیا ہے اور جس میں عصری مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے[۱]۔ عہد وسطیٰ کے فتاویٰ میں اگر فقہ کے معروف مسائل کی وضاحت کے ساتھ اس وقت کے سماج و معاشرت کو درپیش مخصوص مسائل پر علماء کے خیالات کو پیش کیا گیا ہوتا تو نہ صرف فقہی حیثیت سے ان تالیفات کی

---

[۱] اس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں راقم الحروف کا مضمون "فتاوای فیروز شاہی اور عصری مسائل" ماہنامہ برہان (دہلی) جلد ۹۱، شمارہ ۱ و ۲ (جولائی و اگست ۱۹۸۳ء)

اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوتا بلکہ عہدِ وسطیٰ کی معاشرتی تاریخ کے لئے بھی ایک گراں قدر سرمایہ ثابت ہوتا۔

عہدِ سلطنت کی فقہی کتابوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ وہ زیادہ تر عربی میں ہیں حتیٰ کہ وہ کتابیں جو کسی سلطان یا امیر کے ایما پر مرتب کی گئی تھیں اور جن کا مقصد وسیع پیمانہ پر (عوام سے لے کر اہلِ حکومت تک) اسلامی قوانین کی نشر و اشاعت تھا ان کی زبان بھی عموماً عربی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قاضی، مفتی، صدور، محتسب وغیرہ عربی زبان سے بہرور ہوتے تھے لیکن نظم و نسق کے دوسرے شعبوں سے جو لوگ منسلک تھے اور متوسط درجہ کے پڑھے لکھے لوگ عربی کی بہ نسبت فارسی سے زیادہ واقف ہوتے تھے اور یہ تو بہرحال مسلّم ہے کہ اس دور میں سرکاری سطح پر فارسی ہی کو مقبولیت حاصل تھی۔ ان سب کے باوجود فقہی موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے عربی کو ترجیح دینے کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ مذہبی علوم و فنون پر قلم اٹھانے والے (بالخصوص ابتدائی دور میں) زیادہ تر وہ علماء تھے جن کی اصل مشرقِ وسطیٰ سے تھی اور جن کی تعلیم و تربیت وہیں کے ماحول میں ہوئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ عام علمی و ادبی حلقوں میں فارسی زبان مروج تھی لیکن مذہبی علوم و فنون کی دنیا میں بہرحال عربی کو مقبولیت حاصل تھی اور دینی و مذہبی موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے علماء اسی کو پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے بعض اہلِ قلم کے سامنے یہ پہلو بھی رہا ہو کہ عربی کتابیں نہ صرف ہندستان بلکہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں بھی ان کے تعارف و شہرت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ بہرحال اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندستان میں اسلامی قوانین کی تشہیر اور فقہ اسلامی کی نشر و اشاعت کے لئے فارسی انتخاب زیادہ موثر و مفید ثابت ہوتا۔

اس دور کی فقہی تالیفات میں ایک اور امر مشترک یہ پایا جاتا ہے کہ وہ حنفی مسلک کی

ترجمانی پیش کرتی ہیں، گرچہ ان کتابوں میں اختلافی مسائل کے ضمن میں دیگر فقہی مذاہب کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی جاتی ہے لیکن آخر کار ترجیحی پہلو حنفی فقہاء کی رائے کو ہی حاصل ہوتا ہے ۔ مؤلفین یا مصنفین کی جانب سے حنفی مسلک کی ترجمانی اور اسے ترجیح دینے کی وجہ بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان ان ممالک میں شامل ہے جہاں فقہ حنفی کو رواج ملا اور اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔[۱] مسلم حکومت کے قیام کے بعد وسط ایشیاء (غزنین، غور، صنعان، کاشان، بلخ، تبریز، خوارزم وغیرہ) سے یہاں منتقل ہونے والے زیادہ تر حنفی تھے انھیں کے زیر اثر اس سرزمین میں فقہ حنفی کو پروان چڑھنے کا موقع ملا ۔ انھوں نے اپنی فقہی کتابوں میں اسی کو نمایاں کیا اور ان کے زیر تربیت جو ہندوستانی علماء و فضلاء تیار ہوئے وہ بھی فقہ حنفی کے ترجمان بن کر نکلے ۔ مزید براں وہ افراد جن کے ہاتھوں میں اس دور میں حکومت کی باگ ڈور رہی وہ بھی اصلاً ان علاقوں سے تعلق رکھتے تھے جو فقہ حنفی کے مراکز شمار کیے جاتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب حنفی مسلک کے پیرو تھے اور معاصر علماء فقہ حنفی سے ان کے تعلق کو مضبوط کرنے میں مزید ممد و معاون ثابت ہوئے ۔ سلاطین نے نہ صرف یہ کہ سرکاری طور پر اسے مقبولیت عطا کی بلکہ اس کی اشاعت میں بھی حصہ لیا ۔ یہاں اس جانب اشارہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فقہ حنفی کو مقبولیت و رواج دینے کے باوجود سلاطین دہلی اس کی اتباع میں متشدد نہیں تھے اور نہ ہی دوسرے مذاہب کے تئیں تنگ نظر

---

[۱] امیر خسرو مثنوی دولرانی خضر خاں، محولہ بالا، ص ۴۶-۴۷، برنی تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۹، مسالک الابصار، ص ۲۷، صبح الاعشیٰ، ص ۶۹، نیز دیکھئے سید عبدالحیٔ، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، اردو ترجمہ اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء، ص ۱۵۲-۱۵۴۔

واقع ہوئے تھے بلکہ اس ضمن میں ان کی وسیع المشربی کی نمایاں مثالیں ملتی ہیں۔ تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ ایسے علماء کو بھی شیخ الاسلام اور قاضی کے عہدہ پر مامور کیا گیا جو حنفی کے بجائے مالکی یا شافعی مسلک کے حامی و ترجمان تھے۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں اودھ کے شیخ الاسلام مولانا فرید الدین مقرر کئے گئے تھے جو ایک شافعی عالم تھے[1]۔ محمد بن تغلق نے مشہور سیاح ابن بطوطہ کو دار السلطنت کا قاضی بنایا تھا اور یہ بخوبی معلوم ہے کہ وہ مالکی تھے[2]۔ مزید براں اس کے شواہد بھی موجود ہیں کہ سلاطین بعض اوقات در پیش مسائل میں فیصلہ لیتے وقت سیاسی مصلحت یا کسی اور وجہ سے حنفی فقہاء کے بجائے دیگر مذاہب کے فقہاء کی رائے کو اختیار کرتے تھے۔ مثال کے طور پر فیروز شاہ تغلق نے برہمنوں پر جزیہ عاید کرتے وقت اس کی یکساں مقدار (فی نفر دس تنکہ) مقرر کی تھی[3] جبکہ حنفی مسلک کی رو سے ذمیوں کو امیر، متوسط اور غریب تین طبقوں میں تقسیم کر کے ان پر جزیہ کی مختلف مقدار متعین کی جاتی ہے۔ فیروز شاہ کا اقدام شافعی و مالکی فقہاء کے نقطۂ نظر کے مطابق تھا جو جزیہ کے نفاذ میں آمدنی کے اعتبار سے ذمیوں کی تقسیم ضروری نہیں تصور کرتے[4]۔

عہد سلطنت کے فقہی لٹریچر کے جائزے سے یہ تلخ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس کا بیشتر حصہ قدیم کتابوں کی شروح و حواشی پر مشتمل

---

[1] سیر الاولیاء، محولہ بالا، ص ۲۸۵۔

[2] رحلہ ابن بطوطہ، الجزء الثانی، ص ۸۱-۸۲۔

[3] عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۸۴۔

[4] الہدایہ، جلد ثانی (کتاب السیر، باب الجزیہ) ص ۵۷۰-۵۷۱، ابوالحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ۱۹۰۶ء، ص ۱۲۸۔

ہے[1]، ایسی کتابیں بہت کم ملتی ہیں جن میں عصری مسائل سے بحث کی گئی ہو یا ان میں اس دور کے مخصوص سیاسی و سماجی مسائل پر فقہی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ نظم و نسق اور معاشرت و معیشت سے متعلق متعدد مسائل اس وقت وضاحت طلب تھے لیکن اس دور کی کتابوں میں ان کی جھلک خال خال ہی نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ فتاویٰ کے مجموعے جو اصلاً اپنے عہد تالیف کے سماجی و معاشی حالات کے عکاس ہوتے ہیں ان میں بھی اس نوع کے مسائل سے بحث شاذ و نادر ہی ملتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا عام طور پر اس کی توجیہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ تقلیدی دور تھا، علماء و فقہاء کے ذہنوں پر فقہی جمود طاری تھا اور اسی کے اثرات ان کی تالیفات و تخلیقات میں نمایاں ہوتے۔ لیکن تاریخی حقائق کی روشنی میں اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اگر اس دور کے سیاسی و سماجی امور پر سلاطین و علماء کی باہمی مدنظر رکھی جائے بعض اہم و اختلافی مسائل کی تحقیق کے لئے اس دور میں منعقد ہونے والی متعدد مجالس مذاکرہ (محضر) کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور علماء کے اپنے حلقوں میں بحث و مباحثہ کے موضوعات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ عہد سلطنت میں فقہ اسلامی جمود و تعطل کا شکار تھا یا متحرک و اجتہادی نظریات کا حامل تھا۔ معاصر مورخین کی تفصیلات سے یہ ثابت ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ سلاطین نظم و نسق کے نئے مسائل کی بابت بھی علماء سے استفسار کرتے تھے اور علماء ان کی شرعی حیثیت واضح کرتے تھے۔

---

[1] فقہ کی بعض مشہور کتابوں (ہدایہ، شرح وقایہ، قدوری، کنز الدقائق وغیرہ) پر ایک دو نہیں درجنوں کی تعداد میں شروح و حواشی ملتے ہیں۔ اسی طرح فقہ کی معروف کتابوں (مثلاً مسلم الثبوت، حسامی، تلویح و توضیح) پر بھی کثرت سے شروح و حواشی اسی دور میں لکھے گئے)۔

ان میں سے بعض مسائل فقہی اعتبار سے کافی اہمیت کے حامل تھے مثلاً ہندوؤں کی شرعی حیثیت، سیاسی جرائم اور ان کی سزائیں، بیت المال میں سلطان اور اس کے اہل و عیال کے حقوق، رشوت خور اور بد دیانت افسران کے خلاف تادیبی کاروائی کی نوعیت، ہندوؤں کے بعض طبقوں پر (جو پہلے مستثنیٰ تھے) جزیہ عاید کرنے کے مسائل وغیرہ۔ اسی طرح علمار کے مابین نئے حالات میں جو فقہی مسائل زیر بحث آتے تھے ان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً سرکاری طور پر اشیار کی قیمت کی تحدید، ریاست کے معروف وسائل کے علاوہ نئے محاصل کا نفاذ، تجارتی و غیر تجارتی مقاصد کے لیے ہنڈی کا استعمال، آراضی ہند کی شرعی حیثیت، ہندوؤں سے تعلقات کی نوعیت وغیرہ۔ مذکورہ بالا اور اس نوع کے دیگر مسائل میں معاصر علمار کے غور و خوض اور ان کے نتائج فکر کی روشنی میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی فقہ تقلیدی فقہ تھی اور عصری مسائل اور نئے حالات سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ بہر حال اس حقیقت کا اعتراف یہاں ضروری ہے کہ اس طرح کے مسائل پر بحث فقہی کتابوں کی بہ نسبت تاریخی تذکروں اور انشار و خطوط کے مجموعوں میں زیادہ ملتی ہے۔ بظاہر یہ متضاد معلوم ہوتا ہے کہ وہ علمار جو نئے مسائل کے تئیں حساس تھے اور مجتہدانہ فکر کے حامل تھے، اجب انھوں نے فقہ کے میدان میں قلم کو حرکت دی تو وہ اپنے خیالات کی جدت اور اجتہادی فکر کی جلوہ نمائی نہ کر سکے اور نہ ہی وہ اپنی تالیفات کو عصری مسائل کا عکاس بنا سکے۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنی تحریری صلاحیتوں کو زیادہ تر قدیم کتابوں پر شروح و حواشی لکھنے یا ان کا خلاصہ بیان کرنے میں صرف کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے علمار نے فقہی تصنیف و تالیف کے ضمن میں روایتی طرز کو ہی پسند کیا اور احکام شرعی کی وضاحت اور فقہ اسلامی کی اشاعت کے لیے بہتر یہی سمجھا کہ فقہ کی معروف کتابوں کی تشریح و توضیح کی جائے اور متون قدیمہ کا خلاصہ پیش کیا جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس

دور کا جملہ فقہی سرمایہ اسی قبیل کا تھا۔ اسی ماحول میں جہاں شروح و حواشی لکھنے کا عام رواج تھا اور قدیم طرز پر کتابیں لکھنا پسند کیا جاتا تھا۔ فقہ کی بعض ایسی اہم تالیفات ملتی ہیں جن میں معروف مسائل کی وضاحت کے ساتھ بہت سے عصری مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس نوع کی تالیفات میں جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا گیا فتاوای فیروز شاہی کو اولین مقام حاصل ہے۔

مختصر یہ کہ عہد سلطنت کی فقہ کو جمود سے تعبیر کرنا ایک روایتی انداز بیان ہے جو اس دور کے فقہی کارناموں اور علمار و فقہار کے افکار و خیالات کے گہرے مطالعہ پر مبنی نہیں ہے۔ اس زمانہ کے فقہی لٹریچر کا تنقیدی جائزہ اور معاصر علمار کی علمی و فکری سرگرمیوں کا تجزیاتی مطالعہ عہد وسطی کے فقہ کی نوعیت متعین کرنے اور اس وقت کے ہندوستان میں علمار کی فکری ارتقار کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ یہ مضمون پیش نظر مطالعہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس کی آئندہ قسطوں میں انشار اللہ پہلے ان کتابوں کا اجمالی تعارف پیش کیا جائے گا جو عہد سلطنت میں سلاطین و امرار کی ایمار پر یا انفرادی کوشش کے نتیجہ میں فقہ کے موضوع پر مرتب کی گئیں اور پھر کچھ اہم فقہی تالیفات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا خاص طور سے اس نقطۂ نظر سے کہ وہ کہاں تک اپنے دور کے سیاسی، سماجی و معاشی مسائل کی عکاس ہیں اور یہ کہ ان میں کس انداز میں ان مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

وماتوفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اعلان

حضرت مفتی صاحبؒ کے سلسلے میں جو خاص نمبر شائع ہونے جارہا ہے اس کی تاخیر کی اصل وجہ حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب ایڈیٹر رسالہ برہان کی طویل علالت ہے۔ آپ سے ان کی صحت کلی کے لیے دعا کی استدعا کرتا ہوں اور انشاء اللہ تعالیٰ میری یہ کوشش رہے گی کہ یہ شاندار معیاری نمبر حضرت مفتی صاحبؒ کے شایان شان بہت جلد شائع ہو اور حضرت مفتی صاحبؒ کے نام سے ایک اکیڈمی قائم کی جائے اور ان کی میموریل سوسائٹی یقیناً بنی چاہیے اور مفتی عتیق الرحمن روڈ جامع مسجد کے علاقے میں قائم کیا جائے۔

اس لیے دہلی اور باہر کے حضرات، حضرت مفتی صاحبؒ کے معتقدین اور محسنین سے اپیل کرتا ہوں کہ اس معاملے میں پوری دلچسپی لیں۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ شکریہ!

جن حضرات نے اب تک مضامین نہیں بھیجے ان سے درخواست ہے کہ پہلی فرصت میں مضمون روانہ فرمائیں۔

خادم

عمید الرحمن عثمانی

مینجر رسالہ برہان دہلی

جوی مولیاں اور قصیدۂ رودکی

ڈاکٹر محمد امیر الدین صدیقی لکچرر اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

نظامی عروضی سمرقندی کے چہار مقالہ[1] میں ایک حکایت نصر ابن احمد سامانی[2] (۳۰۱۔ ۳۳۱ھ) کی بابت ہے۔ اس کا خلاصہ[3] یہ ہے کہ ایک بار امیر نصر چار سال تک متواتر بارغیس[4] (ہرات) میں مقیم رہا۔ اس کے لشکری پریشان ہو گئے اور اپنے وطن اور خاندان سے اتنے طویل عرصے کی جدائی ان کے لیے بڑی شاق گزر رہی تھی، مگر

---

[1] چہار مقالہ تصنیف ۵۵۱ھ۔

[2] نصر ابن احمد سامانی دور کا تیسرا جلیل القدر فرمانروا تھا، اس کے دور کے دو وزراء ایرانی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں ایک ابو عبد اللہ محمد بن نصر جیہانی اور دوسرا ابو الفضل بلعمی۔

[3] یہ چہار مقالہ کے مقالہ دوم کی دوسری حکایت ہے، دیکھئے چہار مقالہ طبع محمد معین ص ۴۹ تا ۵۴۔

[4] بارغیس ہرات کی ایک ولایت ہے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں بارغیس کی بجائے بازغیس لکھا ہے اور کہا ہے کہ اصل فارسی میں بارخیز تھا۔

مجبور تھے۔ امیر وطن واپس ہونے پر کسی طرح راضی نہ تھا۔ اس کے معزز ندیموں میں رودکی تھا۔ لوگ اس کے پاس التجا لے کے پہنچے اور اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ امیر کو وطن لوٹنے پر راضی کر دے۔ رودکی تیار ہو گیا اور ایک قصیدہ لکھ کر امیر کے پاس پہنچا اور پردۂ عشاق میں اس قصیدے کو الاپنا شروع کیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے اشعار کا اثر اتنا ہوا کہ امیر بغیر جوتا پہنے گھوڑے پر سوار ہوا اور بخارا کی طرف روانہ ہو گیا قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

بوی جوی مولیاں آید ہمی
بوی یار مہرباں آید ہمی

اور حسب ذیل پانچ شعر چہار مقالہ میں منقول ہیں:

ریگ آموی و درشتی راہ او
زیر پایم پرنیاں آید ہمی
آب جیحوں از نشاط روی دوست
خنگ مارا تا میاں آید ہمی
ای بخارا! شاد باش و دیرزی
میرزی تو شادماں آید ہمی
میر ماہست و بخارا آسماں
ماہ سوی آسماں آید ہمی
میر سرواست و بخارا بوستاں
سرو سوی بوستاں آید ہمی[1]

---

[1] چہار مقالہ طبع محمد معین ص ۵۲ تا ۵۳۔

یہی واقعہ منہاج سراج کی "طبقاتِ[1] ناصری" میں سلطان سنجر اور امیر معزی کی طرف منسوب ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ غزنویوں کی شکست کے بعد عراق اور آذربایجان دوبارہ سنجر کے قبضہ میں آئے اور سنجر پھر خراسان آیا۔ اس کی عادت تھی کہ گرمیوں میں بخارا رہتا اور سردیوں میں مرو شاہجان میں۔ ایک سال ایسا اتفاق ہوا کہ مرو میں اس کا قیام بہت زیادہ ہوگیا اور گرمی بڑھ رہی تھی اور مقربین میں سے کسی شخص کو جرأت نہ ہوئی کہ سلطان سے واپسی کی التجا کرتا اور سارے رفقاء بخارا واپس جانے کی آرزو رکھتے تھے۔ سب امیر معزی کی خدمت میں پہنچے اور اس سے درخواست کی کہ شہر بخارا کے محلوں اور باغوں کی تعریف سلطان کے کانوں تک پہنچائیے۔ امیر معزی نے حسب ذیل قطعہ کہا اور صبح جب سلطان صبوحی (صبح کی شراب) کے بعد محفل آراستہ کئے ہوئے تھا تو کمال[2] الزماں نے اس کو اپنے انداز میں ایسا پیش کیا کہ سلطان بغیر جوتا پہنے سوار ہوکر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا اور بخارا پہنچ ہی کر دم لیا۔ اس کے بعد وہی چھ شعر ادنیٰ تغیر کے ساتھ درج ہیں جو چہار مقالہ میں آئے ہیں۔

---

[1] طبقات طبع کابل ج ۱ ص ۲۵۹-۶۰۔

[2] کمال الزماں عہد سنجر کا مشہور موسیقی داں تھا انوری اس کا معاصر تھا اور اس نے اس کی مدح میں یہ اشعار لکھے ہیں:

ہرگز گماں مبر کہ کمال الزماں بمرد	کو روح محض بود بہ جسم فنا پذیر
میداں کہ ساکنانِ فلک سیر گشتہ اند	از مطربی زہرہ بریں چرخ گندہ پیر
خواہش گراں بہ نزد کمال الزماں شدند	کو بود در زمانہ دریں علم بی نظیر
گفتند زہرہ راز فلک دور کردہ ایم	ای رشک جان زہرہ ساعای ادیگر

رک: تعلیقات طبقات ناصری بقلم عبدالحی حبیبی ص ۳۳۰

لیکن اکثر تاریخوں میں یہ واقعہ نصر بن احمد اور رودکی کی طرف منسوب ہے۔ اس سلسلے میں حمد اللہ مستوفی صاحب تاریخ گزیدہ اور خوندمیر صاحب حبیب السیر قابلِ ذکر[1] ہیں۔ جامی نے بہارستان[2] میں اس حکایت کا ذکر کیا ہے اور اس اضافہ کے ساتھ بعض تاریخوں میں یہ حکایت سلطان سنجر اور امیر معزّی کی طرف منسوب ہے۔

ڈاکٹر محمد معین نے تعلیقات[3] چہار مقالہ میں سنجر کی طرف اس حکایت کو غلط قرار دیا ہے اور عبدالحی حبیبی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ ان کے دلائل یہ ہیں:

- چہار مقالہ طبقاتِ ناصری سے ایک صدی مقدم ہے۔ اس بنا پر اس کا قول قابلِ ترجیح ہے۔
- نظامی عروضی سلطان سنجر اور معزّی کا معاصر تھا۔ اگر یہ واقعہ ان سے متعلق ہوتا تو اس کے علم میں ضرور ہوتا۔ وہ خواہ مخواہ دو صدی پہلے کیوں مقدم کر دیتا۔
- مورخوں اور تذکرہ[4] نویسوں کی کثیر تعداد نے اس کو رودکی کے نام سے لکھا ہے۔
- معزّی کے دیوان میں یہ قصیدہ شامل نہیں۔
- سنجر کا دار الخلافہ مرو تھا نہ کہ بخارا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منہاج سراج کو اس بنا پر تشابہ ہوا کہ معزّی نے اس بحر میں رودکی کے جواب میں ایک قصیدہ لکھا تھا چنانچہ اس کا ذکر خود نظامی عروضی

---

[1] اس سلسلے میں دیکھئے چہار مقالہ تعلیقات ڈاکٹر معین ص ۱۵۹۔

[2] بہارستان طبع نول کشور ص ۸۶ - ۸۷۔

[3] ص ۱۶۰ تا ۱۶۲۔

[4] مثلاً دیکھئے طبقات ناصری تعلیقات حبیبی ج ۲ ص ۳۲۹۔

نے کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ فارسی کے لطیف گو اور شیریں سخن شعرار میں ایک امیرالشعر
معزی تھا۔ زین الملک ابوسعد ہندو[1] بن محمد بن ہندو الاصفہانی نے اس سے درخواست
کی کہ رودکی کے قصیدے کا جواب لکھے اس نے عذر کیا۔ زین الملک نے اصرار کیا۔ اس
چند ابیات لکھے۔ ان میں سے ایک بیت یہ ہے :

رستم از ما زندراں آید ہمی
زین ملک از اصفہاں آید ہمی[2]

عروضی مزید لکھتا ہے کہ ارباب سخن آسانی سے فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ان دونوں
اشعار میں کتنا تفاوت ہے۔

رودکی کے مطلع میں جوی مولیان کا ذکر آیا ہے۔ یہ بخارا میں ایک مقام تھا
باغ اور سبزہ زار کے لیے بہت مشہور تھا۔ اس کا ذکر تاریخوں میں اکثر آیا ہے
چنانچہ ابوبکر محمد بن جعفر نوشخی نے یہ لکھا ہے کہ دراصل اس کا نام جوی موالیان تھا
جو کثرتِ استعمال سے "جوی مولیاں" ہوگیا۔ وہ حسبِ ذیل عنوان کے تحت لکھتا
ہے :

ذکر جوی مولیاں اور اس کی صفت

قدیم میں جوی مولیاں کے سبزہ زار ملک طغشادہ کی مِلک تھی اور اس
اپنے بیٹوں اور دامادوں کو ایک ایک حصہ دے دیا تھا۔ امیر اسمٰعیل سامانی
رحمۃ اللہ علیہ نے اس سبزہ زار کو حسن بن محمد بن طالوت سے جو مستعین بن معتصم

---

[1] وہ سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی کے دیوان کا مستوفی تھا۔ دیکھئے تعلیقات
چہار مقالہ ص ۱۵۶۔

[2] چہار مقالہ طبع محمد معین ص ۵۴۔

مرہنگ تھا خرید لیا اور وہاں محل بنوائے اور باغات لگائے اور بیشتر حصہ موالیان[1]
وقف کر دیا اور اب بھی وہ وقف باقی ہے اور وہ ہمیشہ اپنے موالیوں کی وجہ سے
ں سے بہت لگاؤ رکھتا تھا۔ ایک روز وہ قلعہ میں بیٹھا بخارا کی طرف نگاہ کر کے
وی مولیاں کا نظارہ کر رہا تھا اور سیماء الکبیر جو اس کے باپ کا مولا تھا اس کے
امنے تھا۔ امیر اس کو بہت چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے فرمایا کہ کاش ایسا ہوتا
خدای تعالیٰ کوئی صورت کرتا کہ میں یہ سبزہ زار تمھارے لیے خرید لیتا اور مجھ کو
ندہ رکھتا کہ میں دیکھتا کہ سبزہ زار کے تم مالک ہو گئے اس لیے کہ یہ سبزہ زار
ارا کے تمام سبزہ زاروں سے زیادہ قیمتی، زیادہ اچھا اور آب وہوا کے اعتبار
ے زیادہ دلکش ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس نے سب خرید لیا اور اپنے
لاموں پر تقسیم کر دیا۔ اسی وجہ سے اس کا نام "جوی موالیان" پڑا جو بعد میں عام
گوں میں "جوی مولیان" کہلایا۔

بعض لوگوں نے جوی مولیان سے دھوکا کھایا ہے اور اس کو وہ محض ایک نہر سمجھ بیٹھے
یں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ پروفیسر آرمینیس ویمبرے پروفیسر بڈ تھ یونیورسٹی کا
م قابلِ ذکر ہے جس کی کتاب تاریخ بخارا کے اردو ترجمہ کے صفحہ ۸۶ پر (حاشیہ نمبر ایک)
باتیں درج ہیں۔

سامانیوں کے زمانہ میں اس شہر میں گیارہ بڑی بڑی نہریں تھیں جن کے نام حسب ذیل
یں (۱) جوئے مولیاں۔ بخارا کے بہترین حصہ سے گزرتی تھی۔ اس کے کناروں پر

---

[1] موالیان جمع (فارسی) ہے موالی کی، اور موالی جمع (عربی) ہے، مولی کی جو معنی کے لحاظ سے
اجتماع ضدین ہے، یعنی اس کے معنی آقا و خداوند کے ساتھ بندہ اور غلام کے بھی ہیں۔
دیکھیے فرہنگ معین ج ۴ ص ۴۴۲۰۔

عالیشان محلات اور خوبصورت باغات تھے۔ شہر کے اس حصہ کو مولیان کہتے تھے کیونکہ یہ جگہ طاؤں کے نام وقف کر دی تھی۔"

یہ بیان تمام تر ناقص ہے اس لیے کہ تاریخوں میں اس کا ذکر جوی مولیان کے نام سے آیا ہے اور واضحاً یہ ایک مقام کا نام ہے۔ چنانچہ "تاریخ بخارا"[1] تالیف ابوبکر نرشخی میں کئی بار اس کا ذکر موجود ہے۔ اسی طرح "زین الاخبار" گردیزی میں بھی آیا ہے کہ جب ایلک اسپیجاب آیا تو ابوعلی نے ایلک کے نام خط لکھا۔۔۔۔۔ ایلک بخارا آیا اور جوی مولیان میں اترا ربیع الاول کا مہینہ اور سنہ ۳۸۲ھ تاریخ تھی۔ چہار مقالہ میں ایک حکایت کے ذیل میں جوی مولیان کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ اس کا کوئی خطہ ہونا واضح ہے، نہ کہ نہر، اور خود ذیل کے مصرع سے بھی اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے:

بوی جوی مولیاں آید ہمی

ایک دوسری قرات "باد جوی مولیاں آید ہمی" کی بھی ہے۔ باد ہو یا بو ہو اس کی نسبت نہر کی طرف نہیں ہوسکتی۔ جوی مولیاں جو اپنے باغات اور سبزہ زار کے لئے ضرب المثل تھا اس کی طرف باد و بو منسوب ہوسکتی ہے۔

رودکی کا قصیدہ بہت مشہور اور مقبول ہوا چنانچہ بعض فارسی شاعروں نے اس کے تتبع[2] میں نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں سے سب سے مشہور نظم مولانا روم کی ہے اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اس نظم کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

---

[1] دیکھئے تاریخ بخارا طبع مدرس رضوی تہران ۱۳۱۷ ص ۳۳ ببعد

[2] دیکھئے تعلیقات چہار مقالہ از ڈاکٹر محمد معین ص ۱۵۷ تا ۱۶۰

بوی باغ و گلستاں آید ہمی
"بوی یارِ مہرباں آید ہمی"
از نثارِ گوہر یارم مرا
آب دریا "تا میاں آید ہمی"
با خیال گلستانش، خار زار
نرم تر از پرنیاں آید ہمی
از در و دیوار ہای کوی دوست
عاشقاں را بوی جاں آید ہمی
ہر کہ میرد پیش روی نقشِ دوست
نا بمردہ در جناں آید ہمی
نوز رویاں سوی زشتاں کی روند؟
بلبل اندر گلستاں آید ہمی

ہندوستان کی نسبت سے یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے بھی ایک قطعہ اس زمین میں لکھا ہے[1]:

ہمچناں با شیم گرم گفتگو
قاصد از در ناگہاں آید ہمی
انگند شور مبارکباد و پس
ایں حدیثش بر زباں آید ہمی
آسماں جاہ از سوی ملک دکن
جانبِ ہندوستاں آید ہمی

---

[1] شعر العجم حصہ اول ص ۲۸۔

رودکی کے اس قصیدے کی شہرت ہی تھی کہ اس کی صدائے بازگشت حافظ کی ایک غزل میں اس طرح ملتی ہے :

خیز تا خاطر بآں ترک سمرقندی دہیم
کز نسیمش بوی جوی مولیاں آید ہمی[۱]

امید ہے کہ اس گذارش سے جوی مولیاں اور اس کی اصل حقیقت اور قصیدۂ رودکی کے بارے میں صحیح اطلاع حاصل ہو سکے گی۔

---

[۱] دیوان حافظ چاپ نذیر احمد و نائینی

دعائے صحت

آج کل حضرت قبلہ مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ بہت کافی علیل ہیں۔ ان کی علالت تو حضرت قبلہ مفتی صاحبؒ کی زندگی کے دوران ہو چکی تھی۔ لیکن حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد معذوری اضطراب اور دماغی حالت زیادہ پریشان کن ہوتی جا رہی ہے

قارئین اور اپنے بزرگوں سے اپنی والدۂ محترمہ کی صحت یابی اور سکون کے لیے دعا کی درخواست کرتا ہوں۔

خادم
صاحبزادہ حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ
عمید الرحمن عثمانی

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

فن اور شخصیت

پروفیسر محمد اسلم، شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۸ دسمبر ۱۹۸۴ء کو رات کے آٹھ بجے پاک وہند کے نامور مورخ اور اسلامی فنِ تعمیر کے ماہر ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ۸۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

ان کی وفات سے چند ماہ قبل علی گڑھ سے ڈاکٹر مختار الدین احمد لاہور تشریف لائے تو ان کی خواہش پر میں انھیں چغتائی صاحب کے ہاں لے گیا۔ ان کے ایک فرزند ہمیں چغتائی صاحب کے کمرے میں لے گئے۔ مرحوم اس وقت پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور ان کا حافظہ جواب دے چکا تھا۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے کئی واقعات دہرائے، لیکن چغتائی مرحوم ہر بات پر یہی کہتے رہے کہ انھیں اب کچھ یاد نہیں رہا۔ ہم تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر چلے آئے۔ یہ مرحوم سے میری آخری ملاقات تھی۔

یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے تاریخ کا طالب علم تھا۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے تلمیذ الرشید ڈاکٹر حمید الدین مرحوم ہمیں تاریخ پڑھانے پر مامور تھے۔ انھوں نے مغلوں کے فن تعمیر پر خود لیکچر دینے

کی بجائے یہ کام چغتائی صاحب کو سونپا۔ یوں ان سے میرا تعارف ہوا۔ ۱۹۵۵ء سے پروفیسر محمد شجاع الدین مرحوم نے دیال سنگھ کالج لاہور میں ہر سال ہسٹری کانفرنس اور تاریخی نوادرات کی نمائش منعقد کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چغتائی صاحب کو اس تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا جاتا اور مرحوم بڑے ذوق وشوق سے اس تقریب میں شرکت کرتے اور تحقیقی مقالہ بھی پیش کرتے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی محلہ چابک سواراں لاہور کے رہنے والے تھے۔ یہ محلہ پرانے شہر کے عین وسط میں علامی سعد اللہ کے فرزند میاں خان کی حویلی سے متصل واقع ہے۔ ان کے بزرگوں کا پیشہ معماری تھا اور اس فن میں انھوں نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ چغتائی صاحب کے جدِ امجد میاں صلاح معمار (م ۱۸۵۸ء) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے افسرِ تعمیرات تھے اور ان کی نگرانی میں کئی عمارات تعمیر ہوئی تھیں۔ خود چغتائی صاحب کے والد بزرگوار کریم بخش کو بھی اس فن سے بڑی مناسبت تھی اور انھوں نے اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی انھی کے نام معنون کیا تھا۔ ہم بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ چغتائی مرحوم کو فنِ تعمیر کے ساتھ دلچسپی اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی۔

موصوف فن تعمیر کی پرانی روایتوں کے امین اور قدردان تھے۔ جب لاہور کی مشہور شاہراہ مال روڈ پر مسجد شہداء تعمیر ہوئی تو انھوں نے مسجد بنانے والوں کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ چغتائی صاحب کا یہ موقف تھا کہ مسجد کی تعمیر میں ہماری روایات سے انحراف کیا گیا ہے اور اس کا منار کسی گرجے کا مُسلہ (SPIRE) معلوم ہوتا ہے۔ اس مقدمے کا اخبارات میں خوب چرچا ہوا اور مرحوم مسجد کے منار میں تبدیلی کروانے میں کامیاب ہو گئے۔

میں کبھی کبھی ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر چلا جاتا تھا۔ ان کی لائبریری میں حوالے کی تمام کتابیں موجود تھیں۔ وہ صبح نو بجے مطالعہ کی میز پر بیٹھتے اور

دوپہر کے کھانے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ظہر کے بعد دوبارہ مطالعہ شروع کر دیتے۔ یہ سلسلہ پانچ بجے تک جاری رہتا۔ اس کے بعد مرحوم ٹہلنے کے لئے گھر سے نکلتے اور مغرب کی نماز مسجد میں ادا کر کے گھر لوٹتے۔ بڑھاپے اور ضعف کے باوجود وہ دفتری اوقات میں مطالعہ ضرور کرتے تھے۔

چغتائی صاحب کے دار المطالعہ میں فرش سے لے کر چھت تک ریک بنے ہوئے تھے جو کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں بانس کی ایک سیڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ جس طرح جوتوں کی دکان پر سیلز مین سیڑھی لگا کر جوتوں کا ڈبہ اتار لاتا ہے اسی طرح چغتائی صاحب کتاب اتار لاتے تھے۔ ان کے پاس سلائڈز کا ایک قیمتی ذخیرہ تھا جو اسلامی فنِ تعمیر کے شہ پاروں پر مشتمل تھا۔

چغتائی صاحب کو کتبوں کے چربے اتارنے میں بڑی مہارت تھی۔ ایک بار انھوں نے ان چربوں کی نمائش بھی کی تھی۔ انھوں نے راجستھان کی تاریخی بستی "کھاٹو" کے بارے میں اپنے ایک تحقیقی مقالے میں ایسے کئی کتبوں کا عکس شائع کیا ہے جو اب کھاٹو میں موجود نہیں ہیں۔

چغتائی مرحوم کی تحریروں میں مجھے "کھاٹو" پر ان کا مقالہ بیحد پسند ہے۔ یہ مقالہ سہ ماہی اردو کراچی میں چھپا تھا اور میں متعدد بار اس کا مطالعہ کر چکا ہوں اور ہمیشہ لطف اندوز ہوا ہوں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان کے انتقال کی شب میں یہی مضمون پڑھ کر سویا اور صبح ان کی سناؤنی آگئی۔

میں نے ان سے بھی کئی بار اس مضمون کا ذکر کیا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ایک بار میرے استفسار پر انھوں نے فرمایا کہ انھیں اپنی تحریروں میں "ناگور" کے بارے میں اپنا مضمون بہت پسند ہے۔ یہ مضمون دکن کالج پونا کے مجلہ میں شائع ہوا تھا۔

میں نے ایک بار ان سے دریافت کیا کہ ان کی زندگی کا بہترین وقت کہاں گذرا ہے؟ چغتائی مرحوم نے جواب دیا کہ دکن کالج پونا میں گذرا ہوا وقت انھیں یاد آتا ہے تو وہ آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے پونا میں قیام کے دوران میں لکھنے پڑھنے کا بڑا کام کیا اور اسے وہ اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے گجرات کاٹھیاواڑ کے دورے کئے اور پروفیسر محمد ابراہیم ڈار اور سید ابوظفر ندوی سے مل کر گجرات کے فنِ تعمیر کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں اور انھیں کتابی شکل میں شائع کیا۔ ڈار صاحب کے وہ بڑے مدّاح تھے اور ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے کچھ عرصہ اورنگ آباد میں انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر میں مولوی عبدالحق کے ساتھ گذارا تھا۔ اس زمانے کی یادداشتیں انھوں نے محفوظ کر لی تھیں جو مولوی صاحب کے خطوط کے ساتھ اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوئیں اور علمی حلقوں میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی گئیں۔ مولوی صاحب ان کے ساتھ بڑے بے تکلف تھے اور ہلکی پھلکی گالی بھی دے دیتے تھے۔ ان کے نام ایک خط میں مولوی صاحب بڑے خوشگوار موڈ میں لکھتے ہیں:

چھوٹے بڑے نئے پرانے عالم جاہل ہر قسم کے چغتائی کو سلام

چغتائی صاحب کے علامہ اقبال، حافظ محمود شیرانی، ان کے فرزند اختر شیرانی، جسے وہ ہمیشہ داؤد کے نام سے یاد کیا کرتے تھے، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، مولانا انور شاہ کشمیری، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولوی محمد شفیع اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے نابغۂ روزگار بزرگوں کے ساتھ بڑے اچھے مراسم تھے۔ علامہ اقبال کی مجلس میں انھیں "ماسٹر جی" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ ڈاکٹریٹ کرنے سے پہلے موصوف لدھیانہ کے کسی سکول میں ماسٹر تھے۔ چغتائی صاحب جتنی دیر اقبال کی مجلس

میں بیٹھتے ہنسنے ہنسانے کا سلسلہ جاری رہتا۔

انھوں نے علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی کے بارے میں اپنی یادداشتیں محفوظ کرلی تھیں جنھیں انھوں نے مختلف مجلّوں میں چھپوا دیا تھا۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ اپنے مراسم کا ذکر انھوں نے ایک کتابچے میں کیا ہے جو دیوبند کے جشن صد سالہ کے موقع پر انھوں نے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی محفل میں میں نے انھیں کئی بار دیکھا ہے۔ ان کے تعلقات کا سلسلہ ساٹھ پینسٹھ سال پر پھیلا ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو پہلی بار جب میں نے دیکھا تو وہ براؤن رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ اس زمانے میں وہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ سیاہ رنگ کے سوٹ میں بھی نظر آجاتے تھے۔ وفات سے چند سال قبل انھوں نے ترکی ٹوپی کی بجائے تاشقندی طرز کی پھولدار ٹوپی پہننا شروع کردی تھی۔ موصوف اس ٹوپی کی وجہ سے ہزاروں کے مجمع میں پہچانے جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک بار، جس روز وہ مجھے اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو لاہور کی تاریخی عمارات دکھلانے لے گئے تھے، دھاری دار قمیص اور سفید پاجامے میں ملبوس دیکھا ہے۔ گھر میں وہ تہبند بھی استعمال کرلیتے تھے۔ ان کا لباس عموماً استری سے بے نیاز رہتا تھا۔

اپریل ۱۹۶۷ء میں لاہور میں آل پاکستان ہسٹری اینڈ میوزیم کانفرنس منعقد ہوئی۔ میں فروری میں نو سال کے بعد انگلستان سے واپس آیا اور تین ہفتے بعد علی گڑھ چلا گیا وہاں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی بیٹی ریحانہ سے میرا عقد ہوگیا۔ مارچ کے اواخر میں میں علی گڑھ سے واپس لوٹا تو پروفیسر سعید الدین احمد ڈار کے توسط سے مجھے اور میری اہلیہ کو کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔

میری اہلیہ زندگی میں پہلی بار لاہور آئی تھی اس لئے مندوبین کے ساتھ اسے لاہور کے تاریخی مقامات دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ایک دن لاہور کارپوریشن نے مندوبین کو شالامار باغ میں چائے کی دعوت دی۔ اتفاق سے میں، میری اہلیہ اور چغتائی صاحب ایک ہی میز پر بیٹھے۔ چغتائی صاحب تکلفات سے کوسوں دور تھے۔ انھوں نے انگوٹھے اور سبابہ کی مدد سے ایک رس گلا اٹھایا اور اسے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگے۔ اس کا شیرہ ان کے لباس پر گرنے لگا۔ میری اہلیہ نے حیرت سے ان کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ اس میں حیران ہونے کی بھلا کیا بات ہے۔ چند منٹ بعد نماز مغرب کا وقت ہوگیا۔ چغتائی صاحب کو وضو کی حاجت تھی۔ انھوں نے کوٹ اتارنے کی بجائے اس کے بازو اوپر چڑھائے اور تالاب کے کنارے بیٹھ کر وضو کرنے لگے۔ میری اہلیہ نے دوبارہ حیرت سے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے بتایا کہ موصوف ان کے والد بزرگوار کے دوست ہیں اور انھوں نے مولانا اکبرآبادی کے والد بزرگوار ڈاکٹر ابرار حسین کی آنکھیں دیکھی ہوئی ہیں۔ ہم لوگ پنجاب کے رہنے والے ہیں اس لئے تکلفات میں نہیں پڑتے۔

دسمبر ۱۹۵۵ء میں کراچی میں آل پاکستان ہسٹری کانفرنس منعقد ہوئی۔ اتفاق سے مجھے اور چغتائی صاحب کو ٹرین کے ایک ہی کمپارٹمنٹ میں جگہ ملی۔ مرحوم ہر اسٹاپ پر ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کر دیتے۔ جب گارڈ وہسل دیتا تو مرحوم فوراً چونکتے اور اپنا کمپارٹمنٹ بھول جاتے۔ میں کھڑکی میں سے آواز دیتا تو لپک کر گاڑی میں سوار ہو جاتے۔ ایک بار موصوف حافظ محمود شیرانی سے ملنے ان کے وطن "شیرانیوں کی ڈھانی" گئے۔ ان کی لاہور کی روانگی سے قبل حافظ صاحب نے ایک خط میں انھیں خصوصی ہدایات دی تھیں کہ وہاں تک پہنچنے کے لئے کس اسٹیشن سے گاڑی بدلنا ہوگی اور کہاں اتریں گے۔ اسی طرح مولوی عبدالحق نے ایک بار

انھیں بہاولپور بلایا تو سفر کے بارے میں خاص ہدایات دیں جو چغتائی صاحب کے نام ان کے خطوط میں موجود ہیں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے لئے سفر کرنا ہفت خوان طے کرنے سے کم نہ ہوتا تھا۔

کراچی پہنچ کر میں اپنے عم مکرم کے ہاں چلا گیا اور چغتائی صاحب نے مندوبین کے ساتھ نارتھ ویسٹرن ہوٹل میں قیام کیا۔ ایک دن ڈاکٹر محمود حسین صاحب (برادر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، صدر جمہوریہ ہند) نے اپنے لیکچر میں اس بات کا گلہ کیا کہ اب انھیں ریسرچ اسکالرز نہیں ملتے۔ جونہی یہ نشست ختم ہوئی چغتائی صاحب مجھے بازو سے پکڑ کر ڈاکٹر محمود حسین کے پاس لے گئے اور ان سے کہنے لگے کہ ایک ریسرچ اسکالر تو یہ رہا، اسے اپنے شعبے میں داخل کر لیجئے۔ چنانچہ مجھے پی ایچ ڈی میں داخلہ مل گیا اور میں نے شاہجہاں کی مذہبی پالیسی پر کام شروع کر دیا لیکن اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قبل ہی میں انگلستان چلا گیا۔

سنہ ۱۹۶۹ء میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی آزادی کے بعد پہلی بار پاکستان تشریف لائے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے ساتھ ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ چغتائی صاحب جس زمانے میں تاج محل کے بارے میں پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہے تھے۔ ان دنوں آگرہ میں ان کا قیام مولانا اکبرآبادی کے والد ماجد ڈاکٹر ابرار حسین مرحوم کے ہاں تھا۔ چغتائی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ان پر ان کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ ان کے لئے ناشتہ اور کھانا خود اٹھا کر لایا کرتے تھے۔ چغتائی صاحب نے اپنے مقالے کے دیباچے میں ڈاکٹر صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کیا ہے۔

چغتائی صاحب نے ایک روز اپنے بیٹے سے کار منگوائی اور مجھے اور مولانا اکبرآبادی کو لاہور کے تاریخی مقامات دکھانے لے گئے۔ انھوں نے ایک فلاسک میں چائے اور دوسری میں ٹھنڈا پانی ڈال کر کار میں رکھ لیا۔ موصوف ہمیں شالامار باغ اور

جہانگیر کا مقبرہ دکھانے کے بعد قلعہ لے گئے۔ جون کا غالباً دوسرا ہفتہ تھا اور دوپہر کے گیارہ، سوا گیارہ بجے ہم قلعہ پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب شاہجہانی طرز کی ایک محراب کے سامنے کھڑے ہوکر اس کی فنی خوبیاں بیان کرنے لگے۔ ایک موقع پر انھوں نے مولانا کو مخاطب کر کے فرمایا: "ذرا اس مرغولے کو غور سے دیکھئے"۔ دھوپ اور گرمی کی وجہ سے مولانا بڑے گھبرائے ہوئے تھے اور انھوں نے اچکن اتار کر اپنے بازو پر رکھی ہوئی تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب نے ان کی توجہ مرغولے کی طرف مبذول کرانا چاہی تو مولانا نے مجھے کہا، "یہاں گرمی کے مارے جان نکلی جارہی ہے اور انھیں مرغولے کی پڑی ہے"۔ اسی ایک واقعہ سے فن کے ساتھ ان کے لگاؤ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مرحوم اپنے فن کے آخری اُستاد تھے:

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

قلعہ دکھانے کے بعد مرحوم ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ کھانے کا وقت ہوچکا تھا۔ انھوں نے اپنے اہل خانہ سے دریافت کیا تو انھوں نے اطلاع دی کہ کھچڑی تیار ہے۔ چغتائی صاحب نے کئی بار دریافت کیا "مولانا کھچڑی کھائیں گے؟" پھر خود ہی زنان خانے میں گئے اور کھچڑی اور دہی اٹھا لائے۔ کہنے کو تو معمولی سا کھانا تھا لیکن جس خلوص اور محبت کے ساتھ ہمیں کھلایا، اس کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں تازہ رہے گی۔

چغتائی صاحب ایک بار ہرات تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے سلطان غیاث الدین غوری کی تعمیر کردہ جامع مسجد، امام فخرالدین رازیؒ کا مقبرہ اور اسی طرح کی کئی تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ ہرات سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر زمانہ قدیم کا بنا ہوا ایک سنگی پل ہے جو "پلِ میلان" کے نام سے مشہور ہے۔ موصوف پاپیادہ وہ پل دیکھنے گئے۔ اس پل کی خوبی یہ تھی کہ اس کی کمان بناتے وقت اس بات

کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ پتھر مسالے کے بغیر اس ترتیب سے جوڑے جائیں کہ گرنے نہ پائیں۔ ڈاکٹر صاحب جب ہرات سے واپس لوٹے تو انھوں نے اس پل کی بڑی تعریف کی۔

میں جب بھی ان سے ملتا "پُلِ میلان" کا ذکر ضرور چھیڑ دیتا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے مزے کے ساتھ اس کی فنی خوبیاں بیان کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھوں کی چمک دیکھنے کے لائق ہوا کرتی تھی۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پل کے سامنے کھڑے ہیں اور اسے دیکھ کر اس کی خوبیاں بیان کر رہے ہیں۔

ان کے کمرے میں سلطان الجائیتو خدابندہ کے مقبرے کی ایک رنگین تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔ اس کی کمانیں اور گنبد اس دور کے فنِ تعمیر کا شاہکار ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انھوں نے اسے نمایاں جگہ پر لٹکایا ہوا تھا۔

ایک بار موصوف کا پاؤں پھسل گیا اور ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں عیادت کے لئے حاضر ہوا تو چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور ٹانگ پر پلستر لگا ہوا تھا۔ مرحوم اپنے عزم بالجزم سے جلد ہی تندرست ہو گئے اور اپنے گھر سے شہر تک جانے آنے لگے۔

جب ان کی صحت اچھی تھی تو کئی کئی میل پیدل چل پھر لیتے تھے۔ جب وہ کوئی مضمون تیار کر لیتے تو ایک بستہ بغل میں دبا کر کسی اخبار کے دفتر میں پہنچ جاتے۔ اپنا مضمون مدیرِ اخبار کو دکھاتے اور فنی پہلوؤں پر بحث کرتے۔ ان کا مضمون اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں بڑی آب و تاب کے ساتھ چھپتا۔ میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں ان کے بہت سے مضامین جمع کئے تھے، جو اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

ایک بار چغتائی صاحب مجھ سے روٹھ گئے۔ بات یوں ہوئی کہ جب بھی کسی

مجلّے میں میرا کوئی مضمون چھپتا، مرحوم میرے نام ایک پوسٹ کارڈ ارسال کرتے اور یہ گلہ کرتے کہ اس مضمون میں فلاں کتاب کا حوالہ کیوں نہیں دیا۔ میں نے ایک بار زِچ ہوکر ان کے اور اپنے ایک مشترکہ دوست سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا "دراصل چغتائی صاحب اس موضوع پر خود کچھ لکھنا چاہتے تھے اور تم ان کا موضوع لے اڑے۔ اب ان کے نزدیک یہ موضوع پامال ہوگیا ہے۔" خود ان کے ساتھ بھی ایسا ہوچکا تھا۔ ہمارے دوست کا ایک مضمون شائع ہوا تو چغتائی صاحب نے ایڈیٹر سے شکایت کی کہ یہ مضمون تو ان کا ہے۔ ایڈیٹر نے پوچھا کہ ان کا یہ مضمون کس مجلّے میں چھپا تھا؟ چغتائی صاحب نے جواب دیا کہ وہ بھی اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ایک بار جب چغتائی صاحب کا پوسٹ کارڈ شعبۂ تاریخ کے چپراسیوں اور کلرکوں کی نظروں سے گذرتا ہوا مجھ تک پہنچا تو مجھے بڑی ذہنی کوفت ہوئی۔ میں نے انھیں بڑا سخت خط لکھا۔ اس کے جواب میں ان کا ایک ناصحانہ خط آیا کہ وہ تو میرے بھلے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ تاہم ہماری بات چیت بند ہوگئی لیکن چند ماہ بعد ایک تقریب میں ہماری صلح ہوگئی اور میں دوبارہ ان کے ہاں جانے آنے لگا۔

چغتائی صاحب جس کے دوست ہوتے تھے اس پر جان چھڑکتے تھے اور اگر کسی کے مخالف ہوجاتے تھے تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ خان محمد ولی اللہ خاں سے، جو پہلے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور ان دنوں محکمۂ اوقاف کے مشیر آثارِ قدیمہ ہیں، علمی مباحث کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اگر خاں صاحب کسی عمارت کے نیچے کچھ حصہ کو عید گاہ کی محراب ثابت کرتے تو چغتائی مرحوم اسے جنازہ گاہ کی محراب بتاتے۔ خانِ موصوف اپنی لیبارٹری میں اینٹوں کا تجزیہ کراتے اور اس کی رپورٹ اخبارات میں شائع کرادیتے۔ کئی سال کوٹ خواجہ سعید کی محراب پر ان دونوں بزرگوں کی بحث

کا سلسلہ چلتا رہا۔ اسی طرح شیخ محمد اکرام مرحوم، مصنف کوثر سیریز، کے ساتھ بھی ان کی نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

جناب گلزار احمد صاحب، جو اِن دنوں ٹیکسلا میوزیم کے کیوریٹر ہیں، ایم اے تاریخ کی تیاری میں مصروف تھے۔ انھوں نے آرکیالوجی کے دو پرچوں کا امتحان دیا تھا اور اس سلسلے میں انھیں کچھ مواد کی ضرورت تھی۔ چغتائی صاحب کے پاس مطلوبہ مواد موجود تھا لیکن وہ گلزار صاحب کو نوعمر سمجھ کر ٹال دیتے تھے۔ گلزار صاحب نے ایک دن مجھ سے گلہ کیا تو میں نے اسے ایک داؤ سکھایا۔ اگلے روز گلزار صاحب چغتائی مرحوم کے پاس گئے اور ان سے مدد چاہی۔ انھوں نے حسب معمول انھیں ٹالنا چاہا تو انھوں نے کہا "اچھا، اگر آپ میری مدد نہیں کرتے تو میں ولی اللہ خاں سے مدد کی درخواست کروں گا۔" گلزار صاحب کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ چغتائی مرحوم فرمانے لگے، اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ کچھ نہیں جانتا۔ تم میرے پاس ہی آجایا کرو، میں ہر طرح سے تمھاری مدد کروں گا۔" گلزار صاحب کا کام بن گیا اور ایک روز وہ میرا شکریہ ادا کرنے آئے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی تھی۔ مرحوم فرانسیسی زبان سے بھی واقف تھے۔ ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ پاکستان میں محکمہ آثار قدیمہ کے سربراہ ایک فرنچ نوجوان تھے جن کا نام موسیو اوریل تھا۔ میں نے ایک تقریب میں انھیں فرانسیسی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پیرس میں قیام کی وجہ سے "موسیو" ان کا تکیۂ کلام بن گیا تھا۔ مرحوم جب بھی مجھ سے بات کرتے تو بار بار موسیو کہہ کر مجھے مخاطب کرتے۔ میں بھی ازرہِ تفنن ان کو اسی لقب سے مخاطب کیا کرتا تھا۔

میرے مخلص دوست اور ہم جماعت پروفیسر بشیر احمد طاہری گورنمنٹ ڈگری کالج بھمبر کے پرنسپل تھے۔ وہ ہر سال اپنے کالج میں یومِ اقبال منایا کرتے تھے۔

اس موقع پر وہ اسپیشل ویگن لے کر آتے اور لاہور سے متعدد اسکالرز کو بھنبر لے جاتے۔ ایک بار ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، مولانا عبداللہ قریشی، سید نذیر نیازی، ڈاکٹر معزالدین، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور راقم الحروف شریک سفر تھے۔ جب ہماری ویگن کامونکی سے آگے بڑھی تو چغتائی صاحب بار بار مجھ سے پوچھتے "موسیو! یہاں سادھو کی نام کی ایک بستی ہوا کرتی تھی وہ کب آئے گی؟" وہ بار بار یہی فقرہ دہراتے یہاں تک کہ تمام ساتھی ہنسنے لگے اور پھر موصوف خود بھی ہنس پڑے۔ مولانا عبداللہ قریشی ہر تھوڑے وقفے کے بعد مجھ سے پوچھتے "کیوں بھئی ابھی سادھو کی نہیں آیا؟" چغتائی صاحب بھی اس تکرار سے محظوظ ہوتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب آزادی کے بعد کسی مستشرق کے ساتھ بذریعہ کار بھارت تشریف لے گئے۔ انھوں نے جالندھر سے ہوشیارپور، روپڑ اور انبالہ کا راستہ اختیار کیا۔ میں نے ان سے ہوشیارپور سے لے کر سرہند تک کے علاقے کی تعریف کئی بار سنی ہے۔ اس راہ میں انھوں نے پرانے مقبروں اور مسجدوں کے آثار دیکھے، جن کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

ایک دن چغتائی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ جب علامہ اقبال کی میت قبر میں اتاری گئی تو ان کے برادر بزرگ عبدالرحمن چغتائی قبر میں اترے اور انھوں نے علامہ مرحوم کا آخری دیدار کیا۔ عبدالرحمن کہا کرتے تھے کہ علامہ صاحب کا آخری دیدار کرنے کی سعادت ان کے حصے میں آئی ہے۔

ایک روز چغتائی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ وہ برٹش میوزیم میں مطالعہ میں مصروف تھے کہ میوزیم کا ایک ذمہ دار افسران کے پاس آیا اور ان سے کہنے لگا کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ بنو امیہ کے جھنڈے کا رنگ کیا تھا؟ چغتائی صاحب اس وقت تو کوئی جواب نہ دے سکے لیکن چند منٹ بعد انھوں نے

کوئی کتاب اٹھائی تو اس میں اس جھنڈے کی تصویر موجود تھی۔ موصوف فوراً وہ کتاب لے کر اس افسر کے پاس گئے۔ اس نے فوراً پانچ پونڈ کا ایک نوٹ ان کی خدمت میں پیش کیا۔

چغتائی صاحب کے بڑے صاحبزادے عبدالرؤف نے راقم الحروف کو بتایا کہ چغتائی صاحب کی کردار سازی میں ان کی اہلیہ مرحومہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ جس وقت ان کی شادی ہوئی اس وقت وہ انڈر میٹرک تھے۔ میٹرک کا امتحان شادی کے بعد پاس کیا اور پھر پی، ایچ ڈی تک تعلیم پائی۔ لوگ عموماً شادی کے بعد تعلیم ترک کر دیتے ہیں لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔

چغتائی صاحب کی وفات سے چند ماہ قبل اپنا میری شمل لاہور آئیں اور انھوں نے عجائب گھر سے ملحقہ آڈیٹوریم میں مسلمانوں کے فن تعمیر کے بارے میں لیکچر دیا۔ چغتائی صاحب بڑھاپے اور نقاہت کے باوجود وہاں پہنچے لیکن آڈیٹوریم میں جانے کی ہمت نہ ہوئی اور باہر ہی کرسی ڈال کر بیٹھ گئے۔ میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ ان کا سر ہلنے لگا ہے اور حواس بھی درست نہیں رہے ہے۔ میں نے خیریت پوچھی تو حسب معمول "فضل" کہا۔ میں نے سوال کیا کہ اب لکھنے پڑھنے کا کیا حال ہے؟ انھوں نے ہاتھوں کے اشارے سے بتایا کہ اب کچھ نہیں کرتے۔ میں ان کی حالت پر افسوس کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

چغتائی صاحب کے تین بیٹے ہیں۔ سب سے بڑا بیٹا عبدالرؤف، جو شکل و شباہت میں ہو بہو ان سے ملتا ہے، اسٹیشنری کی دکان پر بیٹھتا ہے۔ اس دکان کا آغاز چغتائی صاحب نے کیا تھا اور اس کا نام "کتاب خانہ نورس" رکھا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسے "کاپی بک شاپ" کہنے لگے۔ میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب چغتائی صاحب خود اس دکان پر بیٹھا کرتے تھے۔

ان کا دوسرا فرزند عبدالاحد ہے۔ انھوں نے آکسفورڈ سے فنِ تعمیر میں سند لی ہے۔ اِن دنوں وہ آرکیٹکٹ ہیں۔ ان کا تیسرا فرزند عبدالخالق محکمہ ریلوے میں چیف انجینئر ہے اور اِن دنوں ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ ہے۔

سلبی اولاد کے علاوہ ان کی تصانیف کو ہم ان کی معنوی اولاد کہہ سکتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے تاج محل، مسجد وزیر خاں، بادشاہی مسجد، تاریخ اماکنِ لاہور، اسلامی کوزہ گری اور اسلامی مصوری، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ ان کے صدہا مقالے علمی اور ادبی جرائد کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔ یہ ان کے لائق و فائق فرزندوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے اس علمی سرمائے کو کتابی صورت میں محفوظ کرلیں۔

چغتائی صاحب کی نماز جنازہ دو بار ہوئی۔ پہلی نماز جنازہ مفتی محمد حسن امرتسریؒ کے فرزند مولانا عبدالرحمٰن نے مین مارکیٹ گلبرگ کے راؤنڈ آباؤٹ میں پڑھائی۔ راقم نے بھی اس میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ دوسری نماز میانی صاحب کی جنازگاہ میں ہوئی اور اس میں ان لوگوں نے شرکت کی جو گلبرگ نہیں پہنچ سکے تھے۔

چغتائی صاحب کو قبرستانِ میانی صاحب میں ان کی اہلیہ کی قبر سے متصل دفن کیا گیا۔ ان کی قبر کے قرب و جوار میں تاج زریں رقم، احمد حسین مدیر شباب اردو، استاد شریف خاں ستار نواز، سید فدا حسن، حضرت مولانا شہاب الدینؒ و الدِ ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور مولانا نور الحق جیسے مشاہیر محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ۔

مساجد و معابد قرآن کی روشنی میں

از مولانا محمد ثناء اللہ عمری ایم اے - جامعہ دار السلام - عمر آباد

(۲)

"اصل یہ ہے کہ اس آیت میں خدائے تعالیٰ نے اس حالت کی طرف اشارہ کیا ہے جو آغازِ اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی تھی جب آپ نماز پڑھنے کے لیے قیام فرما ہوتے ایک جماعت آپ کے جاں نثاروں کی آپ کے پیچھے صف بستہ کھڑی ہو جاتی اور خشوع و خضوع اور انقطاع و قنوت کے ساتھ یہ مقدس گروہ ایک اَن دیکھی ہستی کے تصور میں بے خودانہ مصروف رکوع و سجود و مشغول تسبیح و تکبیر ہوتا تو یہ منظر کفار عرب کے لیے نہایت تعجب انگیز ہوتا اور وہ اس عجیب طریق قیام و رکوع اور صفوف و متابعتِ امام کی عظمت و رعب سے مبہوت ہو جاتے، پھر انھوں نے اپنی شوخی و سرکشی سے اس منظر عبادت کو ایک تماشا سا بنا لیا اور نماز کے وقت جمع ہو ہو کر ہجوم کرنے لگے۔ اور دیکھنے کے شوق میں ایک دوسرے پر ٹوٹنے لگے وہ اکثر تماشا دیکھنے والوں کی طرح بڑھتے بڑھتے اس قدر قریب آ جاتے گویا لپیٹ لڑنے کے ارادے سے بڑھ رہے ہیں؛"[۱]

یہودی اور عیسائی اپنی عبادت گاہوں اور گرجا گھروں میں شرک کے مرتکب ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ حکم دیا کہ مسلمان مسجدوں میں خدائے واحد کی عبادت کریں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ مساجد سے مراد سجدہ کے اعضاء و جوارح ہیں، مطلب یہ ہوا کہ دلی توجہ کے ساتھ ظاہری حیثیت سے بھی اللہ ہی کی عبادت کا ثبوت ملنا چاہیے، اللہ کے رسول فرماتے ہیں: مجھے

سات ہڈیوں پر سجدہ پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، پیشانی۔ ہاتھ کے اشارہ سے فرمایا کہ ناک بھی اس میں شامل ہے۔ دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے، اور دونوں پنجے۔

۳۰۔ سورۂ نور کی اس آیت میں اللہ کے گھر کا مقصد بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ اس میں اسی کا ذکر ہو اور صبح و شام اسی کے نام کی تسبیح:

فی بیوت اذن اللہ ان ترفع و یذکر فیھا اسمہ یسبح لہ فیھا بالغدو والاصال (۳۶)

یہ چراغ ایسے گھروں میں روشن کیا جاتا ہے جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کی عظمت کی جائے اور ان میں اللہ کا ذکر اور اس کے نام کی تقدیس ہو، ان میں اللہ کے بندگان مخلص و مومن صبح و شام تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں۔[له]

اس آیت میں بیوت سے مراد مسلمانوں کی عبادت گاہیں یعنی مسجدیں ہیں۔ دیگر مذاہب و ادیان کی عبادت گاہیں مقصود نہیں، حضرت کعبؓ فرماتے تھے کہ توریت میں یہ نوشتہ موجود ہے کہ "زمین میں میرے (یعنی اللہ کے) گھر مسجدیں ہیں۔" ان کی رفعت و بلندی کا مطلب یہ ہے کہ ان میں کثرت سے یاد الٰہی ہو۔ چونے گارے کی شان و شوکت مقصود نہیں ہے، بے شمار حدیثوں میں مسجدوں کی ظاہری آرائش و زیبائش سے روکا گیا ہے۔ رفعت کے معاً بعد ذکر کا لفظ آیا ہے جو درحقیقت لفظ رفعت کی تفسیر ہے۔

۳۱۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہو رہا ہے کہ مسجدوں میں انابت الی اللہ کی معنوی ہیئت کے ساتھ لباس و پوشاک کی ظاہری ہیئت بھی درست رکھنی چاہیے۔

قل أمر ربی بالقسط واقیموا وجوھکم عند کل مسجد وادعوہ مخلصین لہ الدین کما بدأکم تعودون ○ فریقا ھدیٰ وفریقا حق علیھم الضلٰلۃ انھم اتخذوا الشیاطین اولیاء من دون اللہ ویحسبون

له مقالات آزاد ص ۱۴۲۔

انهم مهتدون ○ یابنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد وکلوا واشربوا ولا تسرفوا انه لا یحب المسرفین۔ (۲۹-۳۱)

تم کہو "میرے پروردگار نے جو کچھ حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ (ہر بات میں) اعتدال کی راہ اختیار کرو، اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ درست رکھو اور دین کو اسی کے لیے خالص کر کے اسے پکارو اس نے جس طرح تمہاری ہستی شروع کی اسی طرح لوٹائے جاؤ گے (تمہارے دو گروہ ہو گئے) ایک گروہ کو (اس کے ایمان و نیک عملی کی وجہ سے کامیابی کی) راہ دکھائی۔ دوسرے پر (اس کے انکار و بدعملی سے) گمراہی ثابت ہو گئی ان لوگوں نے (یعنی دوسرے گروہ نے) خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنایا (یعنے مفسدوں اور شریروں کی تقلید کی) بااین ہمہ سمجھے کہ راہ راست پر ہیں (اور ہم نے حکم دیا تھا) اے اولاد آدم! عبادت کے ہر موقعہ پر اپنے جسم کی زیب و زینت سے آراستہ رہا کرو نیز کھاؤ پیو حد سے نہ گزر جاؤ۔ خدا انھیں پسند نہیں کرتا جو حد سے گذر جانے والے ہیں۔

یہاں مسجد سے مراد مقامات عبادت ہیں، عہدِ جاہلیت میں ننگے طواف کرنے کا رواج عام تھا۔ یہاں اس سے روکا گیا اور پنج وقتہ نمازوں، جمعہ، عیدین وغیرہ کے موقعہ پر لباس پوشاک پہننے کی تاکید فرمائی اور اسے زینت قرار دیا۔

۳۲- آداب مسجد ہی کے سلسلہ کا ایک حکم وہ ہے جو سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے

ولا تباشروھن وانتم عاکفون فی المساجد۔ تلک حدود اللہ فلا تقربوھا۔ کذلک یبین اللہ آیاتہ للناس لعلھم یتقون ○ (۱۸۷)

البتہ اگر تم مسجد میں اعتکاف کر رہے ہو تو اس حالت میں نہیں چاہیے کہ اپنی بیویوں سے خلوت کرو (جہاں تک روزے کا تعلق ...) یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں ہیں، پس ان سے دور دور رہنا، اللہ اسی طرح اپنے احکام واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ

(نافرمانی سے) بچیں۔

عام معابد و مساجد

۳۳۔ سورۂ حج میں واضح کیا ہے کہ مساجد کے علاوہ دیگر اقوام کی عبادت گاہوں کا تحفظ خالق کائنات کے قانون دفاع کا نتیجہ ہے۔ یہ قانون کارفرما نہ ہو تو ان عبادت گاہوں کی عمارتیں زمین کے برابر ہو جائیں۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیرہ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ، ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومسٰجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیزہ (۳۹-۴۰)

جن (مومنوں) کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے اب انھیں بھی (اس کے جواب میں) جنگ کی رخصت دی جاتی ہے، کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے، اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے!

یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، ان کا کوئی جرم نہ تھا۔ اگر تھا تو صرف یہ کہ وہ کہتے تھے ہمارا پروردگار اللہ ہے! اور دیکھو اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت کراتا نہ رہتا (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم و تشدد کرنے کے لیے بے روک چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی، خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے (یاد رکھو) جو کوئی اللہ (کی سچائی) کی حمایت کرے گا ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے، کچھ شبہ نہیں وہ یقیناً قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے!

۴۳- عبادت گاہوں کے لیے جو الفاظ مندرجۂ بالا آیات میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ایک لفظ "محراب" اسی معنی میں تین بار استعمال ہوا ہے، آل عمران میں دو جگہ اور سورۂ مریم میں ایک مقام پر، واضح رہے کہ محراب سے مراد عبادت اور خلوت گزینی کی جگہ ہے، پہلے آل عمران کی آیتیں ملاحظہ ہوں:

فتقبلها ربها بقبول حسن وانبتها نباتا حسنا وکفلها زکریا۔ کلما دخل علیها زکریا المحراب وجد عندها رزقا قال یامریم انی لک هذا قالت هو من عند الله ان الله یرزق من یشاء بغیر حساب ٥ هنالک دعا زکریا ربه قال رب هب لی من لدنک ذریة طیبة انک سمیع الدعاء ٥ فنادته الملائکة۔ وهو قائم یصلی فی المحراب ان الله یبشرک بیحیی مصدقا بکلمة من الله وسیدا وحصورا ونبیا من الصالحین ٥ (۳۷ - ۳۹)

پس ایسا ہوا کہ مریم کو اس کے پروردگار نے بڑی ہی اچھی قبولیت کے ساتھ قبول کر لیا اور اور ایسی نشو ونما دی جو بڑی ہی اچھی نشو ونما تھی (یعنی اس کی پرورش بہتر سامانوں اور نیک نگرانوں میں ہوئی) اور زکریا کو (کہ ہیکل کا مجاور تھا) اس کا نگران حال بنایا۔ جب کبھی ایسا ہوتا کہ زکریا اس کے پاس محراب میں (یعنی قربان گاہ میں) جاتا (جہاں وہ سرگرم عبادت رہا کرتی تھیں) تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے کی چیزیں موجود پاتا اس پر وہ پوچھتا "اے مریم! یہ چیزیں تجھے کہاں سے مل گئیں،" وہ کہتی "اللہ سے، اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے،" اسی جگہ کا یہ معاملہ ہے (یعنی قربان گاہ کا) کہ زکریا نے اپنے پروردگار کے حضور دعا مانگی تھی "خدایا! تو اپنے خاص فضل سے مجھے پاک نسل عطا فرما (جو مریم کی طرح نیک اور عبادت گزار ہو) بلاشبہ تو ہی ہے کہ دعائیں سننے والا اور التجائیں قبول کرنے والا ہے،" پھر ایسا ہوا کہ فرشتوں نے زکریا

کو پکارا اور وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا " خدا تجھے یحییٰ کی (یعنی ایک لڑکے کی جو پیدا ہوگا اور اس کا نام یحییٰ رکھا جائے گا) بشارت دیتا ہے، وہ خدا کے حکم سے ایک ہونے والے ظہور کی تصدیق کرنے والا، جماعت کا سردار، پارسا، اور خدا کے صالح بندوں میں سے ایک نبی ہوگا۔

۳۵۔ سورۂ آل عمران کی آیتوں کے بعد سورۂ مریم کی ذیل کی آیت میں بھی لفظ " محراب " آیا ہے :

فخرج علیٰ قومہ من المحراب فاوحیٰ الیھم ان سبحوا بکرۃ وعشیاہ (۱۱)

پھر وہ قربان گاہ سے نکلا، اور اپنے لوگوں میں آیا (جو حسب معمول اس کا انتظار کر رہے تھے) اس نے (زبان نہ کھولی) اشارہ سے کہا " صبح و شام خدا کی پاکی و جلال کی صدائیں بلند کرتے رہو "

اصحاب کہف نے وقت کے غارت گران ایمانی سے اپنے متاعِ ایمان کی حفاظت کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہ دیکھی کہ ایک غار میں روپوش ہو جائیں۔ مدتِ مدید کے بعد حالات بدلے، مومن ہونا کوئی جرم نہ رہا اور لوگ ان کی جائے پناہ سے واقف ہو گئے تو اربابِ حل و عقد نے آپس میں جو بات طے کی وہ یہ تھی کہ باشندگانِ غار کی یادگار میں ایک عبادت گاہ بنائیں۔

۳۶۔ اس موقعہ پر سورۂ کہف میں ارشاد ہوتا ہے :

وکذالک اعثرنا علیھم لیعلموا ان وعد اللہ حق وان الساعۃ لا ریب فیھا۔ اذ یتنازعون بینھم امرھم فقالوا ابنوا علیھم بنیانا ربھم اعلم بھم۔ قال الذین غلبوا علیٰ امرھم لنتخذن علیھم مسجدا (۱۲)

اور (پھر دیکھو) اس طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے واقف کر دیا۔

(ان کی بات پوشیدہ نہ رہ سکی) اور اس طرح واقف کر دیا کہ لوگ جان لیں اللہ کا وعدہ
سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ! اسی وقت کی بات ہے کہ لوگ آپس میں
بحث کرنے لگے، ان لوگوں کے معاملہ میں کیا کیا جائے ؟ لوگوں نے کہا "اس غار پر
ایک عمارت بنا دو (کہ یادگار رہے اس سے زیادہ اس معاملہ کے پیچھے نہ پڑو) ان پر
جو کچھ گزری ان کا پروردگار ہی اسے بہتر جانتا ہے"، تب لوگوں نے کہ معاملات پر
غالب آگئے تھے کہا "ٹھیک ہے ہم ضرور ان کے مرقد پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے"
حکام جو عبادت گاہ تعمیر کرنی چاہتے تھے کون تھے ؟ مسلمان تھے یا مشرک ؟ بظاہر ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ صاحب اقتدار لوگ تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان کا یہ ارادہ قابلِ ستائش ہے ؟ یا بات
محل نظر ہے۔ حضورؐ نے تو صراحۃً یہودیوں اور مسیحیوں پر لعنت بھیجی ہے جنھوں نے اپنے انبیاء
و صالحین کی قبروں کی مسجدیں بنا لیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں سرزمینِ
عراق میں دانیال کی قبر دیکھی تو فرمایا اسے لوگوں کی نظروں سے چھپائے رکھو اور اس تحریر کو
بھی دفن کر دو جس میں بعض جنگی حالات وغیرہ کا ذکر ہے۔

(ختم شد)

اسلامی تہذیب اور رواداری

محمد مسعود عالم القاسمی ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڈھ

رواداری اور تہذیب کا انتہائی گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے، کسی تہذیب کو جامع اور مکمل قرار دیے جانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس میں کامل رواداری موجود ہو۔ کیونکہ رواداری ایک ایسا مظہر حیات ہے جس کے ذریعہ انسانی تعلقات، اجتماعی برتاؤ (Social behaviour) باہمی معاملات اور معاشرت و اخلاق کے وہ سارے پہلو روشن ہو جاتے ہیں جو ہر تہذیب کے اجزائے ترکیبی شمار کیے جاتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس تہذیب میں رواداری کا جتنا اعلیٰ اور کامل تصور ہوگا وہ تہذیب اسی قدر بلند اور کامل ہوگی اور جو تہذیب اس اہم عنصر سے خالی ہوگی وہ کبھی کامل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ بعض لوگوں نے تو تہذیب کو رواداری کا دوسرا نام قرار دیا ہے، ان کے خیال میں "رواداری ہی اصل تہذیب ہے اور دوسری چیزیں اس کی خصوصیات ہیں" اگرچہ ہم اس نقطہ نظر سے بالکلیہ اتفاق نہیں کر سکتے، تاہم اس کی جزوی صداقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی تہذیب میں رواداری کا جو تصور ہے، وہ دنیا کی دوسری تہذیبوں سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ قرآن کی محکم آیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح احادیث اور تاریخ اسلامی کے روشن واقعات سے رواداری کی قدر و قیمت کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد کسی صاحب بصیرت شخص کے لیے یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ وہ اسلامی تہذیب کی

ہمہ گیری اور اس کی عظمت رواداری کا انکار کردے۔ مگر یہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ غیر مسلم دانشوروں اور مغربی مفکروں نے اسلام پر تعصب وعناد، جبر واکراہ سے کام لینے اور خود پرست (Egocentric) ہونے کے الزامات عائد کئے ہیں۔ ان کی ہرزہ سرائیوں سے تعرض کیے بغیر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان بنیادی تعلیمات کا اجمالاً تذکرہ کیا جائے جن کو بطور اصول کے اسلام پیش کرتا ہے۔

(۱) اس سلسلہ میں پہلا اور بنیادی اصول انسانی برادری کا ہمہ گیر تصور ہے، اسلام کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ پیدائش کے اعتبار سے ان میں کوئی بڑا اور چھوٹا نہیں۔ سب کا درجہ برابر ہے۔ اور سب آپس میں بھائی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر وانثی وجعلنٰکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ط (الحجرات۔ ۱۳) لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا " الا ان ربکم واحد لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا اسود علی احمر ولا احمر علی اسود الا بالتقوی (بیہقی)

سنو! تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر، اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔

(۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کا خالق اور مالک ہے۔ اس لیے اس کی نظر میں تمام افراد انسان برابر ہیں اس کا کسی سے کوئی ایسا خصوصی رشتہ نہیں جو دوسرے سے نہ ہو، اس کی محبت و عداوت، رضامندی و ناراضی کا معیار صرف ایک ہے۔ وہ ہے " ایمان اور عمل صالح " جو شخص اللہ اور اس کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے اور اس بنیاد پر

عمل صالح کی تعمیر کرتا ہے درحقیقت وہی خدا کا محبوب بندہ ہے۔ خدا کو مسلمان، یہودی اور نصرانی ومجوسی وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ارشاد باری ہے:

لیس باما نیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوء یجزبہ ولا یجد لہ من دون اللہ ولیا ولا نصیرا۔ ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثی وھو مومن فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیرا (النساء ۱۲۴-۱۲۳)

"انجام کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلہ میں اپنے لیے کوئی حامی ومددگار نہ پا سکے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن تو ایسے ہی لوگ جنّت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔

(۳) تیسرا اصول اس حقیقت پر مبنی ہے کہ تمام انبیاء ورسل اللہ کے سچّے اور نیک بندے ہیں جن کو اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے منتخب کیا ہے۔ اور یہ کہ تمام آسمانی کتابیں خدا کی نازل کردہ ہیں ہم ان سب کو برحق مانتے ہیں۔ اور سب کا یکساں احترام کرتے ہیں۔ ارشاد ہے

قولوا اٰمنّا باللہ وما انزل الینا وما انزل الی ابراھیم واسماعیل واسحاق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اُوتی النبیون من ربّھم لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون (البقرہ-۱۳۶)

"کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں"

(۴) چوتھا اصول یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی اساس عقیدۂ توحید ہے، تو جو لوگ اس سے انحراف کرتے ہیں اور جن کے واضح ہو جانے کے بعد بھی شرک یا الحاد کی راہ اپناتے ہیں ان کا معاملہ

قیامت کے دن کے لیے اٹھا رکھا جائے گا۔ اسلامی ریاست میں کوئی مسلمان اس بات کا مجاز نہ ہوگا وہ محض اختلاف مذہب کی بنا پر ان کی دل آزاری کرے، ان کے معتقدات پر حملہ کرے مبادا وہ مسلمانوں کے معتقدات پر حملہ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ قرآن نے بڑی شدت سے اس کو منع کیا ہے:

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللّٰہ فیسبوا اللّٰہ عدوا بغیر علم کذالک زینا لکل امة عملھم ثم الی ربھم مرجعھم فینبئھم بما کانوا یعملون۔ (الانعام۔ ۱۰۸)

جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں، ان کو برا نہ کہو کیونکہ اس کے جواب میں نادانی۔ بے ناحق یہ خدا کو گالیاں دیں گے، ہم نے تو اسی طرح ہر قوم کے لیے اس کے اپنے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر ان سب کو اپنے پروردگار کی طرف واپس جانا ہے وہاں ان کا رب ان کو بتا دے گا کہ انھوں نے کیسے عمل کیے ہیں۔

(۵) پانچواں اصول یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کیا جائے۔ (وقولوا للناس حسنا)

اور دینِ حق کی دعوت بھی دی جائے تو اس میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا جائے کہ ہمارا اسلوب و انداز ان کے لیے تنگ دلی اور ہٹ دھرمی کا موجب نہ بن جائے۔ ارشاد ہے:۔

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی احسن۔ (النحل۔ ۱۲۵) اپنے رب کے راستہ کی دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"الخلق عیال اللّٰہ فاحب الخلق الی اللّٰہ من احسن الی عیالہ (بیہقی فی شعب الایمان)

"تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اس لیے اللہ کو وہی بندہ پسند ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ حسن

سلوک کرے"۔

(۶) چھٹا اصول یہ ہے کہ اختلاف مذہب وعقائد کی بنا پر غیر مسلموں کے ساتھ "انصاف" کرنے سے گریز نہ کیا جائے، قرآن کریم میں ہے:

ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھواقرب للتقویٰ۔ (المائدہ – ۸)

کسی قوم کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ تم انصاف سے پھر جاؤ، انصاف کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

(۷) ساتواں اصول یہ ہے کہ "ہر شخص کو عقیدہ ونظریہ اور فکر ورائے کی آزادی حاصل ہے، اس لیے جو شخص خود اپنی بصیرت اور قلب وضمیر کی کامل آمادگی کے ساتھ ایمان نہیں لاتا، اس کو ایمان لانے پر مجبور بھی نہیں کیا جاسکتا" قرآن حکیم میں کئی مواقع پر مختلف انداز میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (البقرہ-۲۵۶) دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت ضلالت سے ممتاز ہوچکی ہے۔ افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مومنین۔ (یونس۔ ۹۹) تو کیا تم لوگوں کو مجبور کروگے کہ وہ مومن ہوجائیں۔

(۸) آٹھواں اصول یہ ہے کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی نہیں کی جاسکتی۔ قرآن نے قانون جنگ کا ایک مقصد عبادت گاہوں کی "حفاظت" بھی بتایا ہے۔ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع (الحج ۴۰)

اگر اللہ بعض کو بعض کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو گرجا اور معبد مسمار کردیے جائیں۔

(۹) آخری اصول یہ ہے کہ مسلم کی طرح ذمی، معاہد اور غیر حربی کافر کی جان ومال، عزت وآبرو واجب الاحترام ہے۔ اگر کسی نے ان حدود کا پاس ولحاظ نہ کیا تو اسلامی ریاست اس سے باز پرس کرے گی۔ آنحضور صلعم کا ارشاد ہے:

"خبردار جو کسی معاہد پر ظلم کرے گا، یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے

زیادہ اس پر بار ڈالے گا، یا اس سے کوئی چیز اس کے خلاف وصول کرے گا، اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث ہوں گا۔ (ابوداؤد کتاب الجہاد)

ان اصول کی روشنی میں ایک شخص با آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ جس برتاؤ اور حسن اخلاق کا معاملہ اسلام میں کیا گیا ہے وہ کسی دوسرے نظام تہذیب میں مشکل ہی سے مل سکے گا۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ یہ تعلیمات محض کتابوں اور زبانی دعووں کی حد تک ہوں اور عملی دنیا میں ان کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ بلکہ پوری اسلامی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اسلامی ریاست نے نامساعد حالات میں بھی اصول رواداری کو نہیں چھوڑا۔ چند تاریخی حقائق کا مطالعہ کرتے چلیے۔

ذمی کے بدلے مسلمان کا قتل قبیلہ بکر ابن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا۔ خلیفہ وقت حضرت عمر فاروق رضؓ کو اس کی اطلاع دی گئی، انھوں نے لکھ بھیجا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا جائے۔ چنانچہ قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا گیا اور انھوں نے اسے قتل کر ڈالا۔ ٹھیک یہی واقعہ عثمان غنی رضؓ حضرت علی رضؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ وغیرہم کے زمانۂ خلافت میں پیش آیا مگر ان سب نے یہی فیصلہ کیا۔

یہ الزام بار بار دہرایا جاتا ہے کہ "اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو گرجا اور معابد بنانے کی اجازت نہیں دی گئی"، مگر یہ بھی ایک غلط فہمی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ جو خاص مسلمانوں کے آباد کردہ شہر تھے۔ ان میں یقیناً اس کی اجازت نہ تھی لیکن ان شہروں میں جہاں غیر مسلم پہلے سے آباد تھے وہاں اس کی پوری آزادی تھی۔ دو ایک واقعہ بطور "مشتے نمونہ از خروارے" ملاحظہ فرمائیے۔

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کو جو حقوق عنایت فرمائے تھے ان کی تفصیل امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھی ہے"۔ نجران اور اس کے ماتحت لوگوں کو اپنے اموال جانوروں زمینوں اور مذہب کے سلسلہ میں حاضر اور غیر حاضر تمام افراد کو ان کے اہل خاندان کو عبادت گاہوں کو، تھوڑی یا بہت جو چیزیں بھی ان کے قبضہ میں ہے، سب کے

سلسلہ میں اللہ کی نگہبانی اور محمد اللہ کے رسول کی ذمہ داری حاصل ہوگی۔ اور ان کے اسا قفہ میں سے کسی کی اسقفیت بدل نہیں کرائی جائے گی۔ اور نہ کسی راہب سے اس کی رہبانیت چھڑائی جائے گی۔ اور نہ کسی کاہن سے اس کی کہانت، اور ان پر کسی قسم کی ذلت نہیں طاری کی جائے گی۔ نہ ان کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ نہ تنگی میں مبتلا کیا جائے گا۔ نہ ان کی سرزمین کو کوئی فوج بھیج کر پامال کیا جائے گا۔"[۱]

محمد بن قاسم (فاتح سندھ) کی طرف سے برہمنوں کو جو حقوق عطا کیے گئے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مؤرخ علی بن حامد نے لکھا ہے۔

"پس اکابر و مقدمان براہمہ را فرمود کہ معبود خود را عبارت کنند، و فقرائے برہمارا باحسان و تعہد تیار دارند، و اعیاد و مراسم بشرائط ابا و اجداد قیام نمایند، و صدقاتے کہ بیش ازیں درحق براہمہ میدادند بر قرار قدیم بدہند۔"[۲]

اور اس سے بڑھ کر اس بات کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اسلامی فقہ میں اس کی صراحت ہے کہ "اگر کوئی عیسائی ایک گرجا بنانے کی وصیت کر جائے تو اسلامی عدالت اس وصیت کو جائز تسلیم کرے گی اور اگر مسجد بنانے کی وصیت کر جائے تو ناجائز۔"

غیر مسلموں کا اعتقاد یہ واقعہ بھی تاریخ میں محفوظ رہے گا کہ جب مسلمانوں نے جنگ یرموک کے لیے "حمص" کو چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا تو یہ کہہ کر "عیسائیوں سے جو جزیہ اور خراج لیا جاتا ہے، اس معاوضہ میں کہ ہم ان کو دشمن سے بچا سکیں۔ اور اس نازک حالت میں ہم ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں اٹھا سکتے"، لاکھوں کی رقم واپس کر دی۔ اس پر عیسائیوں کا یہ حال تھا کہ وہ روتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے تھے "خدا تم کو واپس لائے" اور یہود تو توریت کی قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے "جب تک ہم زندہ ہیں، قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔"[۳]

---

[۱] کتاب الخراج فی حقوق اہل الذمہ۔ [۲] تاریخ سندھ بحوالہ مقالات شبلی اول۔

[۳] الفاروق ص ۱۲۵ مولانا شبلی نعمانی

اندازہ کیا جا سکتا ہے آخر وہ کیا چیز تھی جو مسلمانوں کی واپسی کی دعا کرنے پر مجبور کر رہی تھی، حالانکہ مقابلہ خود ان کے ہم مذہب سے تھا۔ یقیناً اس کے پیچھے مسلمانوں کا حسن سلوک، نیک رویہ، بے لوث انصاف، سچی محبت اور کامل رواداری کے عوامل کار فرما تھے حتیٰ کہ وہ یہود جو مسلمانوں کے "پیدائشی دشمن" رہے۔ اسلامی رواداری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اسلامی تہذیب غیر اسلامی تہذیبوں کی پناہ گاہ | یہی ایک حقیقت نہیں کہ اسلام غیر اسلامی تہذیبوں کے معاملہ میں انتہائی روادارانہ رویہ اپناتا ہے بلکہ یہ بھی مسلّم ہے کہ اسلامی تہذیب نے دوسری تمام تہذیبوں کے لیے بقا اور حیات کا سامان فراہم کیا ہے اور عملاً وہ اس کے لیے پناہ گاہ رہا ہے ایک روسی مستشرق وی، وی، بارتھولڈ نے لکھا ہے:

"قرآن کی پیش کردہ رواداری کی بدولت ان تہذیبوں (کثیر التعداد اور مختلف المزاج تہذیبی عناصر) کو اسلامی اقتدار کے زیر سایہ پھلنے پھولنے کا اس سے زیادہ موقع حاصل تھا جتنا کہ بازنطینی قیاصرہ کے زیر حکومت رہ کر انھیں ملتا"[1]

صلیبی جنگیں | رواداری کا یہ تقابلی اور تاریخی مطالعہ ہمیں صلیبی جنگوں اور ان کے اثرات کا تذکرہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ جنگیں اسلام اور مسیحیت کے مابین انتہائی فیصلہ کن اور تاریخی رہی ہیں۔ ان جنگوں نے عالمی تاریخ پر بڑے گہرے اور اثرات مرتب کیے ہیں اور ان میں مسلمان اور مسیحی اقوام دونوں کا جذبہ و جوش اپنی انتہا پر نظر آتا ہے۔ مگر کشت و خون کے ان ہنگامی حالات میں بھی مسلمانوں نے رواداری کا وہ ثبوت دیا ہے کہ دور دور تک اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس کے برعکس جنونی صلیبیوں کے اندھے تعصب کا تذکرہ کرتے ہوئے خود ایک یورپی مصنف نے لکھا ہے:

اورنگ زیبؒ کی رواداری | غیر مسلم قومیں اورنگ زیب عالمگیرؒ کو ایک متعصب اور خود پرست فرماں روا کی حیثیت سے جانتی ہیں۔ لیکن ان کی رواداری سے کم ہی لوگوں کو واقفیت ہے۔

---

[1] مسلمانوں کی تہذیب ص ۳۵

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے لکھا ہے۔ "اورنگ زیب عالمگیرؒ ایسے متقشف اور متصلب فی الدین فرماں روا کے شاہی خزانہ سے مندروں کے لیے باقاعدہ گھی اور تیل مہیا کیا جاتا تھا۔ اور مندروں کے پجاریوں اور پنڈتوں کے لیے ماہانہ وظیفے اور روزینے مقرر تھے۔ چند سال ہوئے صرف ایک شہر اجین سے عالمگیر کے ایسے چالیس فرمان دستیاب ہوئے۔ تھے جن میں وہاں کے مہنتوں اور پنڈتوں کو جاگیریں عطا کی گئی تھیں" (نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت ص۵ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

"وہ عربوں کو اونچے اونچے برجوں اور عمارتوں کے اوپر لے جاکر نیچے گرادیتے تھے۔ ان کو آگ میں جلاتے تھے، قبوں اور تہ خانوں سے نکال کر میدانوں میں گھسیٹتے تھے اور لاشوں کے ڈھیر پر لے جاکر قتل کر دیتے تھے"۔ کئی ہفتوں تک مسلمانوں کا یہ قتل عام جاری رہا، جس میں مشرقی اور مغربی مورخین کے متفقہ بیان کے مطابق ستر ہزار مسلمان مارے گئے"، اور یہودی بھی اس قتل عام سے نہ بچ سکے۔ انھوں نے جس مقدس مذبح میں پناہ لی تھی اس میں صلیبیوں نے آگ لگادی اور کل کے کل یہودی جل کر خاکستر ہو گئے۔[۱]

لیکن جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۵۸۳ھ میں بیت المقدس کو آزاد کرایا تو اس وقت یہاں ایک لاکھ صلیبی جنگ جو موجود تھے۔ ان میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ ساٹھ ہزار سوار اور پیادہ سپاہی تھے۔ سلطان نے کسی سے انتقام نہ لیا۔ بلکہ ان کے گرجوں کی دولت وثروت سے بھی تعرض نہ کیا۔ اس کے باوجود رچرڈ شیر دل نے سلطان سے تاوان اور صلیب الصلبوت طلب کیا اور سلطان نے اسے واپس نہیں کیا تو رچرڈ نے دو ہزار سات سو نو مسلمان قیدیوں کو عکا میں راس تل کے پاس سلطان صلاح الدین کی فوج کے سامنے قتل کر دیا۔[۲]

یہ اسلامی تہذیب کی رواداری اور غیر اسلامی تہذیب کی بربریت وسفاکی کا بہترین نمونہ ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[۱] تاریخ محاربات صلیبی لینتو۔ بحوالہ اسلام اور عربی تمدن ص۳۱۶

بقیہ : نظرات

رسالہ برہان زیر ادارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی پابندی سے نکل رہا ہے مکتبۂ برہان کے کام، کتابوں کی کتابت و طباعت اور اشاعت کا سلسلہ بھی الحمدللہ جاری ہے۔ تمام معاونین ادارہ سے درخواست ہے کہ وہ برادر موصوف کے ساتھ تعاون فرمائیں تاکہ بڑھتی ہوئی گرانی کے اس دور میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ان علمی کاموں کو جاری رکھا جا سکے جو درحقیقت ملت اسلامیہ کی ایک بنیادی اور ٹھوس دینی وملی خدمت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک اعلان

ماہنامہ رسالہ برہان اور ندوۃ المصنفین کے خطوط کے جوابات پچھلے دنوں نہیں دیئے گئے۔ آپ کے خطوط برابر مل رہے تھے۔ آپ منتظر بھی رہے ہوں گے کہ برہان دفتر سے خط کا جواب کیوں نہیں ملا۔ اُن دنوں ادارہ ندوۃ المصنفین کے ناظم حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی طویل علالت اور اُن کی وفات کے بعد جن حالات سے دوچار ہونا پڑا اس کی خاص وجہ یہی ہے۔

ویسے دفتر کے دیگر کام بھی ہوئے مگر بدنظمی پھر بھی رہی اور ابھی بھی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کو کنٹرول کر کے دفتری نظام کو درست کیا جائے گا۔ جن حضرات کو زحمت ہوئی ہیں ان سے معذرت خواہ ہوں۔

آپ کا

عمید الرحمٰن عثمانی

جنرل منیجر ندوۃ المصنفین و مکتبہ برہان دہلی

جب تک خریداران رسالہ برہان وسلسلہ ممبران ومختلف ایجنسیوں کو یاددہانیاں یہاں سے نہیں جارہی ہیں اور ان کا واجب الادا حساب بن کر نہیں جارہا ہے اس وقت تک آپ ہماری یہ مدد فرمائیں کہ از خود ہی اپنا حساب چیک کر کے ہم کو مناسب ذرائع سے ارسال کریں۔ بذریعہ منی آرڈر اور چیک سے رقمیں روانہ فرمائیں۔ آپ کی نوازش ہوگی۔

الحمدللہ ادارہ ندوۃ المصنفین اور مکتبہ برہان اپنی ترقی کی سرگرمیوں میں پرجوش طریقہ پر مصروف ہیں۔ آپ کی دعا اور تعاون اس سلسلے میں درکار ہے۔

عمید الرحمٰن عثمانی

منیجر رسالہ برہان دہلی

دعائے صحت

پچھلے مہینہ کے رسالہ برہان میں حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر رسالہ برہان کی علالت کی اطلاع دی گئی تھی۔ خدا کے فضل سے مولانا کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے اور اسپتال سے تشریف لے آئے ہیں۔ موصوف یرقان (پیلیے کی بیماری) میں مبتلا ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی سے توقع ہے کہ آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تا دیر قائم رہے۔ (آمین)

قارئین برہان اور اس ادارہ سے تعلق رکھنے والے حضرات سے میں دعائے صحت کی درخواست کرتا ہوں

عمید الرحمٰن عثمانی
پرنٹر و پبلشر و مینیجر
رسالہ برہان دہلی

بیان ملکیت و تفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ ۸

۱۔	مقامِ اشاعت	اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶
۲۔	وقفۂ اشاعت	ماہانہ
۳۔	طابع کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
	قومیت	ہندوستانی
۴۔	ناشر کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
	سکونت	۱۴۳۶، اردو بازار، دہلی ۶
۵۔	ایڈیٹر کا نام	مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے
	قومیت	ہندوستانی
	سکونت	نزد بال برادری سول لائن علی گڑھ (یوپی)
۶۔	ملکیت	ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی ۶

میں عمید الرحمٰن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع و ناشر

عمید الرحمٰن عثمانی

برہان

ایڈیٹر
سعید احمد اکبر آبادی

معاون ایڈیٹر
عمید الرحمن عثمانی

سالانہ چندہ
چالیس روپیے

قیمت فی پرچہ
تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۵ | شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ مطابق اپریل ۱۹۸۵ء | شمارہ ۴

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

(محمد اظہر صدیقی)

افسوس ہے کہ ۲۷ مارچ کو حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح کی اہلیہ محترمہ راقم الحروف کی خالہ اماں ــــ ہم سب کو داغِ مفارقت دے گئیں اس طرح ایک ہی خاندان کے تین افراد دس ماہ کے اندر اندر اس دنیا سے رخصت ہو کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے سب سے پہلے گذشتہ سال ۱۰ مئی کو احقر کی والدہ محترمہ کے سایہ عاطفت سے ہم محروم ہوئے اس کے ۲ دن بعد حضرت مفتی صاحب رح داغِ مفارقت دے گئے اور اب مرحومہ ــــ خالہ اماں بھی رخصت ہوگئیں

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یوں تو مرحومہ گذشتہ اٹھارہ (۱۸) سال سے علیل تھیں تقریباً ۱۲ سال سے قطعی طور پر صاحبِ فراش اور شدید تکالیف میں مبتلا تھیں اُن کی زندگی کا ہر سانس کربناکیوں اور حرماں نصیبیوں کا صبر آزما امتحان اور آزمائش کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا خود مرحومہ برسہا برس سے صحت و شفا، طاقت و توانائی کے بجائے ایمان پر خاتمہ کی دُعا کرنے کی ہر چھوٹے بڑے سے خواہش فرماتی تھیں حالانکہ حضرت مفتی صاحب رح نے مرحومہ کا ہر ممکن طریقہ پر علاج کرایا دُور دُور سے ڈاکٹروں کو بلا کر دکھایا اور ان کی رائے سے قیمتی سے قیمتی علاج کرایا۔ مگر اللہ کی مرضی ــــــــ !؟ اس وقت تو یہ دُنیا

اس کی ساری ہما ہمی اور ساری بھاگ دوڑ ایک بے معنی سی بات لگتی ہے۔ حالانکہ خوب معلوم ہے کہ موت کا ذائقہ ہر ایک کو ضرور چکھنا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ع

مشیّت ہیں مجالِ دم زدن توبہ، معاذ اللہ ---

مرحومہ قدیم وضع داریوں، بیدگانہ شفقت وعنایت غربا پروری اقربا نوازی ہمدردی وغم گساری اور اس کے ساتھ قربانی و ایثار عزم و حوصلہ جذبہ انسانی شرافت و پاکبازی و وفاشعاری کی ایسی تصویر اور اعلیٰ اوصاف ستھرا اور پاکیزہ نمونہ تھیں جن سے دنیا خالی ہوتی جارہی ہے وہ قدریں اب یہ بزرگ خواتین اپنے ساتھ لیجا رہی ہیں جو قدیم مشرقی تہذیب کی جان اور قلب و روح کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کے نمونے اب نگاہوں سے اوجھل ہوتے جارہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم --- ان کی اولاد اور اہلِ خاندان ہی نہیں --- بلکہ ہر وہ انسان، ان کا غم محسوس کر رہا ہے جسے ان کی ذات سے کچھ نہ کچھ واقفیت تھی ہم تو قدرتی طور پر یہی محسوس کر رہے ہیں کہ۔ ایک ایسی نورانی کڑی ٹوٹ گئی، جو ماضی کے نقوش کی قیمتی یادگار تھی وہ شمع بجھ گئی وہ جو گذشتہ ۶۷ سال سے حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کی گرانقدر علمی دینی سماجی اور ملکی دملی خدمات کی راہوں کو روشن کرتی تھی ایک بزرگ دانشمند خاتون جو خلوص، صداقت سلیقہ اور ہوشمندی ہمت و حوصلہ کے ساتھ حضرت مفتی صاحب کو نہ صرف گھر کے اندر کے امور، اولاد کی دیکھ بھال گھر کے تمام نظم و ضبط ہی سنبھالے ہوئے نہیں تھیں بلکہ جب تک ان کی شدید علالت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا حضرت مفتی صاحب کے ادارہ ندوۃ المصنفین کے انتظامی معاملات میں بھی ان کی معاونت کرتی تھیں۔

عرصۂ دراز سے انھوں نے طویل، پریشان کن اور صبر آزما علالت کی کرب ناکیوں کو جس طرح برداشت کیا امراض کی مسلسل یورش، ضعف و نقاہت اور پھر معذوری اللہ کی دی ہوئی توفیق سے ان کی صاحبزادی (راقم الحروف کی اہلیہ) نے جس طرح اس طویل

عرصہ میں شب و روز ان کی خدمت و تیمارداری کی وہ بھی اک مثالی کردار ہے اس مثالی خاتون کی بیٹی کا جو مفتی اعظم، عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رح کی فیضیافتہ اور حضرت مفکر ملت رح جیسے دردمند ملی رہنما کی شریکِ حیات تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ساری تکلیفوں، ساری اذیتوں اور پریشانیوں کو مرحومہ کے لئے آخرت کی بہترین نعمتوں کا ذریعہ بنائے اپنا قرب عطا فرمائے اور ان کی صاحبزادی کی ساری خدمات قبول فرما کر دین و دنیا میں سکون و راحت اور عافیت و سربلندی کا ذریعہ بنادے۔ اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو نوازے۔ آمین

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ خالہ اماں مرحومہ جو ہمیشہ سے صوم و صلوٰۃ کی پابند اور دعاؤں کا خاص اہتمام کرنے والی خاتون تھیں، آخری وقت میں بھی کمی زبان سے اللہ کا ذکر مسلسل کر رہی تھیں، بے ہوشی اور حد سے زیادہ نقاہت و کمزوری کے باوجود ان کی زبان پر اللہ کا نام آتا رہتا تھا آخری وقت میں راقم الحروف صبح بعد نماز فجر سے ان کے پاس بیٹھ کر کسی قدر بلند آواز سے کلمۂ طیبہ کا ورد کر رہا تھا طبیعت پر رقت کا عالم اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ مقدس و محترم خاتون اب رخصت ہو رہی تھیں جن کی شفقت و عنایت نے خود اس گنہ گار کو زندگی کے ہر موڑ پر نوازا تھا سہارا دیا تھا اسی عالم میں دیکھا کہ مرحومہ کو کچھ سکون سا ہونے لگا ہے، زبان کو حرکت ہوئی جیسے دو بار اللہ۔ اللہ کہہ رہی ہوں چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوئی اور پھر خود بخود منہ بند کر لیا قریب میں کھڑے ہوئے برادر عزیز عمید الرحمٰن کی چیخ نکل گئی ان کی ہمشیرہ نے ان کو صبر کی تلقین کی اور ان کو سنبھالا۔

اتنی تکلیفوں، اذیتوں اور کربناکیوں کے طویل سلسلہ کے بعد اس دنیا سے ان کا رخصت ہونا آخرت میں بلند درجات کی قوی امید دلاتا ہے حضور اقدس صلعم کے یہ ارشادات گرامی بھی دل، دماغ اور روح کے لئے مشعلِ راہ بنے ہوئے ہیں کہ ———

"اللہ تعالیٰ کے یہاں آدمی کے لئے کوئی مقام مخصوص ہوتا ہے جب وہ اُسے اعمال کے ذریعہ حاصل نہیں کر پاتا تو پھر اللہ تعالیٰ اُسے ناگواریوں میں مبتلا کرتا ہے یہاں تک کہ اُسے اُس مقام تک پہنچا دیتا ہے" (ابو یعلیٰ ابن حبان) اور حضور اقدس محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کہ :-

"بلاؤں کا شکار سب سے زیادہ انبیائے کرام ہوتے ہیں پھر اس کے بعد وہ جو اُن سے زیادہ قریب ہوں ——" (ترمذی ابن ماجہ)

یہ ارشادات تنگ و تاریک حالات، یاس انگیز اور پریشان کن لمحات میں اُمید اور حوصلہ کی روشنی دکھاتے ہیں کہ اپنے عظیم بزرگوں کی دردناک تکالیف اور ان کی اذیت ناکیاں دونوں جہان کی نعمتیں محسوس ہونے لگتی ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ مرحومہ کی بال بال مغفرت فرمائے اور ہم لوگوں پر اُن کے جو بے شمار احسانات ہیں اُن کا اجرِ عظیم اپنی شانِ عالی کے مطابق عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

ربِ کریم ہم پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے —— آمین

قارئینِ کرام اور حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے حلقہ کے تمام حضرات خصوصاً تمام مدارس دینیہ کے ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ وہ مرحومہ کے لئے ایصالِ ثواب کا بطور خاص اہتمام فرمائیں۔

ماہنامہ برہان کے پرنٹر و پبلیشر اور ادارہ ندوۃ المصنفین کے جنرل منیجر برادر عزیز عمید الرحمٰن - اور ان کی ہمشیرہ جو مرحومہ خالہ اماں صاحبہ اور حضرت مفتی صاحبؒ سے سب سے زیادہ قریب رہے ہیں خاص طور پر بہت ملول اور غمزدہ ہیں۔ عمید میاں پر ادارہ اور گھر کی تمام تر ذمہ داریاں بھی ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ ان دونوں کو بطور خاص اپنے فضل و کرم سے نوازے اور ہر طرح

نصرت و اعانت ان کے شامل حال فرمائے۔ آمین

خوشی کی بات ہے کہ مسٹر راجیو گاندھی کی جواں سال و جواں حوصلہ قیادت جس فیصلہ کُن انداز میں مختلف معاملات میں اقدامات کر رہی ہے اسی کے مطابق انھوں نے ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کے تعطل کو ختم کرنے کے لئے بھی موثر اور مضبوط قدم اٹھایا ہے، وزارتِ خارجہ کے سکریٹری مسٹر بھنڈاری کو پاکستان بھیجا گیا اور اس سے پہلے صدر پاکستان محمد ضیاء الحق سے مسٹر گاندھی دو مرتبہ اپنی ملاقاتوں میں ان دونوں قریبی ہمسایہ ملکوں کے تعلقات کے بارہ میں مفید بات چیت کر چکے تھے ہم جانتے ہیں کہ دونوں ملکوں میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو ان دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کی کشیدگی کو خوشگواری اور خیر سگالی و دوستی میں تبدیل کر دینے کی ہر کوشش کو اندر ہی اندر بلکہ مختلف طریقوں سے ناکام بنا دیتے ہیں یہ مسٹر راجیو گاندھی کی ہمت اور قوتِ فیصلہ کی بات ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس مخصوص دائرہ میں محصور نہیں رکھا اور نفرت، غلط فہمی تلخی اور ناخوشگواریوں کے تپتے ہوئے ریگستان کو دوستی و محبت کے نخلستان میں تبدیل کرنے کی سعی و کوشش شروع کی۔ ہر امن پسند، انسانیت دوست اور برِ اعظم کے کروڑوں عوام کے مستقبل کی تابناکیوں سے دلچسپی رکھنے والے ہر شریف و مہذب انسان کے دل کی دھڑکنیں مسٹر راجیو گاندھی اور صدر ضیاء الحق کی ان کوششوں کی کامیابی کے لئے دُعا گو ہیں جو ہند و پاکستان کے باہمی تعلقات و روابط کی استواری و استحکام کے لئے کی جا رہی ہیں۔ بلا شک و شبہ برِ صغیر ہند و پاک ہی نہیں بلکہ دیگر ایشیائی ملکوں کے مفادات خیر و فلاح اور ترقی کے لئے بھی ان دونوں کے تعلقات کی خوشگواری

خاص اہمیت رکھتی ہے۔

مسٹر بھنڈاری کا پاکستان میں جس گرمجوشی و خلوص کے ساتھ استقبال کیا گیا ہے اور صدر محمد ضیاء الحق وزیر اعظم مسٹر جونیجو اور دوسرے پاکستانی ذمہ داروں سے ان کی گفتگو جس دوستانہ انداز اور خوشگوار ماحول میں ہوئی ہے اس سے یہ توقع قائم ہوتی ہے کہ انشاء اللہ بعض طاقتوں کی معاندانہ کوششوں اور اندرونی و بیرونی عناصر کی مخالفانہ خواہشوں کے برعکس یہ کوششیں کامیاب ہوں گی اور برِ صغیر کے کروڑوں عوام ــــ جو عرصہ سے جہل، فاقہ، بھوک، بیماری، بے روزگاری کا شکار ہیں اطمینان کا سانس لے سکیں گے کیونکہ اس حقیقت سے کوئی ہوشمند انسان انکار نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ملک اپنی تعمیر و ترقی اور اپنے عوام کی بھلائی کے لئے کشیدگی سے پاک ماحول اور پُر امن و خوشگوار فضاؤں میں ہی جد و جہد کر سکتے ہیں اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔

گزشتہ دنوں اُردو کے ادیب و شاعر، اور ملک کی ممتاز عوامی شخصیت جناب محمد عثمان عارف کو یوپی کا گورنر نامزد کیا گیا ہے اس انتخاب پر اس وجہ سے بھی خاص طور پر مسرت ہوئی کہ یوپی جیسے اہم صوبہ کو ایک ایسی شخصیت نصیب ہوئی جو بزرگوں، علمائے کرام دین و دانش کے حلقوں اور علم و ادب کے ایوانوں میں ایک ممتاز، قابلِ احترام اور لائق تعظیم حیثیت رکھتی ہے۔

جناب محمد عثمان عارف نقشبندی کے گورنر کے عہدہ کا حلف لینے کے بعد سب سے پہلے موصوف سے جس وفد نے ملاقات کی وہ اُردو زبان و ادب کے حلقہ سے تعلق رکھنے والے یعنی اُردو ہندی ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے ذمہ داروں پر مشتمل تھا۔

اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یوپی میں اُردو کے مسئلہ کی ایک خاص اہمیت ہے اُمید ہے کہ جناب محمد عثمان عارف کا انتخاب اُردو کے مسئلوں کے حل کے لئے بھی بہت مؤثر ثابت ہوگا اور وہ کروڑوں دلوں کی آواز اور آرزو کی تکمیل کرتے ہوئے اُردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی پوری کوشش کریں گے۔

ہم صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم راجیو گاندھی کو اس بہترین انتخاب پر مبارکباد دیتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ یہ انتخاب ملک کے اس عظیم صوبہ کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے مفید ہو۔ اور گورنر موصوف ایک مثالی و کامیاب گورنر و منتظم ثابت ہوں۔ اور ہمارے ملک کی عزت و نیک نامی اور قومی یکجہتی کے فروغ و استحکام کے لئے بھی یہ انتخاب مفید ثابت ہو۔

ہم جناب عثمان عارف صاحب کو بھی اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہونے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کی خیر و فلاح اور کامیابی کے لئے دست بدعا ہیں۔

(اظہر صدیقی)

قارئین برہان کو علم ہے کہ مدیر برہان حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی آجکل بغرض علاج کراچی (پاکستان) میں مقیم ہیں حق تعالیٰ انکو جلد شفائے کامل عطا فرمائے۔ آپ کی عدم موجودگی میں نظرات کے صفحات پر قارئین کرام کو جو تشنگی محسوس ہو رہی ہوگی ادارہ کو اس کا پورا احساس ہے۔

خالہ اماں صاحبہ کے حادثہ پر بھی عم مکرم ہی تحریر فرمائیں گے کہ ہمارے خاندان کے ایک محترم اور اہم رکن ہیں اور موصوف کو بھی خالہ اماں سے انتہائی گہرا عقیدت مندانہ عمر بھر تعلق رہا ہے۔

اللہ کریم ان حوادث پر ان کو بھی صبر کی توفیق و توانائی بخشے۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ عم مکرم مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی صحت کاملہ عاجلہ مستمرہ کے لئے شافی حقیقی کی بارگاہ میں دُعا فرمائیں۔

اسلام کا خود مکتفی عائلی نظام

(از جناب ڈاکٹر سید معین الدین قادری (حیدرآباد) سابق ریڈر معاشیات جامعہ عثمانیہ)

اسلام کے عائلی قوانین، جن کو بالفاظ دیگر احوال الشخصیہ، احکام فردی یا پرسنل لا کی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا ہے وہ در اصل شریعتِ اسلامیہ کا جزو لاینفک ہیں۔ اس اعتبار سے ان قوانین کی تشریح، ان کی تدوین جدید بلکہ ان کے نفاذ کا طریقہ بھی شرعی حدود کے اندر ہی ہونا چاہیے۔

جب تک مسلم مملکتوں میں اسلامی قانون بطور ملکی لا کے رائج رہا اس وقت تک اس قانونی نظام کے مختلف اجزا کو جزوی انداز پر سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی اور مسلمانوں کے عائلی قوانین اس کل کا ایک جزو ہی سمجھے جاتے رہے اور انھیں کوئی علیحدہ نام بھی نہیں دیا گیا یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی کی قدیم کتابوں میں مسلم پرسنل لا جیسی کوئی اصطلاح ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ یہ مغربی دماغ کی پیداوار ہے۔ البتہ حقوق الزوجین کے ساتھ علم الفرائض "نصف العلم" کی اہمیت کا حامل رہا اور وراثت کا یہ یگانۂ روزگار قانون اقوام و ملل کی تاریخ میں اپنی مثال آپ رہا۔ یہ قانون، درحقیقت، عالم انسانیت کو اسلام کی ایک گراں قدر دین ہے۔ اسلامی پرسنل لا انہی قوانین سے عبارت ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربیت کے غلبہ و تسلط کے دور میں جب یہ آئین اسلامیہ

نے اپنے قانونی نظام کے ایک بڑے حصہ کے انتلاف کو برداشت کرلیا تو کیا وہ ا
اس موقف پر حق بجانب ہوسکتی ہے کہ اسی نظام قانون کے ایک جزو کو بطور ایک د
ورثہ کے اپنے سینہ سے لگائے رکھے اور اس کی صیانت وحفاظت میں اپنی جان کی با
لگادے؟ جواب یقیناً اثبات میں ہے۔ تاریخ کے شواہد ان قوانین سے متعلق سابقہ حکو
کا مسلسل رویہ اور خود ان قوانین کی نوعیت سبھی اس حقیقت کی تاکید کرتے ہیں کہ دنیا کی
قومیت اپنے پرسنل لا کی بقا و برقراری کے لئے کوشاں رہی اور اس کی بدولت د
کی مختلف قومیتوں کے درمیان ان کی امتیازی وحدت باقی و برقرار بھی رہی۔

قوانین اپنی نوعیت میں کتوری ہوں کہ حربی، فوجداری ہوں کہ تجارت
یا بین صوبجاتی، ہوں کہ بین الاقوامی یہ سب حکومت کے وسیع دائرہ
سے تعلق رکھتے ہیں جس میں فرد یا سماج کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے پرسنل لا
عائلی قوانین کا تعلق جیسا کہ ان کے نام ہی سے ظاہر ہے فرد، خاندان اور قبیلہ کی
زندگی سے ہوتا ہے اور اس حیثیت سے ان کی برقراری اور بقا کا انحصار بھی بڑی حد
معاشرہ کی ذمہ داری میں داخل ہے اور حکومتیں عام طور پر اس میں مداخلت نہیں کر
مملکتیں قائم ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں، حکومتیں آتی اور جاتی رہتی ہیں اور اسی طرح
اقتدار بھی تاہر دینہ و آمرانہ رہتا ہے، کبھی کلیت پسند اور جابرانہ ہوتا ہے اور انارکی
دور میں کبھی مجہول رہتا اور کبھی طوائف الملوکی کا شکار ہوجاتا ہے۔ مگر حکومتوں کی اد
الٹ پھیر اقتدار کے عروج و زوال اور زمانہ کے ان تمام تغیرات میں جس چیز کو ثبات
وقرار کا مقام حاصل ہے وہ ہے فرد اور خاندان کا عنصر جو اپنی بقا و برقراری کا انت
اپنے تسلسل کے ذریعہ فراہم کرتا رہتا ہے۔ اپنی چند مخصوص خصوصیات و امتیا
کے ساتھ ایک قومیت کا یہ تاریخی تسلسل رہین منت ہے ان عائلی قوانی
اور اس نظریہ حیات کا جس کو اس سماج کے افراد ایک دینی ورثہ کے طور

سینہ سے لگائے رکھتے اور اس امانت کی صیانت وحفاظت میں اپنی جان و مال کی
بازی لگائے رہتے ہیں۔ یہ دینی ورثہ اور یہ ملی امانت عبارت ہے ان عائلی قوانین
سے جن کو احوال الشخصیہ احکام فردی اور پرسنل لا کی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا
ہے۔

انسانی سماجیات کے نقطۂ نظر سے عائلی زندگی کا دائرہ وسیع تر قومی و بین الاقوامی
زندگی کی ایک ابتدائی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور محدود ہونے کے باوجود بنیادی
اہمیت کا حامل ہے۔ عائلی قوانین عمرانی زندگی کی اسی ابتدائی و بنیادی اکائی سے
تعلق رکھتے ہیں۔ اگر سماجیات کے نقطۂ نظر سے خاندان اور معاشرہ خود مکتفی ہے
اپنے عائلی دائرہ میں خود اختیار ہے اور آئین نے بنیادی حقوق اور قانون کے
انفرادی و مذہبی حقوق کی روشنی میں یک گونہ آزاد ہے تو پھر اس کو اپنے ربانی قوانین
کی متابعت میں اپنے معاشرہ کی تنظیم نو، اپنے شخصی قوانین کی تدوین جدید اور ان
قوانین کی رو سے اپنے مخصوص دینی اداروں کے ذریعہ انصاف رسانی کی آزادی بھی حاصل ہونی چاہیئے
یہ سماجی خود اکتفائیت اور خود مختاری جس کو مغربی اصطلاح میں (social
autonomy) کہتے ہیں وہ مملکت ہند کے تمام ہی باشندوں کا آئینی و پیدائشی حق ہے
ملت اسلامیہ ہند اپنی معاشرتی زندگی کو دین کی استوار بنیادوں پر قائم و برقرار رکھنا چاہتی ہے تو اس
کو ان حقوق اور حصلتوں سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہیئے جو مملکت کے دستور اور ملک کے قانون نے اس
کو عائلی دائرۂ حیات میں مہیا کیے ہیں۔ ایسے اسلامی معاشرہ کا استقرار و استحکام انہی امور پر منحصر
ہے کہ ملت کا ہر فرد ان شرعی قوانین کی اتباع کو اپنا دینی فرض سمجھے اور مسلم
معاشرہ ایسے اداروں کا قیام عمل میں لائے کہ جن کے ذریعہ ملت کے ہر فرد کو اپنے
عائلی مسائل میں شرعی احکام کے مطابق انصاف ملتا ہے۔

جہاں تک کہ قانون کا تعلق ہے شرعی احکام کے مجموعہ میں عائلی قوانین ہی اس

حیثیت کے حامل ہیں جن کو قانون کی اصطلاح میں ملکی قانون سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔
اس کی بنیاد مسلم پرسنل لا شریعت اپلیکیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء ہے جو آزادیٔ ہند سے پہلے
کا ایکٹ ہونے کے باوجود آج بھی اس آزاد مملکت کا ایک مسلمہ قانون ہے۔ اس قانون
کی بقا و استقرار کا تحفظ ہمارا دینی فریضہ، ملی ذمہ داری اور دستوری قانونی حق ہے۔ بحمد اللہ
اس سلسلہ میں ملت کا مزاج بے حد حساس اور اس کا دینی شعور پورے طور پر بیدار ہے
ملی زندگی کا یہی وہ محاذ ہے جس پر ملت کے تمام افراد "بنیان مرصوص" کی طرح صف آرا ہیں۔
ہندوستان کے سیکولر ماحول میں بعض عائلی قوانین کے چلن میں کچھ رکاوٹیں محسوس ہوں یا ان کی
تنفیذ میں دشواریاں پیش آئیں تو ہمیں اس سلسلہ میں حتی الامکان کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ وہ رکاوٹیں
اور ایسی دشواریاں ہماری راہ سے ہٹ جائیں۔ اگر ان مشکلات پر عبور حاصل کرنے کا امکان نظر
نہ آئے تو بعض فروعی مسائل میں تلفیق کے ذریعہ اصلاح و ترمیم کر کے آسانیاں بھی پیدا کی جا سکتی ہیں
چنانچہ قانون انفساخ نکاح ۱۹۳۹ء کی تدوین تلفیق ہی کے ذریعہ عمل میں آئی ہے اور مالکی و شافعی مذاہب
کے مسائل سے اس میں سہولتیں نکالی گئی ہیں اور اس کو موجودہ ماحول کے مطابق بنا لیا گیا ہے۔ یہ علمائے
ہند کا کارنامہ ہے اور "الدین یسر" کی اسپرٹ کے عین مطابق ہے تغیر احکام کی نسبت مجلۃ الاحکام
العدلیۃ میں یہ دفعہ موجود ہے "لاینکر تغیر الاحکام بتغیر الزمان"
ڈاکٹر صبحی محمصانی نے اس میں اتنا اضافہ کیا ہے "لاینکر تغیر الاحکام
وتغیر الامکنۃ والاحوال"۔ وضع قوانین کی نسبت اس فقہی اصول کا ہندوستان
کے موجودہ حالات پر پوری طور پر اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن عائلی قوانین میں فقہی فریم ورک کے اندر
رہتے ہوئے اصلاح و ترمیم کرنا یا ان میں حالاتِ حاضرہ کے مقتضیات کو پیشِ نظر
رکھ کر تدوین جدید کی کوشش کرنا علما، فقہا اور متقی قانون دانوں کا کام ہے۔ اس کام میں
بیرونی مداخلت یا خارجی اثرات کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا قانونی نظام اپنی ماہیت
و ترکیب میں اس قدر لچکدار اور ترقی پذیر ہے کہ زمان و مکان کے اختلافات ہوں یا سیاسی

سماجی اور معاشی ماحول کے اثرات ہوں ان تمام احوال میں وہ اپنے ماننے والوں کی صحیح اور صحت مند تہذیبی خطوط پر رہنمائی و رہبری کرسکتا ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کے مقتضیات اور زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر بحر ظلمات سے بحر الکاہل تک پھیلے ہوئے مسلم ممالک میں مراقش سے انڈونیشیا تک مسلم پرسنل لا کی تدوین جدید کی کامیاب کوششیں کی گئیں اور شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے تلفیق کے ذریعہ ان عائلی قوانین کو مدون کرکے نافذ بھی کردیا گیا ہے۔ سیکولر ممالک میں ہندوستان اور سیلون میں بھی ایسی ہی کامیاب کوششیں کی گئیں اور مروجہ پرسنل لاز اس کی شہادت ہیں۔ عائلی قوانین میں تدوین جدید کی اس تحریک نے جہاں فقہ اسلامی کی تدوین جدید کی راہیں ہموار کردیں وہیں اس سے فقہ کا جمود بھی ٹوٹا اور ادھر مستشرقین کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑا کہ فقہ اسلامی کا تسلسل ابتداء سے آج تک برابر جاری ہے اور یہ نظامِ قانون اپنی قدامت کے باوجود اس قدر جاندار اور بذاتہ قوی ہے کہ ہر زمانہ کے چیلنجس کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

تدوینِ جدید کا مسئلہ تو وضع قوانین سے تعلق رکھتا ہے لیکن دوسرا مسئلہ جو راست طور پر اسلامی قانون سے متعلق ہے وہ انصاف رسانی کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ مختلف ممالک کے سیاسی، معاشی اور سماجی سیٹ اپ میں مختلف الجھنوں میں پھنس جاتا ہے جس کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں مشکل مسائل رونما ہونے لگتے ہیں۔

مسلم ممالک میں عدلیہ کا کام مسلمانوں کے زیر انصرام ہے اور انصاف رسانی کی خدمات بھی مسلم ججس ہی کے ذریعہ جاری رہتی ہیں۔ اس لئے ان ممالک میں قضائے قاضی کا مسئلہ بھی پیدا ہی نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے سیکولر ممالک میں جہاں غیر مسلم باشندوں کی اکثریت ہے عدلیہ کا ماحول ایسا نہیں ہے۔ عدلیہ کے دروازے تو مملکت کے تمام ہی باشندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں اور انصاف رسانی کی خدمات بھی بلا امتیاز مذہب و ملت انہی ممالک کے ججس کے تفویض ہے۔ ان میں ہندو بھی ہیں مسلم بھی اور پارسی سکھ

عیسائی بھی۔ ملک کا سیکولر ماحول مذہبی تفرقوں اور فرقہ وارانہ امتیازات کا روادار نہیں۔ اس کی نظر میں سبھی مجبس ایک ہی معیار و اعتبار کے حامل ہیں۔ مساوات کا یہ معیار جمہوری اور عام تہذیبی زاویۂ نگاہ سے بھلا بھی معلوم ہوتا ہے اور بادی النظر میں اس میں کوئی قابل اعتراض بات نظر بھی نہیں آتی لیکن اسی مسئلہ پر جب ہم دینی زاویوں سے نظر ڈالتے ہیں تو مختلف ٹیکنیکل مسائل اُبھر کر نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ نظام قانون کے اختلاف قوانین کی نوعیت کے فرق اور فریق مقدمہ کے تہذیبی مزاج کی کیفیات کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو انصاف رسانی میں شخصیات کی اہمیت کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس مسئلہ پر لارڈ میکالے کی عالمانہ تنقید کے ایک اقتباس کے مطالعہ سے اس امر کی وضاحت ہو جائے گی کہ انصاف رسانی میں شخصیات کو کیا اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ۱۸۳۴ء میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے پرسنل لا کی تدوین کی تحریک کرتے ہوئے گورنر جنرل کے فسٹ لا ممبر میکالے نے کمیشن کے قیام کے لئے اس طرح اظہار خیال کیا تھا:-

"اگر ہندو قانون کا کوئی مسئلہ رونما ہوتا ہے تو جج کو کسی پنڈت سے مشورہ کرنا پڑتا ہے اور اگر اسلامی قانون کے کسی مسئلہ سے سابقہ پڑتا ہے تو جج مفتی کے فتوے کا محتاج رہتا ہے۔ مذہبی قوانین کی تاویلات میں غلطیوں کے احتمال کو بدگمانی پر محمول کرتے ہوئے نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس مسئلہ میں اشکال کی ایک دوسری صورت یہ نظر آتی ہے کہ یہ مشیر قانونی قانون کے جن ذرائع سے اپنی تاویلات پیش کرتے ہیں وہ ماخذ اس قدر منتشر حالت میں پائے جاتے ہیں کہ کسی جج کا ان مشیروں کی اصابت رائے پر بھروسہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ نہ تو جج ہی کو اس کا قطعی علم ہوتا ہے کہ وہ کس قانون کی بنا پر انصاف رسانی کی خدمت انجام دے رہا ہے نہ ہی مقدمہ کے فریقین کو اس امر کا تشفی بخش طریقہ پر یقین ہو سکتا ہے کہ کس قانون کی بنیاد پر ان کے مقدمہ کا فیصلہ

صادر ہوا۔"

لارڈ میکالے کی اس تجویز سے کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے اراکین نے اختلاف کیا اور ان کے مصلحت آمیز اختلاف کے باعث مسلم پرسنل لا کو مدون کرنے کی پہلی تجویز نامنظور ہوئی ورنہ ڈیڑھ صدی پہلے ہی ان قوانین کی تدوین کا کام مکمل ہوگیا ہوتا۔

تجویز کی ناکامی کے قطع نظر جو سبب اس تجویز کو پیش کرنے کا محرک بنا وہ ہماری نظر میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ وہ سبب میکالے جیسے قانون داں کی طرف سے اس امر کا اعتراف ہے کہ ایک غیر مسلم جج جو اسلامی قانون کے رموز و اسرار کا علم نہیں رکھتا اور جس کو شریعت کے مزاج سے مس نہیں ہوتا وہ مسلمانوں کے مقدمات میں انصاف رسانی کی خدمات کما حقہ انجام نہیں دے سکتا۔ لارڈ میکالے جیسے ماہر قانون کی یہ رائے کہ مسلمانوں کی باہمی نزاعات میں ایک غیر مسلم جج شرعی انداز پر صحیح فیصلہ دینے کا اہل نہیں ہوتا، گویا اس امر کی عقلی اور حقیقت پسندانہ توجیہہ ہے جس کو فقہ اربعہ کے ائمہ نے متفقہ طور پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"لِاَنَّ الْکَافِرَ لَیْسَ بِاَھْلِ الْقَضَاءِ عَلَی الْمُسْلِمِ" درمختار نے اس پر ائمہ کرام کے اجماع کی بھی صراحت کردی ہے "کما صرح فی جمیع کتب الفقہ" چونکہ اس مسئلہ پر فقہائے متقدمین و متاخرین کا اتفاق ہے اور عصر حاضر کے علماء بھی اس کی مصلحتوں سے پوری طور پر متفق ہیں اس لئے اس حکم پر گویا سبھی کا اجماع ہے۔

اس اعتبار سے فصل مقدمات کے مسئلہ میں اس حکم سے اختلاف کرتے ہوئے غیر مسلم کو دینی مسائل میں انفصال مقدمات کا اختیار دینے کی تائید کرنا گویا ھدم دین کے لئے دروازہ کھولنا ہے۔

ایک طرف تو فقہ کا یہ حکم ہے جس سے مسلمان انحراف نہیں کرسکتے اور دوسری طرف دیار ہند میں عدلیہ کا ایسا نظام برسر کار ہے جس میں بیشتر صورتوں میں انصاف رسانی

کی خدمات غیر مسلم جج کے ہاتھ میں ہیں اور مزید برآں ملک میں دارالقضاء کی عدم موجودگی اور قضائے شرعی کے فقدان کے باعث مسلمانوں کو شرعی انداز پر انصاف حاصل کرنے کا کوئی متبادل دینی ادارہ منظم شکل میں موجود بھی نہیں۔ ان حالات سے مجبور ہو کر اگر کوئی مسلمان اپنا مقدمہ اس توقع کے ساتھ ان سیکولر عدالتوں میں دائر کرے کہ اس کو یہاں سے کم از کم مسلم پرسنل لا کے مطابق فیصلہ مل جائے گا تو ہو سکتا ہے کہ یہاں کے فاضل جج مسلم فریقین کے مقدمہ کا فیصلہ ان کے پرسنل لا کے مطابق دینے میں کامیاب بھی ہو جائیں لیکن باایں ہمہ احتیاط، سیکولر عدالت کے فیصلہ میں مذکورہ بالا فقہی حکم کی رُو سے یہ سقم بہر حال رہ جائے گا کہ جج کے غیر مسلم ہونے کی بنا پر ان کا عدالتی فیصلہ قانوناً تو نافذ ہو جائیگا لیکن مسلم فریقین پر شرعاً اس کا نفاذ عمل میں نہ آئے گا۔

مروّجہ سیکولر عدالتوں کے غیر مسلم جج کے فیصلوں کے قانونی نفاذ اور دینی مسائل میں ان کے احکام کے عدم نفاذ کے اختلاف سے مسلمانوں کی عملی زندگی پر دور رس اثرات مُرتب ہوتے ہیں۔ مسلم فریقین اپنے مقدمہ میں عدالتی فیصلہ حاصل کرنے کے باوجود شرعاً اس پر عمل پیرا نہ ہو سکیں گے۔ اگر شرعی احکام سے سرتابی کے مرتکب ہوں تو وہ معصیت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ مثلاً خلع کے مقدمہ میں انفساخ نکاح کا فیصلہ کرتے ہیں کسی عورت کو عدالت میں کامیابی بھی ہو جائے تو وہ غیر مسلم جج کے اس فیصلہ کے باوجود عقدِ ثانی کی یوں مجاز نہ ہو گی کہ اس فیصلہ کے شرعاً عدم نفاذ کی بنا پر وہ تاہنوز اپنے پہلے شوہر ہی کے عقدِ نکاح میں بندھی ہوئی متصور ہو گی۔ اگر وہ شرعی احکام سے انحراف کرتے ہوئے عقدِ ثانی کی جرأت کر بیٹھے تو اس کی یہ جسارت معصیت قرار پائے گی اس کا عقد منعقد نہ ہو گا اور اس کی اولاد ناجائز قرار دی جائے گی اور وہ وراثت سے محروم کر دی جائے گی۔ یہ بڑا سماجی المیہ ہو گا۔

سیکولر ہندوستان کے موجودہ ماحول میں دارالقضاء کی عدم موجودگی اور قضائے

شرعی کے فقدان سے عائلی زندگی کی نزاعات میں ایسی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں کہ جن کو "حرج" کی کیفیات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن قرآن نے دینی معاملات میں "حرج" کی صریحاً نفی کی ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ط (الحج ۲۲: ۷۸)

"تمہارے لئے دین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی ہے"۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو ایسے حالات سے سب سے پہلے اس وقت سابقہ پڑا جبکہ انگریزی دورِ حکومت میں گورنر جنرل کے حکم سے ۱۸۶۴ء میں دار القضاء کی موقوفی عمل میں آئی اور تمام نوعیت کے مقدمات کو ان کی قائم کردہ سیکولر عدالتوں سے رجوع کرنے کے احکام نافذ ہوئے۔ جب ہندوستانی باشندوں نے انگریز حکام کے ان احکام کے خلاف احتجاج کیا تو انھوں نے اپنی عدالتوں میں مسلمانوں کے لئے مفتی اور ہندوؤں کے لئے پنڈت مشیروں کا تقرر کیا تاکہ متعلقہ فرقوں کے مقدمات کی سماعت میں ان سے مشورہ کیا جاسکے۔ کچھ عرصہ بعد یہ طریقہ بھی موقوف کر دیا گیا اور اس وقت سے تمام باشندگانِ مملکت کو حصولِ انصاف کے لئے بلا امتیاز مذہب و ملت سول کورٹس کے فیصلوں کا پابند کر دیا گیا۔ گویا اس وقت سے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قضائے شرعی کے فقدان کا مسئلہ پیدا ہوگیا اور مسلمانوں کے عائلی قوانین بڑی حد تک مفلوج ہو کر رہ گئے اور ایک عرصۂ دراز سے مسلم معاشرہ طرح طرح کی بدعنوانیوں کو بھگتتا چلا آرہا ہے اور شرعی ڈھیل سے فائدہ اٹھا کر مختلف اجنبی رسوم و رواج اور غیر اسلامی ثقافت نہیں بلکہ "ہندلیمانی" تہذیب ہے جو مرکب ہے ہندو مسلم تہذیب کا۔

ملتِ اسلامیہ کو جب پہلے پہل ایسے مسائل سے سابقہ پڑا تو انھوں نے مرکزیت ختم ہوجانے کے باعث اپنی خاندانی نزاعات کو نجی طور پر تحکیم اور ثالثی کے ذریعہ طے کرنے کا طریقہ اختیار کیا اور اپنے عائلی مسائل کو سول کورٹس سے رجوع کرنے

سے احتراز و گریز کرتے رہے لیکن موجودہ دور میں یہی مسائل گوناگوں اسباب کی وجہ سے بڑی پیچیدہ اور مشکل شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ان اسباب میں آبادی کا تیز رفتار اضافہ، روزگار کے لئے داخلی و خارجی تو طن کے مواقع، غیر کفو میں شادیوں کا بڑھتا ہوا رواج اور مغربی تہذیب سے متاثر موجودہ نسل کا اخلاقی انحطاط بڑی حد تک ان مسائل کو اُبھارنے کے ذمہ دار ہیں۔ امریکہ اور ولایات فرنگ کے متوطن تو ان مسائل کو پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے ہی لیکن کچھ تھوڑے عرصہ سے مغربی ایشیا میں متلاشیانِ روزگار کا ایک وسیع نوجوان طبقہ بھی ان میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ تو اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ ملک کے محدود ذرائع روزگار کی بڑھتی ہوئی تنگیوں کے ساتھ بیرونی ممالک کے مواقع وسیع سے وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مختلف ولایات میں متوطن شہریوں کی زندگی گذار رہا ہے۔ ان میں سبھی تو نہیں لیکن چند غیر ذمہ دار اشخاص ایسے بھی پائے گئے جنھوں نے بہتر ذرائع روزگار حاصل ہونے کے بعد وہیں پر اقامت اختیار کر لی اور وہیں کی عورتوں سے عقد ثانی بھی کر لیا اور یہاں کی سابقہ بیویوں کو یونہی معلق چھوڑ دیا۔ ان میں سے بعض اپنی بیویوں کے نان نفقہ کا بندوبست کر کے جاتے ہیں، بعض خبر گیری بھی نہیں کرتے اور چند ایسے بھی ہوتے ہیں جو مفقود الخبر ہو جاتے ہیں۔

ولایت کے متوطن اشخاص کی مفقود الخبری تو ایک دیرینہ مسئلہ تھا ہی لیکن کچھ عرصہ سے اس سلسلہ میں ایک نیا مسئلہ رونما ہوا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ مغربی ایشیا کے بعض متمول لوگ یہاں کی عورتوں سے شادی بیاہ کے تعلقات پیدا کر رہے ہیں اس سے یہاں کے غریب طبقہ کی عورتوں کو بڑا سہارا مل رہا ہے اور ان طبقات میں فراخی اور خوش حالی کے آثار بھی نظر آ رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر مرد اپنی نئی بیویوں کو اپنے ساتھ وطن لے جاتے ہیں اور بعض ان کے نان و نفقہ کا پورا انتظام کر کے اپنے وطن

آتے جاتے رہتے ہیں لیکن ان میں سے چند ایسے بھی غیر ذمہ دار ہوتے ہیں جو جھوٹے وعدے کر کے اپنے وطن چلتے اور مفقود الخبر ہو جاتے ہیں اور ان کی بیویاں یہاں معلق زندگی گزارتی رہتی ہیں۔ ان آفاقیوں کے آفریدہ مسائل سے کہیں زیادہ تکلیف دہ مسئلہ ملک ہی کے ان غیر ذمہ دار افراد کا پیدا کردہ مسئلہ ہے جو یہیں کہیں چھپ چھپا کر مفقود الخبر غائب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے افراد کی بھی ملک میں کمی نہیں جو صاحب اولاد ہونے کے باوجود عقد ثانی کر کے اپنی نئی بیویوں کے ساتھ وابستہ رہ جاتے ہیں اور سابقہ بیویوں کو معلق چھوڑ دیتے ہیں۔ عورتوں کی تعلیق کا مسئلہ قرآن کی نص صریح کے خلاف ہے:۔

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ

(۴: ۱۲۹) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔

علاوہ ازیں ہماری عائلی زندگی میں کتنی ہی ایسی نزاعات ہیں جو امراض کہنہ کی طرح پرورش پاتی رہتی ہیں جن کے وجود سے انس و محبت کے کتنے ہی گہوارے باہمی جھگڑے کے اکھاڑوں میں تبدیل ہو جاتے اور بغض و عناد کے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ زن و شو کے مابین مناقشات دیرپا شکل اختیار کر لیں اور منافرت و نااتفاقیوں کے جذبات مستقل اسباب کا نتیجہ ہوں تو ان کا اظہار اور ان پر اصرار عائلی زندگی کے غایات کے منافی ثابت ہوتا ہے اور مناکحت کا مقصدی - Purpose (Sense) ادارہ ایسی ناخوشگوار فضا میں پھل پھول نہیں سکتا۔ محبت سے عاری اور تعاون سے خالی جو ماحول ہوگا وہ ملت کو نیک اور صالح افراد فراہم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک عظیم خسارہ ہے جس کو ایک عرصہ دراز سے ملت اسلامیہ برداشت کرتی چلی آرہی ہے۔ اسلامی نظام حیات کی لطافتیں بغض و عناد اور مناقشہ و منافرت کی کثافتوں کو برداشت کرنے کی روادار نہیں ہیں۔ اسلامی ذہن

کی عائلی زندگی کو اللہ کی رحمتوں کی آماجگاہ بنائے رکھنے کے لئے قرآن کا اِلَّا یُقِیمَا حُدُودَ اللّٰہِ پر بار بار اصرار اور خاندان کی فضا کو پاکیزہ اور مروت آمیز رکھنے اور زن وشو کے ازدواجی تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے وَأْتَمِرُوا بِالْمَعْرُوفِ اور وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ کی تلقین اسی مقصد کی تکمیل کے لئے ہے کہ زندگی کی گاڑی بردباری اور عفو و درگذر کے سہارے چلتی رہے اور اس میں رکاوٹ کے اندیشے پیدا ہو جائیں تو تحکیم کے ذریعہ مصالحت کی کوششیں جاری رہیں۔ یہ سب نصیحتیں اسی امر کی طرف ایمائی رجحان ظاہر کر رہی ہیں کہ انس و محبت کا یہ مسکن تادیر قائم رہے اور تناسل و حفظِ نسل کی اعلیٰ انسانی ذمہ داریاں بطریقِ احسن جاری رہیں اور اُمت کے لئے باعثِ برکت بنی رہیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر شریعت نے عقد مناکحت کو عہد واثق قرار دیا ہے اور اس کی تلقینات کا تمام تر میلان اسی جانب ہے کہ عمرانی زندگی کا یہ بنیادی ادارہ استقامت و استمرار کے تصورات کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہے۔ اگر کسی وجہ سے زوجین کے مابین کشیدگی کے تعلقات شدت اختیار کر لیں اور مصالحت کی ساری کوششیں بے فیض ثابت ہوں اور ان کے یونہی باقی رہنے کی صورت میں حدود اللہ سے شکست و ریخت کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ایسے تعلقات کو ختم کر دینا ان کو باقی رکھنے سے کہیں بہتر ہے۔ جمیلہ بنتِ ابی بن سلول کا قول اس سلسلہ میں بہت بلیغ ہے جب اس نے اپنے شوہر ثابت رضؓ بن قیس سے خلع لینے کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں کہا تھا کہ نہ مجھے قیس کے دین میں فتور نظر آتا ہے نہ اس کے برتاؤ میں کوئی قصور لیکن مجھے اس کے ساتھ زندگی بتانے میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں معصیتوں میں گرفتار ہو کر حدود اللہ کو توڑنے کا باعث نہ بن جاؤں۔ اس وقت اس نے یہ بلیغ جملہ کہا تھا:

لٰکِنِّیْ اَکْرَہُ الْکُفْرَ فِی الْاِسْلَامِ۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدمہ کی روداد سنی اور جمیلہ سے دریافت فرمایا کہ کیا وہ خلع کے معاوضہ میں قیس کے اس باغ کو واپس کردے گی جو قیس نے اس کو دیا تھا۔ اس نے کہا کہ فدیہ میں اس سے کچھ زیادہ کا بھی مطالبہ ہو تو وہ دینے کو تیار ہے۔ آپ نے اس رضامندی پر بس اتنا فرمایا کہ مزید کچھ اور دینے کی ضرورت نہیں اور قیس سے فرمایا کہ وہ خلع پر اپنی طرف سے طلاق دے دے۔ یہ فقہ اسلامی کی تاریخ میں خلع کا پہلا مقدمہ تھا اور پوری اسلامی سادگی سے حضورؐ کی عدالت سے اس پر فیصلہ صادر ہوا گویا یہ عملی تفسیر تھی اس نصِ صریح کی جو اس مسئلہ کی نسبت نازل ہوئی ہے:-

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ (البقرۃ ۲: ۲۲۹) [لہ]

اسلام کی نظر میں سماج کا جو تصور ہے اس کے تقدس کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اس نے طلاق و خلع کے سلسلہ میں استعمال کیے ہیں۔ اللہ کی نظر میں ان کو "ابغض المباحات" قرار دیا گیا ہے لیکن اس پچھلے دروازے کو اس لئے کھلا رکھا گیا ہے کہ مجبوری کے وقت ایک ناگزیر برائی کے طور پر اس سے بڑھیا راستہ مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے بکراہیت استعمال کیا جا سکے یہ راستہ جس طرح مردوں کے لئے کھلا ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی کھلا ہے۔ زندگی اللہ کی امانت ہے اور دونوں ہی کے لئے ہے۔ صلاح و فلاح کی پاکیزہ زندگی کو ہلاکت و ہلاکت کے خسران سے محفوظ رکھنے کے لئے شریعت نے دونوں صنف کے افراد کو

لہ ترجمہ: اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ دونوں (یعنی زوجین) حدودِ الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرلے۔

مساوی حقوق عطا کیے ہیں۔

شوہر کو طلاق دینے کا حق عطا کیا گیا اور بیوی کو خلع لینے کا یہاں تک کہ حقوق کا تعلق ہے زوج اور زوجہ کے مابین مساوات رکھی گئی ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ ط لیکن اس حق کے نفاذ کے اختیار (exercise of power) میں چند در چند وجوہ کی بنا پر عورت پر مرد کو یک گونہ برتری عطا کی گئی ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط (۲:۲۲۸) یوں بھی اسلام میں سماجی زندگی کا تصور مادرانہ نہیں بلکہ پدرانہ (Patriarchal system) ہے جس میں قوامیت مرد ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط (۴:۳۴)

ان منصوصات کی رو سے واجبی محرکات کی بنا پر اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو اس کی طلاق نافذ ہو جاتی اور ریکارڈ کر لی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر معقول شرعی وجوہ کی بنا پر عورت خلع لے تو یہ اس وقت تک نہیں پڑتی جب تک کہ اس کا شوہر اس کو منظور کرتے ہوئے اس پر اپنا اختیار طلاق نافذ نہ کرے۔ اگر وہ طلاق دینے سے انکار کر دے تو خلع کا مطالبہ غیر مؤثر ہو کر رہ جاتا ہے اور بیوی عقد کی بندھنوں میں جکڑی ہی رہتی ہے۔ خلع تابع طلاق ہونے کی وجہ سے عورت ایک حد تک مجبور تو ضرور رہتی ہے لیکن شریعت نے اس کو مطلقاً مرد کے رحم وکرم پر چھوڑ نہیں دیا ہے عورت کو شریعت نے یہ مزید حق بھی عطا کیا ہے کہ وہ مرد کے انکار کرنے پر اس کی مرضی پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اس یک طرفہ فیصلے کے خلاف قاضی کی عدالت میں مرافعہ کر سکتی ہے۔ اگر قاضی مدعیہ کے مطالبۂ خلع کی وجہ جواز کو تسلیم کرلے تو وہ حدود اللہ کے تحفظ کے پیشِ نظر شوہر کو طلاق دینے پر مجبور کر سکتا ہے

اور اگر وہ پھر بھی اپنے انکار پر مصر رہے تو اختیار طلاق کو اپنی طرف سے استعمال کر کے انفساخ نکاح کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ قاضی کی طرف سے انفساخ کا حکم صادر ہونے کے بعد بالآخر عورت بھی طلاق کے معاملہ میں بالواسطہ طریق سے مرد کے مساوی حقوق کی حامل ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اختیار نفاذ کے مدارج کا ہے اور مجبوری محض قضائے قاضی کے عدم وجود کی وجہ سے ہے۔ چونکہ قضاء کا ادارہ شرعی قوانین کے نفاذ، فیصلوں کے صدور اور تنازعات کے تصفیہ کا ذریعہ ہے اس لئے اس کی عدم موجودگی سے انصاف کے تمام اہم کاروبار معطل ہو کر رہ جاتے ہیں اور معاشری زندگی کے گوشہ گوشہ میں حرج کی بھیانک صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ معاشرہ میں ایسے سنگین حالات خود مسلمانوں کی کوتاہیوں اور تنگ نظریوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ نتیجہ ہیں خود اسلامی نظام قانون کی کوتاہیوں کا؟

جہاں تک شریعت اسلامیہ کا تعلق ہے اس نے "حرج" کو اسلامی مزاج ہی کے منافی قرار دے دیا ہے۔ اور اس اعتبار سے اسلامی معاشرہ میں اس کے لئے کوئی جگہ ہے ہی نہیں۔ اگر ایسی کیفیات کسی بھی وجہ سے کہیں رونما ہوں تو ان کا ازالہ مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں میں داخل ہے۔ اوامر و نواہی سے متعلق قرآن کے تمام ہی احکام میں قضاء مضمر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس سے اغماض کر جائیں یا اس کے قیام کے سلسلہ میں اپنی کوتاہیوں کے باعث سہل انگاری سے کام لیں۔ اسلامی نظام حیات اپنے ماننے والوں سے جد و جہاد کا طالب ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۲۲ : ۷۸ [1]

---

[1] ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں جان لڑا دو اس کی راہ میں جان لڑا دینے کا جو حق ہے۔ اس نے تمہیں برگزیدگی کے لئے چن لیا۔ تمہارے دین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی۔

اسلامی نظام حیات، بالخصوص عائلی نظام، مکمل طور پر خود مکتفی ہے بشرطیکہ اس کو ماننے والے پوری ذمہ داریوں کے ساتھ اس کو قبول کریں اور اپنی سماجی زندگی میں اس کو بہ تمام وکمال برپا کرنا چاہیں۔ قرآن کی پہلی دعوت، اپنے ماننے والوں سے یہی رہی ہے کہ وہ کلیتہً اسلام کے دائرۂ حیات میں داخل ہو جائیں:

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ط

اس دعوت کے مقتضیات میں نہ صرف احکام الٰہی پر ایمان لانا ہی کافی ہے بلکہ ان احکام کو روزمرہ معاشری زندگی میں تدوین فقہ کے ذریعہ قابل عمل بنانا بھی مسلمان فقہا کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور اسی طرح ان قوانین کی تنفیذ وتعمیل کے لئے قضاء کے اداروں کا قیام اور تعمیل کے لئے عاملہ کی تنظیم بھی ملت اسلامیہ کی مقدس ذمہ داریوں میں ہے۔ مقننہ، عدلیہ اور عاملہ نہ صرف ایک مملکت ہی کے اعضائے حکومت ہیں بلکہ جہاں بھی اور جب بھی ایک مربوط ومنظم معاشرہ کا قیام عمل میں آتا ہے تو ملی زندگی کی تنظیم کے مراحل میں یہ تینوں [illegible] اسے تنظیم بھی کسی نہ کسی شکل میں ابھرنے لگتے ہیں۔ مدینہ میں سٹی اسٹیٹ کے قیام سے پہلے بھی احکام کا نزول شروع ہو چکا تھا اور بتدریج ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسلامی زندگی کے اس عبوری دور میں جو بھی تنظیمی ادارے دینی ڈسپلن کے سہارے ارتقا پذیر رہے مدنی زندگی میں یہی ادارے اعضائے حکومت کی ترقی یافتہ شکل میں تبدیل ہو گئے۔ قضاء سے متعلق قرآنی احکام میں ان اداروں کا قیام مضمر ہے:

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا ۝ النساء ۴: ۵۹ [1]

ترجمہ: اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں

ایک افسوس ناک خبر

نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۵ء کی صبح سوا سات بجے حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تدفین قبرستان مہندیان میں ہزارہا ہزار افراد کے درمیان عمل میں آئی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی اہلیہ کی رحلت سے خاندان عثمانی کو زبردست جھٹکا لگا ہے۔ براہِ کرم زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب کریں۔ مرحومہ اہلیہ مفتی صاحبؒ بڑی خوبیوں اور بے پناہ صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ ادارہ ندوۃ المصنفین کے بہت سے علمی، دینی اور مذہبی وتجارتی معاملات میں حصہ لیتیں اور اپنے مشوروں سے ادارہ کو کمک پہونچاتی تھیں جس سے استفادہ حاصل ہوتا اور حضرت مفتی صاحبؒ ان کے اس عمل سے بے حد متاثر ہوتے۔ اگر آپ حضرت مفتی عتیق الرحمن صاحبؒ کی اہلیہ کے ابتدائی حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں تو وہ جن حالات سے دوچار ہوتی رہیں کس طرح انھوں نے اس کو حسن وخوبی سے نبھایا وہ ہر لحاظ سے بے مثال ہے۔

حضرت مفتی عتیق الرحمن صاحب کے دل میں ان کی خوبیوں کی قدر ومنزلت دن دونی رات چوگنی برابر مزید بڑھتی چلی گئی اور اہلیہ کی اتنی طویل علالت سے ان کا دل بے حد متاثر ہوتا تھا۔ میری والدہ ماجدہ کی جدائی میرے لئے بہت بڑا سانحہ ہے۔

صاحبزادہ
عمید الرحمن عثمانی

علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی فقہ حنفی کی تائید

اسباب اور ثمرات

از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبۂ عربی امر سنگھ کالج، سری نگر کشمیر

(۱)

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ جملہ اسلامی علوم کے متبحر عالم تھے تاہم فقہ وحدیث میں ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا اور اس میں وہ اپنے جلیل القدر معاصرین میں ممتاز اور منفرد تھے۔ اپنے دورِ شباب ہی میں ان کی فقہی بصیرت مشہور ہوگئی تھی بلکہ مولانا عبدالحی حسنیؒ نے انھیں سربرآوردہ فقہاء احناف میں شامل کیا ہے[1]۔ انھوں نے فقہ کا تقابلی مطالعہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ مسائل کا آسانی کے ساتھ احاطہ کر کے مختلف پہلوؤں سے ان کی حقیقت نمایاں کرتے تھے۔ اُن کی اِس خوبی سے دارالعلوم دیوبند تشنگانِ فقہ کا مرکز ومحور بن گیا۔ نیز اُن کی اِسی صلاحیت ہی کی بنا پر علامہ اقبالؒ اور مولانا آزاد ان سے مختلف قسم کی علمی وفقہی خدمات حاصل کرنے کے خواہشمند ہوئے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ

---

[1] نزھۃ الخواطر ج ۸

کے دارالعلوم سے مستعفی ہونے کے ایام میں علامہ اقبالؒ نے ایک بار کہا:

"آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے سینکڑوں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو، جن کو دنیا کے موجودہ اور بین الاقوامی سیاسی، معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیش کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالمِ اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے......... میں شاہ صاحب کے سامنے سوالات پیش کروں گا اور وہ جواب دیں گے۔"[1]

چونکہ یہ کام اسی صورت میں ممکن ہو سکتا تھا جب ایک عالمِ دین کو جملہ مذاہب فقہیہ پر گہری نظر ہو اور مذہب اور قانونِ مذہب کی روح سے اچھی طرح واقف ہو۔ علامہ اقبالؒ جو خود قانون کے ماہر تھے، مولانا انور شاہؒ کے بارے میں مطمئن تھے کہ انھیں قدرت نے وہ سارے کمالات عطا کئے ہیں جو فقہ اسلامی کی جدید تدوین جیسے اہم اور نازک کام کے لئے خشتِ اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ وسیع العلم ہونے کے ساتھ تفقہ فی الدین کے سارے لوازمات جیسے دقائق وغوامض کی تحلیل قوتِ تطبیق، صحیح اسلامی اسپرٹ کی شناسائی اور سب سے بڑھ کر مسلکی بے تعصبی اور علمی دیانتداری سے آراستہ ہیں۔ خود علامہ محمد زاہد الکوثری مصریؒ نے ان کی اسی بصیرت اور فقاہت کو دیکھ کر کہا تھا: "احادیث کے معانی اور مباحث میں غواصی کرنے میں علامہ ابن ہمام کے بعد اس اُمت میں اس پایہ کا فقیہ نہیں گزرا ہے۔ یہ کوئی

---

[1] حیاتِ انور: ص ۱۹۳

کم زمانہ بھی نہیں ہے۔[۱]" (نفحۃ العنبر وحیاتِ انور : ۲۰۹)

مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اپنے استاد (حضرت شاہ صاحبؒ) کی فقہی بصیرت و بصارت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علامہ کشمیریؒ نے امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی تصانیف خاص طور پر موطا، کتاب الآثار اور کتاب الحجج[۲] کا نہایت رسوخ و اتقان کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ پھر شمس الائمہ سرخسیؒ کی مبسوط اور امام طحاوی کی معانی الآثار اور مشکل الآثار کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ خود ایک بار

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریا بادی اپنی تصنیف "حکیم الامت : نقوش و تاثرات" میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: "مولانا انور شاہ کی بزرگی اور علم و فضل کے مولانا محمد علی جوہر بھی قائل تھے لیکن رائے وہی رکھتے تھے جو بعض اکابر حنفیہ نے ابن تیمیہؒ سے متعلق ظاہر کی ہے کہ اُن کا علم و فضل اُن کی فہم سے بڑھا ہوا تھا۔"

حکیم الامت : ص ۱۱، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء

مگر جن حضرات کو حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں بیٹھنے اور ان سے مستفید ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملا ہے اُن کے تاثرات بالکل مختلف ہیں۔ کہیں سے ان کے فہم کی کمی کا کوئی تاثر نہیں ملتا ہے۔ اصل میں یہ رائے مولانا جوہرؒ ہی کے بارے میں ان کے بعض مخلص ناقدین رکھتے ہیں۔ اس کے لئے ڈاکٹر عبدالحق کا کتابچہ "چند ہم عصر" میں مولانا محمد علی کا تذکرہ اور عدیل عباسی صاحب کی تصنیف "تحریک خلافت" دیکھے جا سکتے ہیں۔

[۲] یہ کتاب امام محمد بن حسن الشیبانیؒ کی مبسوط کی شرح ہے جس کی اہمیت و عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے بس اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ یورپ کا ایک فاضل مقنن یہ کتاب پڑھ کر اتنا متاثر ہوا کہ اسلام قبول کیا اور کہا کہ یہ چھوٹے محمد کی کتاب کی شان ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فرمایا: "میں نے امام طحاوی کی مختصر الطحاوی کا بیس مرتبہ مطالعہ کیا اس کے باوجود کئی جگہوں پر اطمینان نہیں ہوا۔" اسی طرح مذاہب اربعہ کی چوٹی کی کتابیں از اول تا آخر مطالعہ کیں اور اپنے قوتِ حافظہ کی مدد سے یہ سارا ذخیرہ ان کے قلب و دماغ میں محفوظ رہا اور جس وقت جس چیز کو پیش کرنے کی ضرورت ہوتی تھی یہ سارا ذخیرہ آنکھوں کے سامنے پھرتا تھا۔ مولانا بنوری لکھتے ہیں:

لم یکتف فی الفقہ بمطالعۃ الفقہ الحنفی، بل طالع من کبار کتب الفقہ المالکی و الشافعی و الحنبلی ما یقضی العجب و یورث الحیرۃ [۱]

انھوں نے احناف کے کتب فقہ کے مطالعہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مالکی، شافعی، حنبلی وغیرہ مذاہب کی چوٹی کی فقہی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا تھا اور یہ مطالعہ اتنا پھیلا ہوا تھا کہ حیرت ہوتی ہے۔

امام ابوبکر کاسانی کی بدائع الصنائع اور ابنِ نُجیم کی البحر الرائق، ان کے برادر عالی قدر کی النہر الفائق، علامہ شامی کی ردّ المحتار اور امام شافعی کی کتاب الاُم کی ایک ایک سطر زیر نگاہ تھی۔ الام سے بے حد متاثر تھے اور فرماتے تھے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

پس بڑے محمدؐ کی کتاب (قرآن) کی عظمت کا کیا حال ہوگا

ھذا کتاب محمد کم الاصغر فکیف کتاب محمد کم الاکبر

بلوغ الامانی: علامہ محمد زاہد الکوثری: ص ۶۱

[۱] نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور: ص ۸۵

(مطبوعہ ڈابھیل)

کلما طالع کتاب الام یقع فی قلبی ان امام الشافعی من اذکیاء الامۃ ۱؎	جب جب میں کتاب الام کا مطالعہ کرتا ہوں تو یہ بات میرے دل میں جگہ پکڑتی ہے کہ امام شافعی صاحبؒ اذکیاءِ امت سے ہیں۔

بدائع الصنائع کو اپنے فن میں عظیم الشان کتاب قرار دیتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر یہ چند کتابیں محفوظ و موجود ہوں اور پھر سارا علم تلف ہو جائے تو کوئی پروا نہیں ہے۔ حدیث میں حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری، علم معانی و بیان میں علامہ بہاءالدین کی شرحِ تلخیص المفتاح، نحو میں اشمونی، منطق میں بحرالعلوم کی شرحِ سلّم، فقہ میں بدائع الصنائع اور اصول فقہ میں تحریر الاصول اور اس کی تلخیصات ۲؎ یہ بھی فرماتے تھے کہ عراقی حنفی فقہاء کی تالیفات علمائے خراسان کی تصانیف سے زیادہ محکم اور معتبر ہیں لیکن علامہ ابوبکر کاسانی کی بدائع الصنائع، باوجود اس کے کہ علامہ کاسانی خراسان سے تعلق رکھتے تھے تثبت و اتقان میں علمائے عراق کی تالیفات ہی کے مانند ہے، جو کوئی بھی شخص اس کا بغائر مطالعہ کرے گا وہ فقیہہ النفس ہوگا۔ اسی طرح علامہ ابن ہمام کی فتح القدیر، جو اصولِ فقہ جیسے موضوع پر کئی ضخیم جلدوں پر پھیلی ہوئی کتاب ہے، کا مطالعہ صرف بیس دن میں کیا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ کتاب الحج تک اس کی تلخیص بھی کی تھی اور ابن ہمام نے مصنفِ ہدایہ پر جتنے اعتراضات کئے ہیں ان کے جوابات بھی قلمبند کئے تھے۔ اِس سرعتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ

۱؎ نفحۃ العنبر: ص ۸۵۔

۲؎ کشکول: ص ۲۱۸ کراچی۔

ہزاروں ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب اس طرح جذب کی تھی کہ خود ایک بار فرمایا:
۲۶ سال قبل اس کتاب کا مطالعہ کر چکا ہوں اور آج تک اس کی طرف مراجعت کرنے کی ضرورت بھی نہ پڑی۔ اگر آج بھی اس کا مضمون بیان کروں گا تو بہت کم فرق پاؤ گے[1] ایک اور مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ ابن ہمام نے اس کتاب میں حنفی مذہب کی جتنی بھی دلیلیں پیش کی ہیں وہ سب علامہ جمال الدین زیلعی کی تخریج (نصب الرایۃ) سے مستفاد ہیں۔ صرف تین جگہیں اس استفادے سے خالی ہیں جن میں ایک مہر کا مسئلہ ہے[2]۔ تاہم علامہ انور شاہ ابن ہمام کو نہ صرف فقہائے احناف میں بلکہ جملہ مذاہب اربعہ میں اصول فقہ کے بے نظیر محقق مانتے تھے۔ مولانا بنوری لکھتے ہیں۔

کان شیخنا و مولانا الشیخ محمد انور شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ یقول لیس فی علماء المذاہب الاربعۃ اصولیاً محققاً مثل المحقق ابن الھمام وکان یقول کتابہ تحریر الاصول کتاب لا نظیر لہ فی الضبط والاتقان ولکنہ من اصعب الکتب[3]

ہمارے استاد مولانا محمد انور شاہ رحمۃ اللہ فرماتے تھے کہ مذاہب اربعہ میں ابن ہمام جیسا کوئی محقق اور ماہرِ اصولِ فقہ نہیں گزرا ہے۔ وہ (حضرتِ شاہ صاحب) ان کی کتاب تحریر الاصول کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ یہ کتاب ضبط و اتقان میں بے مثل ہے تاہم کتابوں میں بڑی مشکل اور دقیق بھی ہے۔

---

[1] نفحۃ العنبر: ص ۳۸، مطبوعہ ڈابھیل سورت ۱۹۳۶ء
[2] ایضاً [3] بغیۃ الاریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب:
علامہ بنوری محدث ص ۱۲۴

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسی طرح علامہ برہان الدین مرغینانیؒ کی شہرہ آفاق کتاب ھدایہ سے مرعوب کی حد تک متاثر تھے اور کہتے تھے کہ ائمہ اربعہ کی فقہی کتابوں میں ھدایہ جیسی کتاب موجود نہیں ہے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ بعض علماء نے جو یہ کہا ہے کہ ھدایہ امام سرخسی کی مبسوط سے ماخوذ ہے میرے نزدیک صحیح نہیں ہے ھدایہ کی ادبی مٹھاس اور اس کی جزالت و فخامت اس سے اِبا کرتی ہے[۱]۔ صاحب ہدایہ کی مختصر نگاری، حُسنِ تعبیر اور استیعابِ مسائل ان کے ایسے کمالات ہیں جن کا مظہر اَتم ہدایہ ہے۔ مذاہبِ اربعہ میں اِس شان اور اسلوب کی دوسری کتاب موجود نہیں ہے[۲]۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ کسی شیعہ فاضل نے کہا ہے کہ مسلمانوں میں عربی ادب کی کتابیں صرف تین ہیں: قرآنِ حکیم، صحیح بخاری اور ہدایہ؛ فاضل موصوف نے بالکل درست کہا ہے[۳]۔ علامہ کشمیری یہ بھی فرماتے تھے کہ صاحبِ ہدایہ کو تفقّہ میں جو مرتبہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ابن ہمام کے بارے میں علامہ کشمیری کی اس رائے کی تائید علامہ سخاوی (تلمیذ ابن حجرِ عسقلانی) کے اس قول سے ... ہوتی ہے: "اِنّہٗ عالمُ اھل الارض و محقق اُولی العصر" الضوء اللامع: ج ۸ ص ۱۲۷

۱ بُغیۃ الاریب: ص ۱۲۴، مطبوعہ مصر۔

۲ نصب الرّایۃ، مقدمہ: محدّث بنوریؒ: ص ۸

۳ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی زبان سے شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم کا ایک قول یہاں نقل کریں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ مرحوم صحیح بخاری کے بڑے مدّاح اور قدر داں تھے اور کہتے تھے: "عربی زبان سیکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ ہدایہ کے بھی وہ بہت ثنا خواں تھے اور جس قدر مختلف نسخے ان کے پاس بکنے کو آتے وہ خوشی خوشی انھیں خریدتے تھے۔" چند ہم عصر: ص ۱۰۳۔

حاصل ہے صاحب دُرِّ مختار جیسے ہزار فقہاء بھی اسے نہیں پا سکتے ہیں۔ صاحب دُرِّ مختار کا علم کتابی علم ہے جبکہ صاحب ہدایہ کا علم علم سینہ ہے۔ مجھے ایک شخص نے کہا کہ کیا آپ فتح القدیر جیسے اسلوب میں کتاب لکھ سکتے ہیں۔ میں نے کہا: ہاں، اس نے پوچھا کہ کیا ہدایہ کے اسلوب و انداز میں بھی؟ تو میں نے جواب دیا: ہرگز نہیں، یہاں تک کہ اس جیسی عبارت میں چند سطور بھی نہیں لکھ سکتا۔ ہدایہ کے الفاظ موتیوں کے مانند ہیں جو معانی و مطالب کے مغز اور جوہر پر حاوی ہیں[1]۔ علامہ کشمیری کی اس رائے کی تائید ایک مغربی ماہر قانون کے تبصرے سے ہوتی ہے۔ موصوف نے عربی میں ہدایہ کا مطالعہ نہیں کیا تھا بلکہ اس کے فرانسیسی ترجمے کو پڑھا تھا۔ اس نے لکھا ہے: "اس کتاب میں دماغ کی ایک بڑی طاقت نظر آتی ہے اور ایک ایسا فلسفۂ قانون ہے جس میں بہت باریکیاں پائی جاتی ہیں[2]۔" ان اہم ترین فقہی تصانیف کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ہند اور ہند سے باہر ان بے شمار شروح و حواشی کا مطالعہ کیا تھا جن کی صحیح تعداد خدا ہی جانتا ہے اور جن کا کچھ حوالہ ان کی تصانیف، امالی اور ملفوظات میں ملتا ہے۔

فنی اور علمی اعتبار سے مولانا انور شاہؒ نے فقہ اسلامی کی کیا خدمات انجام دی ہیں اور فقہ کی ترتیب اور تشکیل جدید میں ان کے تحریری سرمائے سے کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے ہمیں کیا راہنمائی مل سکتی ہے؟ اس موضوع پر اصحابِ فن ہی قلم اٹھا سکتے ہیں اور زیرِ نظر مضمون میں اس نازک موضوع سے تعرض کرنے کا مضمون نگار کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار کو ان اسباب اور وجوہ کا کھوج

---

[1] نصب الرایہ (مقدمہ) ص ۱۴۔

[2] صدق جدید ۱۸ اگست ۱۹۶۱ء۔

لگانا مقصود ہے، جو علامہ انور شاہؒ کی مسلکِ حنفی کی تائید کے پیچھے کارفرما تھے۔
طالب علموں کو یہ جاننے کی خواہش ہے کہ اگر علامہ ممدوحؒ وسیع النظر عالم دین
اور اپنے وقت کے ممتاز ترین محدث وفقیہ تھے تو فقہ میں اُن کا مقلد محض ہونا اور
فقہ حنفی کی تائید و توثیق کو اپنی علمی خدمات کا جز بنا دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا یہ
کسی مسلکی تعصّب کا ردّ عمل تھا یا ان کی تقلید کسی گہری تحقیق پر قائم تھی؟ کیا اس
تائید سے انھوں نے وقت کی کوئی اہم ترین خدمت انجام دی ہے یا ایسا کرنے
سے انھوں نے اپنی عمر ضائع کی؟[1] یہ فقہ سے کہیں زیادہ تاریخ سے تعلق رکھنے والا

---

[1] ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل ایک سلفی مصنف نے صاف صاف لکھا ہے کہ مولانا
انور شاہ صاحب نے ایسا کر کے اپنی عمر ضائع کی۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ
بوڑھے تھے اور بڑھاپے کے زیر اثر اس غیر ضروری کام میں لگ گئے (تفصیل کے لیے
ملاحظہ ہو: اللمحات الیٰ ما فی انوار الباری من الظلمات ج اول)۔ واضح رہے
علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے انتقال پر حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے معارف کے شذ
میں جو خراجِ عقیدت پیش کیا تھا اس میں یہ الفاظ بھی لکھے تھے: "مرتے دم تک علم و معرف
کے اس شہید نے قال اللہ اور قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا" بحوالہ یادِ رفتگاں: ص ۸
یہ بھی یاد دلانے کے قابل ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری کی عمر انگریزی تقویم کے لحاظ سے
۵۸ سال سے کچھ کم ہی تھی۔ مؤلف اللمحات نے بڑی جلدی میں آ کر علامہ انور شاہ
کی تنقیص کی ہے۔ فقہ حنفی کی تائید کر کے علامہ انور شاہ صاحب نے کوئی "نئی بے مق
خدمت انجام نہیں دی ہے۔ یہ خدمت اپنے اپنے وقت میں تمام انصاف پسند محققی
انجام دی ہے اور جب تک "جزء رفع الیدین" "قراۃ خلف الامام" وغیرہ جیس

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

موضوع ہے اور نہ صرف طالب علموں کے لئے دلچسپ ہے بلکہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی حیات، شخصیت اور کارناموں کا نہایت ہی اہم حصہ ہے ہم نے اس موضوع پر جو کچھ مطالعہ کیا ہے اور بالآخر جس نتیجے پر پہنچے ہیں اسے بالاختصار قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ فقہ میں بلاشبہ مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے مگر اس کے باوجود وہ مُقلّدِ محض تھے۔ خود فرماتے ہیں:

مامن فنٍ الّا ولی فیہ رأی الّا الفقہ۔ فانا فیہ مقلّد صرف۔	میں تمام علوم وفنون میں اپنی رائے رکھتا ہوں۔ ہاں! فقہ میں، میں مُقلّدِ محض ہوں۔

(فیض الباری ج ۳ ص ۱۷)

وہ فقہ میں اجتہاد کی ضرورت ضرور تسلیم کرتے ہیں مگر اسے فقہاء اسلام کی سی بصیرت و بصارت سے مشروط کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود فنا فی العلم تھے مگر اس کے باوجود انھیں اعتراف تھا کہ وہ اس معیار پر اُترنے کے پورے پورے اہل نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ جب مصر کے ایک بلند مرتبہ حنبلی المسلک عالم نے ان کے علم وفضل سے غیر معمولی متأثر ہو کر کسی علمی مجلس میں کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ یہ شخص (علامہ انور شاہ صاحب کشمیری) ابو حنیفہ سے زیادہ علم رکھتے ہیں تو میں حانث نہ ہوں گا۔ جب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

دنیا میں موجود رہیں گی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ کس میں ہمت ہے کہ الجامع الصحیح سے "وقال بعض الناس" قسم کی عبارت ومضمون کو غیر ضروری سمجھ کر اسے کتاب ہی سے خارج کرنے کا مشورہ دے۔

علامہ کشمیری کو اس کا علم ہوا تو سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا: ہمیں امام ابوحنیفہ رح کے مدارکِ اجتہاد تک قطعاً رسائی نہیں ہے[۱]۔ (حیاتِ انور: ص ۳۱۹)

علامہ انور شاہ صاحب کو اپنی حنفیت پر سخت اصرار تھا۔ وہ درس و تحریر میں فقہ حنفی کی حمایت و نُصرت کی طرف پوری توجہ کرتے تھے۔ اس کی صحت و ارجحیت پر دلائل و براہین قائم کرتے تھے[۲]۔ یہاں تک کہ خود ایک مرتبہ فرمایا: میں نے سنوا سال تک حنفی مسلک کے جڑ گاڑ دیئے[۳]۔ اس زبردست حمایت و نصرت کے پیچھے جو تاریخ کار فرما ہے اس کی روشنی میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب رح کا یہ موقف درست نظر آتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ اُس وقت کی ایک اہم علمی مسئولیت بھی نظر آتی ہے جسے علامہ کشمیری نے کمالِ احتیاط و تدبّر سے سرانجام دے کر اُمّت

---

[۱] حضرت مولانا زکریا صاحب محدث رحمۃ اللہ علیہ اپنی آپ بیتی میں فرماتے ہیں:

"میرے ذہن میں یہ ہے کہ شریعت تو صرف اللہ اور اس کے رسول پاک کا کلام ہے لیکن اس پر عمل کرنے میں روایات کی جرح و تعدیل میں ائمہ مجتہدین و ائمہ اربعہ کا قول مجھ جیسے نابلد کی تحقیق پر بہت مقدّم ہے بلکہ ان حضرات کے ارشادات ائمہ حدیث سے بھی مقدّم ہیں اس لئے یہ ائمہ حضرات، بخاری و مُسلم کے اساتذہ یا استاذ الاساتذہ ہیں اور زمانۂ نبوت سے بہ نسبت ائمہ محدثین کے زیادہ قریب ہیں اس لئے روایات کے ردّ و قبول میں ان حضرات کا رتبہ اور پایہ ہم لوگوں سے کیا بلکہ ائمہ محدثین سے بھی کہیں زیادہ اونچا ہے۔"

آپ بیتی نمبر ۴، صفحہ ۶۹ - ۷۰

[۲] نزھۃ الخواطر ج ۸ مولانا محمد عبدالحی حسنی رح و مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

[۳] نفحۃ العنبر: ص ۹۰، مجلس علمی ڈابھیل۔

کی طرف سے ایک فرضِ کفایہ ادا کیا۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے زوال و ذلت کا ایک بڑا سبب ان کا مسلکی بغض و عناد رہا ہے۔ اس تقلیدی تعصب نے مسلمانوں کے اتحاد و موانست کو پارہ پارہ کرنے میں مکروہ رول ادا کیا ہے۔ کتنے علماء جاہلوں کے ہاتھوں رُسوا ہوئے ہیں اور کتنا شاندار ورثہ مسلمانوں ہی کے ہاتھوں توہین و تحقیر کا نشانہ بنا ہے۔ مشہور مفسر و مؤرخ علامہ ابن جریر طبریؒ (متوفی ۳۱۰ھ) کو محض اس جرم کے پاداش میں، کہ انھوں نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو فقہاء میں شامل نہیں کیا تھا، مسلمانوں کے ہاتھوں جس مصیبت اور بدترین آزمائش سے سابقہ پڑا تھا اسے ڈاکٹر احمد امین کے الفاظ میں سنئے:

فقد هُوجِمَ من المحدثين و	اُن پر (علامہ طبریؒ) محدثوں خصوصًا
خصوصًا من الحنابلة ونالهُ	حنبلیوں کی طرف سے حملہ کیا گیا
الضرر منهم وهو في درسه	اور درس کی حالت ہی میں انھیں
فلما احتجب في بيته رموه	حملہ آوروں کی طرف سے تکلیف
بالحجارة حتى صار امام	پہنچی۔ جب وہ گھر میں چھپ گئے
امام بيته اكوام وذهب	تو اُن پر پتھر پھینکے گئے یہاں تک کہ
الآلاف من الجند ليحموه۔	کہ اُن کے گھر کے سامنے پتھروں کے
فلما مات لم يحتفل	ڈھیر بن گئے۔ اس کے نتیجہ میں
بجنازته۔ والله تعالى	ہزاروں فوجی انھیں تحفظ دینے
لا يعبأ بكل ذلك۔ فقد	کے لئے گئے۔ پھر جب ان کا
اكرمه الله بخير من	انتقال ہو گیا تو اُن کے جنازے
هذه المظاهر جزاء جده	کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔

وفضلہ[1]

مگر اللہ تعالیٰ بھی ان باتوں کی پروا کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔ اُس نے علامہ ممدوح کو اُن کے دشمنوں کی ایسی حرکتوں کے برعکس اُن کی علمی محنت و فضیلت کے صلے میں بہترین مقام و مرتبہ عطا کیا۔

جہاں تک فقہ حنفی کا تعلق ہے اس کی تاریخ کا مطالعہ کرکے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیگر مذاہب فقہ کے مقابلے میں مخالفت اور معاندت کا نمایاں ہدف بنا رہا ہے۔ یہ سلسلہ بہت شروع سے چلا آرہا ہے۔ خود امام ابوحنیفہ رح کو بھی اپنے زمانے میں اِس عناد کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ان کے جلیل القدر معاصرین اور ممتاز ترین تلامذہ امام صاحب کے مخالفین کی پروپگنڈا بازی کی تردید کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مبارک (۱۱۸ھ تا ۱۸۱ھ) بھی شامل تھے جنھوں نے نہ صرف امام ابوحنیفہ رح کو دیکھا تھا بلکہ ایک عرصہ تک ان سے فقہ کی تحصیل بھی کی تھی۔ ڈاکٹر عبدالمجید المحتسب لکھتے ہیں:

وقد تفقہ عبد اللہ بن مبارک بابی حنیفۃ النعمان بن ثابت امام اہل الرأی فی العراق۔ ولا ریب فی ان ابن المبارک لازم ابا حنیفۃ مدۃ

عبداللہ بن مبارک نے ابوحنیفہ سے جو عراق میں اہل الرائے کے پیشوا تھے فقہ حاصل کی۔ اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ وہ بغداد جانے سے قبل عراق میں کافی مدت

---

[1] ظہر الاسلام ج ۲ ص ۳۰۔

من الزمن واخذ عنه	تک امام صاحب کی خدمت میں بیٹھے
الفقه وهو فی الکوفة	اور اُن سے فقہ کا علم حاصل
قبل ان یرحل الی	کیا۔
بغداد [1]	

کسی زمانے میں احناف کی کتابیں جلائی گئیں یہاں تک کہ بعض اہل علم نے انھیں دریا برد کر دیا۔ اسپین کے ایک حکمران نے چند علماء کو اپنے دربار سے محض اس لیے نکلوایا کہ وہ مسلکاً حنفی تھے [2]۔ متاخرین نے اس میں اور زیادہ غلو برتا یہاں تک کہ غیر حنفی اہل علم بھی اس پر افسوس کئے بغیر نہیں رہے۔ بعض علماء نے اظہارِ افسوس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے امام ابو حنیفہ کی ذات اور ان کی خدمات پر معاندین کی ڈالی ہوئی گرد جھاڑ دی۔ علامہ جلال الدین سیوطی، ابن حجر ہیثمی وغیرہ نے امام صاحب کی توصیف و تحمید میں مستقل کتابیں بھی لکھیں۔ اسی طرح حافظ سخاویؒ، علامہ ابن عبدالبر، علامہ ابن خلدون وغیرہ نے بھی امام صاحب اور اُن کے دبستانِ فقہ کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی۔ معاندین اس حد تک پہنچ گئے کہ امام اعظم اور ان کے مقلدوں کو حدیث رسولؐ کا دشمن قرار دیا اور یہ بلند بانگ دعویٰ صرف اس لیے کیا گیا کہ امام ابو حنیفہؒ بہت سے جلیل القدر صحابہ کے نقشِ قدم پر چل کر اسلامی قوانین کی تشکیل میں اور روحِ شریعت تک پہنچنے کے لئے فکر و بصر کو اپنا مقام دینے کے

---

[1] عبداللہ بن المبارک المروزی: ص ۴۵۔ وزارۃ الاوقاف والشؤن، عمان ۱۹۷۲ء

[2] کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعۃ، مقدمہ ص ۲۸۔

قائل تھے۔[۱] اسی لیے فقہاءِ اسلام نے نیک نیتی سے احناف کو اہل الرّائے کا خطاب دیا مگر جیسے بد قسمتی سے بعض حضرات نے طنز و استہزاء کے معنوں میں استعمال کیا۔ خود علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

انّ بعض الشوافع یلقبون	بعض شوافع احناف کو بر سبیل طنز
الحنفیۃ باھل الرّائ	اہل الرّائے کہتے ہیں۔
ھجوًا لھم[۲]۔	

اور تو اور امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں یہ افواہ اڑائی گئی کہ وہ حدیث کا کماحقّہٗ علم نہیں رکھتے ہیں اور ان کا ترتیب دیا ہوا فقہی ذخیرہ اُن کے ذاتی آراء اور قیاسات کا انبار ہے۔ علامہ ابن خلدون اس کی پُر زور تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصل میں ائمۂ مجتہدین کے ہاں احادیث کے رد و قبول کے شروط مختلف تھے۔ جن کے ہاں یہ شروط سخت تھے اُن کے نزدیک صحیح احادیث کی تعداد کم ہوئی جیسے امام مالک اور امام ابو حنیفہ اور جن ائمۂ کرام کے نزدیک یہ شروط نرم تھے ان کے ہاں احادیث کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

---

[۱] حضرت فاروق اعظمؓ کے بارے میں ڈاکٹر احمد امین لکھتے ہیں:

"وکان یجتھد فی تعرّف المصلحۃ التی لاجلھا کانت الآیۃ او الحدیث ثم یسترشد بتلك المصلحۃ فی احکامہ، وھو اقرب شیءٍ الی ما یعبر عنہ الآن بالاسترشاد بروح القانون لا بحرفیتہ"۔

فجر الاسلام: ص ۲۹۲

[۲] فیض الباری علی صحیح البخاری: ج ۱ ص ۱۷۰۔

واعلم ایضاً ان الائمۃ المجتہدین تفاوتوا فی الاکثار من ھذہ الصناعۃ والاقلال۔

فابو حنیفۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یقال عندہ بلغت روایتہ الی سبعۃ عشر حدیثاً او نحوھا ومالک رحمہ اللہ انما صح عندہ ما فی کتاب الموطا وغایتھا ثلاثمائۃ حدیث او نحوھا واحمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ فی مسندہ خمسون الف حدیث ولکل ما ادّاہ الیہ اجتہادہ فی ذلک۔[1]

جاننا چاہئے کہ ائمہ مجتہدین احادیث پرکھنے کے فن میں ایک دوسرے سے کثرت وقلت میں مختلف ہوئے۔

کہا جاتا ہے ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں سترہ یا اس جیسی تعداد میں ہی احادیث پہنچے۔ اسی طرح مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اتنے ہی صحیح ثابت ہوئے جو اُن کی تصنیف مؤطا میں موجود ہیں جس کی تعداد میں تین سو یا اس کے قریب پہنچ جاتی ہے[عہ]۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کی مُسند میں احادیث کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی ہے اس طرح ہر ایک مجتہد نے اپنے اجتہاد کی روشنی میں یہ تعداد مقرر کی ہے۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون: ص ۳۸۸، مطبعۃ البہیۃ، مصر۔

[عہ] ابتداءً مؤطا میں دس ہزار حدیثیں تھیں مگر امام صاحب نے سب کو قلم زد کردیا۔ اب ۱۷۲۵ باقی ہیں۔ جس میں مُسند و مرفوع ۶۰۰، مُرسل ۲۲۲، موقوف ۶۱۳ اور تابعین کے اقوال وفتاویٰ ۲۸۵ ہیں۔ مقدمہ اوجز المسالک ص ۲۸ بحوالہ محدثین عظام: مولانا تقی الدین ندوی: ص ۸۴

آگے علامہ ابن خلدون بعض معاندوں کی اس خام خیالی کی کہ کوئی امام و مجتہد بھی علم حدیث میں کم مایہ ہوتا ہے، تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقد تقول بعض المبغضين المتعسفين الى ان منهم من كان قليل البضاعة فی الحديث فلهذا قلت روايته ولا سبيل الى هذا المعتقد فی كبار الائمة [1]

بعض بے راہ رو حاسدوں کا یہ خیال ہے کہ ائمہ مجتہدین میں سے بھی کوئی علم حدیث میں کم مایہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے ہاں روایات کی تعداد کم ہوتی ہے حالانکہ ائمہ عظام کے بارے میں ایسا باطل تصور قائم کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

مگر اس ساری مخالفت اور معاندت کے باوجود حنفی مسلک پھیلتا گیا بلکہ بعض اسلامی ملکوں میں صدیوں تک قانوناً رائج رہا۔ ہندوستان میں بھی حنفی مسلک بھی ایک طویل زمانے سے رائج العمل رہا۔ اکثر سلاطین و صوفیاء، جن کی مساعی جمیلہ سے ہندوستان اسلام شائع و ذائع ہوا، اسی مسلک پر عامل تھے۔

(باقی)

---

[1] مقدمہ ابن خلدون: ص ۳۸۸، مطبعۃ البہیۃ، مصر۔

اقبال کا فن

مرتبہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،
۱۹۸۳ء، صفحات ۳۴۶، قیمت: ۵۰ روپے
تبصرہ نگار: ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری

اقبال ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے۔ انھوں نے شاعری کو اپنے فلسفہ کی تشریح اور پیغام کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے روایتی شاعری سے انحراف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں نہ تو گل و بلبل کے تذکرے ہیں، نہ ہجر و وصال کی داستانیں، نہ محبوب کی کج نگاہی اور بے وفائی کی شکایتیں۔ ان کے یہاں پیغام ہے، ساری انسانیت کے لیے۔ یہ پیغام ہے اثباتِ حیات کا، عرفان ذات کا، تحفظِ خودی کا اور اپنی ہستی کو بلند کرنے کا، اتنی بلندی پر پہنچنے کا کہ خدا بھی اس کی قسمت بنانے میں خود اس سے مشورہ کرنے لگے۔ وہ تعلیم دیتے ہیں تسخیر حیات کی اور عمل پیہم اور جہدِ مسلسل کی۔ اس سے زندگی میں حرکت اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر انسان 'انسانِ کامل' بن جاتا ہے۔ اس وقت وہ ہمت اور عظمت کے منتہائے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے انھوں نے شاعری کا سہارا لیا، جو نثر کے مقابلہ میں زیادہ مؤثر اور مقبول ذریعہ ہے۔ اس میں بھی انھوں نے نظم کو اپنایا کیونکہ انھیں احساس تھا کہ صنفِ غزل ان کے خیالات کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس کے دامن میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ اس عالم گیر پیغام کو اپنے اندر سمو سکے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر انھوں نے نظم کے وسیع و عریض میدان میں قدم رکھا اور اس میں اپنے نغمے گائے۔

اقبال ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ وہ شاعر تھے، فلسفی تھے، سیاسی مفکر اور پیغامبر تھے۔ ان کی یہ ہمہ جہتی متقاضی تھی اس امر کی کہ اس پر سیر حاصل تبصرے ہوں اور ان کی قدر و قیمت کا صحیح تعین ہو۔ اس میں فن اور فکر کے ساتھ ان کی ذات اور شخصیت کا معرضِ بحث میں آنا بھی بدیہی امر تھا۔ چنانچہ ان کی شخصیت، ان کے شاعرانہ اعجاز، فلسفیانہ بصیرت اور پیغام کی ہمہ گیری اور وسعت پر مختلف زاویوں سے لوگوں نے گفتگو کی ہے۔ اس طرح اقبال سے متعلق جو لٹریچر عالمِ وجود میں آیا ہے اس میں کتابوں کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق، تقریباً دو ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ مضامین کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہ مقبولیت فقیدُ المثال ہے لیکن اس میں یہ پہلو بڑا افسوس ناک ہے کہ اقبالیات کے اتنے ضخیم لٹریچر میں اقبال کی صحیح تصویر ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ ان پر جتنا بھی لکھا گیا ہے، اس میں زیادہ تر یک طرفہ باتیں کہی گئی ہیں۔ یہ سب تعریف و توصیف ہے جو محض عقیدت مندی اور نیاز مندی پر مبنی ہے۔ اس میں اقبال کو ایک آئیڈیل اور صنم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ایسا ہیرو جس کا کوئی کمزور پہلو نہیں ہے اور جس سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ اس کے نتیجہ میں ہم علامہ کی اصلی شخصیت سے اب تک کماحقہٗ واقف نہیں ہوسکے ہیں۔

اسی طرح بحیثیت شاعر، فلسفی، پیغامبر اور فن کار اُن کا معروضی مطالعہ بھی ابھی تک نہیں کیا گیا ہے، اس میں نقد و نظر کا انداز کم، تعریفی اور توصیفی طرز زیادہ ہے۔ اس کا بنیادی سبب غالباً یہ ہے کہ اقبالؔ کو خالص اسلامی شاعر تصور کر لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اقبالؔ نے اپنے پیغام کی اساس قرآن اور سنت کی تعلیمات پر رکھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان تعلیمات پر عمل کر کے ہی انسانیت کی فلاح ممکن ہے۔ اس طرح ان کا یہ پیغام تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ہے اور اس کا دائرہ عالم گیر ہے۔ لیکن جذبۂ اسلامی سے سرشار حضرات نے انھیں صرف مسلمانوں کا شاعر بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبالؔ پر تنقید کو براہ راست اسلام پر تنقید تصور کیا جانے لگا۔ ایسے توہمات کا اثر یہ ہوا کہ آج تک نہ تو اقبالؔ کی صحیح تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آئی، نہ ہی بحیثیت شاعر اور بحیثیت فنکار ان کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین ہو سکا۔ ان پر اب تک جتنے نقد و تبصرے ہوئے ہیں، ان میں اقبالؔ کے فلسفہ اور پیغام سے بحث کی گئی ہے، فنِ شعر سے بڑی حد تک صرفِ نظر کر لیا گیا ہے۔ غالباً اس لیے کہ اس میں تصویر کے دوسرے رخ کے سامنے آنے کے امکانات زیادہ قوی تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شعبۂ اردو لائقِ مبارکباد ہے کہ اس نے اس کمی کو محسوس کیا کہ اقبال صدی تقریبات کے سلسلہ میں ۲۶ر اور ۲۷ر مارچ ۱۹۷۸ء کو جو سمینار منعقد کیا اس کو اقبالؔ کے فن اور شاعرانہ کمال کے تجزیے اور جانچ تک محدود رکھا۔ اگرچہ اس میں بھی کہیں کہیں عقیدت مندی کا عنصر غالب نظر آتا ہے تاہم اسے اقبالؔ کے فن اور شاعرانہ اعجاز کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھنے کی سنجیدہ اور مخلصانہ کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 'اقبال کا فن' کے عنوان سے ترتیب دے کر شائع کر دیا ہے۔ نارنگ صاحب کا یہ عمل

بہت مستحسن ہے اور پوری اردو دنیا کی طرف سے شکریہ کا مستحق۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر گیان چند جین، جناب سید حامد، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر وحید اختر، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر مسعود حسین خاں، وارث علوی اور خود گوپی چند نارنگ جیسے ماہرینِ اقبالیات محققینِ ادب، ناقد اور دانشور شامل ہیں۔ کتاب کو شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ (مرحوم) کے دیباچہ سے مزین کیا گیا ہے۔ اس دیباچہ کی قدر و قیمت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ایک عام خیال یہ ہے کہ یہ شیر کشمیر کی آخری ادبی تحریر ہے۔ شیخ صاحب نے کشمیر سے علامہ اقبال کے تعلق پر زور دیا ہے۔ کشمیر کی جنگِ آزادی سے اقبال کی دلچسپی اور ان کے قائدانہ رول کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے شیخ صاحب فرماتے ہیں:

"کشمیر میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اقبال براہِ راست اس سے وابستہ ہو گئے۔ کشمیر کمیٹی کے نام سے پنجاب میں اس تحریک کو تقویت پہنچانے کے لیے جو کمیٹی بنی اس کے سرگرم رکن تھے۔ بعد میں وہ اس کمیٹی کے صدر بن گئے اور ہمارا ان کا گہرا رابطہ قائم ہوا۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے، سیاستداں نہیں لیکن آزادی کی تحریک کو چلانے کے لیے انھوں نے ہماری صحیح رہنمائی کی اور وقتاً فوقتاً ہمیں مشورے دیتے رہے۔ اقبال پر فرقہ پرستی اور تنگ نظری کا الزام لگانے والے کو یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ میں نے سیکولرزم اور نیشنلزم کا پہلا سبق اقبال ہی سے لیا ہے۔"

شیخ صاحب کو کشمیر سے جو لگاؤ تھا اور کشمیریوں کے لیے اُن کے دل میں جو تڑپ تھی اس کا مقتضا یہی تھا کہ وہ علامہ کے کارناموں کو صرف کشمیر کے ہی تناظر میں دیکھیں۔ ان کی نظر اقبال کی بین الاقوامی حیثیت پر نہیں جا سکتی تھی۔

اس مجموعہ کا پہلا مقالہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں (مرحوم) کا ہے۔ عنوان ہے: "اقبال کے کلام میں جلال و جمال کی آمیزش"۔ یوسف صاحب سنجیدہ اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ یہی صفات اُن کی تصانیف میں بھی نمایاں ہیں۔ اقبالیات ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ 'رُوحِ اقبال' اور 'حافظ اور اقبال' کا جن حضرات نے مطالعہ کیا ہے، وہ یوسف صاحب کی بالغ نظری، وسعتِ مطالعہ اور بلندیِ افکار سے بخوبی واقف ہوں گے۔ آپ نے غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام میں جمالیاتی عناصر کا بڑا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ 'غالبؔ اور اقبالؔ کی متحرک جمالیات' اس کا بہترین ثبوت ہے۔ اقبال کے تصور جلال و جمال سے آپ کو خصوصی لگاؤ تھا غالباً اس لیے کہ آپ خود اس کا بہترین مظہر تھے۔ زیر نظر مقالہ کی خوبی یہ ہے کہ یوسف صاحب نے اپنے مطالعہ کو صرف اقبالؔ تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اردو فارسی شاعری کے اہم رجحانات کا بھی جائزہ لیا ہے اور ان سلاسل کا پتہ لگایا ہے جن سے اقبال نے فیضان حاصل کیا ہے۔ اقبال کی شاعری کا ان کا یہ تجزیہ بڑا حقیقت پسندانہ اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے:

"اقبال نے اپنی شاعری میں جلال و جمال کی آمیزش، اجتماعی معنویت پیدا کرنے کے لیے کی ہے۔ خودی کے استحکام کے ساتھ اس نے جدید علوم (سائنس) کے حصول پر بھی بہت زور دیا تاکہ اہلِ مشرق میں تسخیر فطرت کی صلاحیت پیدا ہو۔ وہ سکونی دروں بینی کے بجائے متحرک بروں بینی کا احساس پیدا کرنا چاہتا تھا تاکہ انفس و آفاق دونوں کو بصیرت حاصل ہو۔ انفس کی حد تک خودشناسی کا احساس اور آفاق کی حد تک سائنس کی تعلیم کو جماعت کے امراض کا علاج تجویز کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوع دھیمے اور نرم لہجے میں نہیں بیان کیا جا سکتا تھا۔ اسے پیش کرنے کے لیے اُس نے وہی

لے برتی جو موزوں اور اقتضائے حال کے مطابق تھی۔ اپنی شاعری میں چاہے وہ جلال وجمال کی آمیزش کا ذکر نہ کرے لیکن اس کے اسلوب وہیئت میں تخئیلی طور پر وہ پوشیدہ رہتے ہیں اور ان کی تخلیقی توانائی محسوس ہوتی ہے۔"

مجموعی طور پر مقالہ بہت جامع اور مدلل ہے۔ پورے مقالہ پر عقیدت کا عنصر غالب ہے۔

سرور صاحب زبان کے بادشاہ ہیں۔ زبان کی شیرینی، شگفتگی اور تازگی جتنی سرور صاحب کی تحریروں میں ملتی ہے، دوسری جگہ دیکھنے میں کم آتی ہے۔ تحریر وتقریر دونوں میں ان کی یہ خوبی برقرار رہتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں آپ کا مقالہ "خضر راہ۔ ایک مطالعہ" کے عنوان سے ہے۔ یہ عنوان اگرچہ سرور صاحب جیسے بلند پایہ ناقد اور عظیم دانشور کے منصب سے فروتر ہے، تاہم یہاں بھی آپ نے اپنی ناقدانہ بصیرت کے جوہر دکھائے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ نظم کے فنی محاسن اور تکنیک کے رموز منکشف کرنے کی بجائے "خضر راہ" کے پس منظر پر زیادہ زور دیا گیا ہے حالانکہ سیمینار کا مقصد اقبال کے فن سے بحث کرنا تھا۔ تمہید کے طور پر اقبال کی فکر سے عمومی بحث کرتے ہوئے سرور صاحب بڑے پتے کی بات کہہ گئے:

"اقبال کے یہاں حکمت ایک ربط، سنجیدگی اور تسلسل رکھتی ہے۔ یعنی ان کے شعری افکار میں ہمیں ایک وحدت ملتی ہے۔ مگر یہ وحدت لازمی طور پر ان کی عظمت کی دلیل نہیں ہے۔ شکسپیئر اور غالب کے یہاں ہمیں ایک ایسی آزاد حکیمانہ نظر ملتی ہے، جو کسی مخصوص نظریے یا تصورِ حیات کی پابند نہیں ہوئی۔ ان شعراء کے یہاں زندگی اپنی پوری پہنائی، بوقلمونی، رنگارنگی اور تضادات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ دانتے یا ملٹن یا ٹیگور یا اقبال کے یہاں اس

پہنائی کو ایک خاص نظریے کی عینک سے دیکھا گیا ہے۔ میں ذاتی طور پر غالب کی آزاد وحدت کو بڑا درجہ دیتا ہوں۔ مگر میرا مطالعہ اور محدود بصیرت مجھے یہ کہنے پر بھی مجبور کرتے ہیں کہ دانتے یا ملٹن، یا ٹیگور یا اقبال یا ڈبلیو۔ بی۔ یے ٹس یا ایلیٹ کی عینک کا نہ صرف شاعری میں جواز ہے، بلکہ وہ بھی بڑے شاعری کے دائرے میں آتے ہیں۔ ادب میں آزاد وحدت اور مخصوص وحدت دونوں کی گنجائش ہے۔"

اس قسم کی بے لاگ اور بصیرت افروز رائے سرور صاحب جیسے صاحبِ بصیرت نقاد ہی دے سکتے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کا اصل میدان 'لسانیات' ہے۔ لیکن انھوں نے دوسرے ماہرین لسانیات کی طرح لسانیات کو محض نظریے تک ہی محدود نہیں رکھا ہے، نہ ہی اس کی تطبیق صرف نثری ادب تک ہی رکھی ہے، بلکہ انھوں نے اطلاقی لسانیات (APPLIED LINGUISTICS) کا دائرۂ عمل شاعری کے میدان تک پھیلایا ہے۔ آپ نے اردو کے متعدد شعراء کے کلام کو لسانیات کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور ان کے صوتیاتی نظام کی تشریح کی ہے۔ متذکرہ سمینار میں آپ نے اقبال کی دو شاہکار نظموں "خضر راہ" اور "مسجد قرطبہ" کی لسانیاتی نقطۂ نظر سے باز آفرینی کی کوشش کی اور حق تو یہ ہے کہ مطالعہ کا حق ادا کر دیا۔ اس مقالہ میں آپ نے ان دونوں نظموں کے سیاسی پس منظر اور اس کے اثرات سے پیدا ہونے والی اقبال کی ذہنی کشمکش سے بحث کی ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے فنی محاسن پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے نتیجہ میں تفہیم اقبال کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔

'اقبال کے کلام میں تضمین اور ترکیب' سید حامد صاحب کا مقالہ ہے جو کافی دل چسپ اور پُر از معلومات ہے۔ اس میں دوسرے شعراء کے ان اشعار سے

بحث کی گئی ہے جنھیں اقبال نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں بطور تضمین استعمال کیا ہے یا ان کے کسی حصہ کو اپنے مصرعوں میں بطور ترکیب باندھا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بطورِ تمہید تضمین کی تعریف بیان کی ہے اور اس کے مختلف اقسام بتائے ہیں۔ اس طرح تضمین کی مفصل، جامع اور مستند تعریف و تشریح پہلی بار دیکھنے میں آتی ہے۔ سید صاحب نے جس شرح و بسط اور گہرائی سے اقبال کی تضمینوں سے بحث کی ہے وہ ان کے مطالعہ کی وسعت اور ہمہ گیری کا مظہر ہے۔ اقبال کے فارسی اور اردو کلام کو حرفاً حرفاً پڑھنا اور اس میں دوسرے شعراء کے اشعار اور مصرعے تلاش کرنا، بڑی عرق ریزی کا اور محنت طلب کام ہے۔ اس قسم کے مطالعہ میں دلچسپی کم، اکتاہٹ زیادہ ہوتی ہے اس لیے عام ناقدین اس کے مطالعہ سے گریز کرتے ہیں حالانکہ اسی نوع کا مطالعہ بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ سید حامد صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اقبال کا یہ خشک اور دقت طلب مطالعہ کیا اور اس کو انتہائی دلچسپ اور مفید انداز میں پیش کیا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جن اشعار کو اقبال نے بطور تضمین یا ترکیب استعمال کیا ہے، ان کے خالقوں کی نشاندہی بھی کردی جاتی تو مقالہ مزید معلوماتی اور مفید ہوجاتا۔ یہ ایک نفسیاتی مسلّمہ ہے کہ جب تک فن کار کا علم نہیں ہوجاتا، اس وقت تک فن پارہ سے کماحقہٗ لطف اندوز نہیں ہوا جاسکتا۔ اس کے علاوہ بھی چند باتیں مزید محلِ نظر ہیں۔ مثلاً سید صاحب فرماتے ہیں:

> "اقبال کے یہاں تضمین کا احسان دوطرفہ ہے۔ نظم کو تضمین سے چار چاند لگ جاتے ہیں، اور جس شعر پر تضمین کی گئی اقبال حسنِ تضمین سے اسے معنویت، نیا رُخ اور تموّل عطا کردیتا ہے۔"

یہ بات کچھ اقبال ہی سے مختص نہیں ہے۔ ہر بڑا شاعر جب بھی کسی شعر کی تضمین کرتا ہے وہ اس شعر کو رفعت اور بلندی بخش دیتا ہے اور یہی تضمین کی خوبی بھی ہوتی ہے۔

وہ تضمین جو شعر کو نیا مفہوم عطا نہیں کرتی اور جو اس کو نئے افق سے آشنا نہیں کرتی، اعلیٰ تضمین نہیں ہوتی، اس لیے اس کو زیرِ بحث بھی نہیں لایا جاسکتا۔

ایک جگہ سید صاحب لکھتے ہیں: "'نصیحت' نام کی نظم بارہ شعروں پر مشتمل ہے۔" یہاں راقم الحروف کو لفظ نام پر اعتراض ہے۔ ایسے مواقع پر 'عنوان' کا استعمال زیادہ مناسب رہتا ہے۔ اسی طرح فاضل مقالہ نگار کا یہ خیال: "گویا یہ تضمینیں نہ صرف فارسی زبان وادب سے اقبال کے شغف کو ظاہر کرتی ہے، بلکہ اقبال کے فارسی کلام کا پیش خیمہ ہیں" بھی مزید غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

مقالہ کے دوسرے حصہ میں اقبال کی مخصوص ترکیبوں سے بحث کی گئی ہے اور بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم وغیرہ سے اس قسم کی تمام تراکیب کو زمانی اعتبار سے پیش کیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ "ترکیب سازی کا ارتقاء شاعری کے دوش بدوش چل رہا ہے۔ اقبال کی مخصوص تراکیب سے تفصیلی بحث یوسف حسین خاں صاحب 'روحِ اقبال' اور 'حافظ اور اقبال' میں بہت پہلے کر چکے ہیں۔

پروفیسر گیان چند ہمارے محققین اور ناقدین میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ سنجیدگی، متانت اور خیال کی گیرائی آپ کے طرۂ امتیاز ہیں۔ فنِ عروض پر بھی آپ کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ آپ نے اردو کے مختلف شعراء کے کلام کو عروض کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اس سے دلچسپ اور معنی خیز نتائج برآمد کیے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں آپ کا مقالہ "اقبال کے اردو کلام کا عروضی مطالعہ" کے عنوان سے ہے۔ غالباً یہ اپنی نوعیت کی اولین کوشش ہے۔ اس میں اقبال کے مکمل اردو کلام کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ اس کے لیے دو جدولیں بنائی گئی ہیں۔ پہلی جدول میں اشعار کے اوزان کا شمار کیا گیا ہے۔ اس میں اوزان کو کثرتِ استعمال کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ یعنی سب سے پہلے وہ وزن لیا گیا ہے جس میں اشعار کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد اس سے کم مستعمل

وزن - اس طرح پوری جدول (DESCENDING ORDER) میں پیش کیا گیا ہے - دوسری جدول میں اشعار کے بجائے نظموں اور غزلوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے - اس میں بھی اولیت اُس وزن کو دی گئی ہے جس میں اقبال نے سب سے زیادہ نظمیں کہی ہیں - ان دونوں جدولوں میں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز سے علیحدہ علیحدہ اشعار کی تعداد اور نظموں کی تعداد کو دکھایا گیا ہے - یہ کام بڑی عرق ریزی اور پتّے ماری کا ہے - ایک ایک شعر کو شمار کرنا اور پھر انھیں بحر کے اعتبار سے مجموعہ تعداد کا شمار کرنا اور پھر انھیں بحر کے اعتبار سے ترتیب دے کر مجموعہ تعداد کا شمار کرنا، جتنا مفید کام ہے، اتنا ہی مشکل اور ہمت شکن بھی ہے - اس کے باوجود جین صاحب نے اس کام کو انجام دیا اور اس صورت سے پیش کیا کہ حق ادا کر دیا -

اقبالؔ کوئی بہت بڑے عروضی نہیں تھے - اس کے غوامض پر ان کی نظر نہیں تھی انھیں صرف حسبِ ضرورت اس میں مہارت حاصل تھی، اس لیے اگر ان کے کلام کا عمیق اور گہرا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اکثر مقامات پر ان سے کچھ تسامحات ہو گئے ہیں جن میں کچھ تو بہت واضح ہیں اور کچھ فروعی اور غیر اہم - ڈاکٹر گیان چند نے ان سب کی نشاندہی کی ہے اور بہت محتاط الفاظ میں ان غلطیوں اور کمزوریوں کو بیان کیا ہے -

پروفیسر اسلوب احمد انصاری انگریزی کے عدیم المثال اسکالر ہیں - اپنے انگریزی تجربات کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا ملکہ رکھتے ہیں - اردو نقادوں میں آپ کی منفرد لَے ہے، ایک مخصوص اسلوب ہے جس میں انگریزی خیالات، انگریزی الفاظ اور انگریزی محاورات کی کثرت ہوتی ہے - یہ طرز ابھی تک اردو میں نامانوس ہے - آپ کی تحریروں کی سطح اتنی بلند ہوتی ہے کہ عام قاری کی اس تک رسائی نہیں ہوتی - آپ

کے مقالہ کا عنوان ہے "اقبال کے ہاں تصورات کی شاعری"۔ مقالہ آپ کے مخصوص انداز فکر اور منفرد طرزِ بیان کا آئینہ دار ہے۔ اس میں بھی انگریزی الفاظ اور مصطلحات کی کثرت ہے جس سے عبارت کا تسلسل مجروح ہو جاتا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد علامہ اقبال کے پرستاروں میں ہیں۔ آپ کا مقالہ "ترمیماتِ اقبال کا تنقیدی جائزہ" بڑا دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ اس سے اقبال کی شاعری کے ارتقائی منازل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبال میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ سید صاحب عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ماہرِ لسانیات بھی تھے۔ اقبال ان کی زبان دانی کے معترف تھے۔ ۱۹۱۸ء میں "رموزِ بیخودی" شائع ہوئی۔ سید صاحب نے "معارف" (اپریل ۱۹۱۸ء) میں اس پر طویل تبصرہ شائع کیا جس میں "رموزِ بیخودی" کے محاسن بیان کرنے کے ساتھ ساتھ، زبان و بیان کی فروگذاشتوں کی طرف بھی اشارے کیے گئے تھے۔ علامہ اقبال کی یہ اعلیٰ ظرفی تھی کہ انھوں نے اس تبصرے کو نہ صرف سراہا بلکہ سید صاحب سے بالاصرار اس کی تفصیل بھی معلوم کی۔ اور جب سید صاحب نے ان فروگذاشتوں سے اقبال کو آگاہ کیا تو علامہ نے ان میں سے بیشتر اعتراضات کا اعتراف کیا لیکن چند باتوں سے اتفاق نہیں کیا۔ اس سلسلے میں اپنے دفاع میں بہت سے فارسی اساتذہ سخن کے کلام اور مختلف کتبِ لغات سے اسناد پیش کیں۔ اس سے اقبال کی وسعتِ مطالعہ اور عمیق نظری کا پتہ چلتا ہے۔ سید صاحب کے علاوہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے بھی متعدد بار اقبال کی توجہ ان کی فروگذاشتوں پر مبذول کرائی۔ علامہ نے ان کو بھی بہ نظرِ تحسین دیکھا اور ان سے ہمیشہ ایسے کرتے رہنے کی درخواست کی اور ایک بار تو یہاں تک لکھا: "آپ نے جو ریمارکس اس کے اشعار پر لکھے ہیں ان کے لیے آپ کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ آپ لوگ

نہ ہوں تو واللہ ہم شعر کہنا ہی ترک کردیں۔"

پروفیسر آزاد نے اپنے زیرِ نظر مقالے میں ان مباحث کو پیش کیا ہے جس کے لیے وہ محققین ادب اور ماہرینِ لسانیات کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس مقالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر بڑے اور سچے فنکار کی مانند اقبال بھی اپنی تخلیقات کو ہمیشہ خوب سے خوب تر بنانے کی فکر میں رہتے تھے اور مختلف اوقات میں حک و اصلاح کا عمل جاری رکھتے ہوئے اپنے کلام کو سنوارتے رہتے تھے۔

اقبال کے کلام میں الفاظ بڑے منظم اور مربوط سلسلے سے استعمال ہوئے ہیں۔ اقبال نے رعایتِ لفظی کا خصوصی اہتمام کیا ہے اور اس کے ذریعہ کلام میں حسن پیدا کیا ہے ان کے کلام کی صحیح تفہیم کے لیے اس صوتی اور لفظی نظام کا سمجھنا ضروری ہے۔ یہی نظام ان کے کلام میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال نے غالب سے بڑا فیضان حاصل کیا ہے۔ فن شاعری میں وہ سب سے زیادہ غالب کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تفحص الفاظ اور ان کے برجستہ استعمال کا جو سلیقہ ہے اس پر غالب کے فن کی چھاپ نظر آتی ہے۔ لیکن اس خوبصورتی سے کہ اس میں اقبال کی انفرادیت اور ORIGINALITY کی شان دوبالا ہوگئی ہے۔ غالب کے علاوہ میر تقی میر، میر انیس اور مومن کے یہاں بھی یہ نظام انتہائی دلآویز اور ترقی یافتہ شکل میں ملتا ہے۔ اقبال بھی اس زمرے میں شامل ہو گئے ہیں۔ مگر ذرا سے فرق کے ساتھ میر، غالب، انیس اور مومن کے یہاں یہ فطری انداز میں ہے، اسی لیے اس میں آمد کی جلوہ گری زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف اقبال کے یہاں یہ صفت کوشش، ریاضت اور محنت شاقہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے اس میں کہیں کہیں غیر فطری پن آگیا ہے اور آورد کی بالادستی قائم ہوگئی ہے۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مقالے 'اقبال کا لفظیاتی نظام' میں اقبال کی اسی خصوصیت سے بحث کی ہے اور ان کے کلام میں رعایتِ لفظی کا بالخصوص تفصیلی

جائزہ لیا ہے۔ مقالے کی تمہید طویل ہے۔ پچیس صفحات پر مشتمل مقالہ میں تقریباً آٹھ صفحے اس ہی کی نذر ہو گئے ہیں۔ اصل موضوع سے گفتگو بارہ صفحے سے زیادہ میں نہیں ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس مقالے میں اقبال کے مکمل کلام کا احاطہ کیا جائے گا لیکن مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس میں صرف ایک نظم "ذوق و شوق" کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ فاروقی صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران صرف یوسف سلیم چشتی کی آراء سے بحث کی ہے حالانکہ دوسرے ماہرین اقبالیات نے بھی اقبال کے صوتی نظام پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں یوسف حسین خاں صاحب کا اسم گرامی سر فہرست ہے۔ آپ نے 'روحِ اقبال' اور 'حافظ اور اقبال' میں اس موضوع پر سیر حاصل تبصرے کیے ہیں۔ ان کی موجودگی میں فاروقی صاحب کی یہ شکایت کہ: "اقبال کا کلام رعایتِ لفظی سے اتنا ہی مملو ہے، جتنا غالب کا کلام ہے۔ لیکن بوجوہ نقادوں کی نگاہ اس نکتے پر نہیں پڑی ہے" کچھ زیادہ حقیقت پسندانہ معلوم نہیں ہوتی۔ فاروقی صاحب کی یہ رائے کہ: "واقعہ یہ ہے کہ اقبال کا کلام اپنی انفرادیت کے باوجود اجنبیت کا تاثر اسی وجہ سے نہیں پیدا کرتا کہ وہ اردو شاعری کی بہترین لفظیاتی روایت کا روشن نمونہ ہے" بھی محل نظر ہے۔ یہ رائے اقبال کی چند ایسی نظموں کے لیے تو درست ہو سکتی ہے جنھوں نے شاہکار کا درجہ حاصل کر لیا ہے، لیکن بقیہ کلام پر اس خصوصیت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر وحید اختر کا مقالہ 'اقبال کا تصورِ فن' فکر انگیز اور پر مغز ہے۔ وحید اختر صاحب فلسفہ کے استاد ہیں۔ آپ کی تحریروں میں چاہے وہ ادبی ہوں، تنقیدی ہوں یا متصوفانہ، سب میں فلسفیانہ انداز نمایاں رہتا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں بھی فلسفیانہ انداز غالب ہے۔ اس میں اقبال کے تصورِ فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اقبال کے تصورِ شاعری اس کے فن اور لوازم فن کا ژرف نگاہی سے مطالعہ کیا ہے اور اس کے تدریجی ارتقاء

پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آپ کی اس رائے سے ہر ذی علم اتفاق کرے گا کہ: "اقبال کا تصور شعر جدید شعریات کے لیے مناسبت و معنویت کا حامل ہے۔" البتہ آپ کی اس رائے کو ماننے میں تامل ہوتا ہے کہ: "اقبال کی اپنی شاعری نے کلاسکیت سے رومانیت کی طرف سفر کیا۔ رومانیت کے اس سفر میں انھوں نے ورڈس ورتھ اور گوئٹے سے اثر قبول کیا۔ بعد میں ان کے یہاں رومانیت و کلاسکیت کا وہ امتزاج نظر آتا ہے جس کی تشکیل میں ملٹن، دانتے اور رومی کا گہرا اثر ملتا ہے۔ ابتدا میں ان کے کلاسیکی آہنگ پر انیس کا اثر ملتا ہے۔ پھر ان کے یہاں بیدل اور غالب کے لہجے کی پرچھائیاں نمایاں ہونے لگیں۔"

یہ بات بالکل پہلی بار سننے میں آئی ہے کہ اقبال نے کلاسکیت سے رومانیت کی طرف سفر کیا۔ اسی طرح یہ انکشاف بھی پہلی بار ہو رہا ہے کہ اقبال کے کلاسیکی آہنگ پر انیس کا اثر ہے۔

وارث علوی کا مقالہ "شاعری، فلسفیانہ شاعری اور اقبال" کے عنوان سے ہے۔ علوی صاحب نے اقبال کے فلسفیانہ افکار اور شاعری میں ان کے اطلاق و اظہار کا تجزیہ کیا ہے۔ آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے: "اقبال کامیو اور سارتر ہی کی مانند فلسفیانہ فکر کا استعمال زندگی کو نئی معنویت عطا کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ وہ فلسفہ جو ان کی نثر اور شاعری میں بکھرا پڑا ہے، نتیجہ ہے اُن سوالوں کے جواب پانے کا جو تجرباتِ حیات کے زائیدہ ہیں۔ جواب کی جستجو میں وہ مشرق و مغرب کے فکری سرچشموں کو کھنگا لتے ہیں۔ اسلامی فکر کے جھرنے پر ان کی پیاس بجھتی ہے لیکن دوسرے مکاتیب فکر سے انھوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اسے وہ ترک نہیں کرتے بلکہ اسلامی نظام فکر کی روشنی میں اس کا تخلیقی استعمال کرتے ہیں۔" یہ علامہ کے فکر و فن کا بڑا حقیقت پسندانہ تجزیہ ہے۔ البتہ ایک عام قاری کو جو بات کھٹکتی ہے

وہ یہ ہے کہ اس مقالے میں انگریزی الفاظ اور مصطلحات کا استعمال بڑی کثرت سے کیا گیا ہے، جو اکثر مقامات پر غیر ضروری بھی ہے۔ اس سے عبارت کی چاشنی، شگفتگی اور سلاست مجروح ہو گئی ہے۔ مثلاً

Irony, Cosmic Dimension, Alternative Norms, Ideals, Totalitarian, Explosive, Defince Dilemma, Original, Comman Sense, Pattern, Concrete, Organic, Statement

وغیرہ الفاظ کا استعمال علوی صاحب نے بے محابا کیا ہے حالانکہ بڑی آسانی سے ان سے اجتناب کیا جا سکتا تھا۔ یہ الفاظ ایسے ہیں جن کے مترادفات اردو میں رائج ہیں اور نہ صرف رائج ہیں بلکہ اپنی پوری آب و تاب، وسعت اور رفعت کے ساتھ جلوہ گر بھی ہیں۔ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان میں سے اکثر انگریزی مقابلہ میں کہیں زیادہ حسن اور جامعیت کے حامل ہیں۔

اردو میں لسانیاتی مطالعہ کا رواج عام نہیں ہے۔ ہم اب تک شعراء کے کلام کو بلندیِ فکر، معنی آفرینی، جذبات نگاری اور طرزِ ادا کی کسوٹی پر پرکھتے رہے ہیں۔ اس طرح لسانیات کا پہلو یکسر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بات کچھ اردو کے ساتھ ہی مختص نہیں ہے۔ دوسرے ادبیات میں بھی لسانیاتی اور اسلوبیاتی تنقید کا فقدان رہا ہے۔ مغربی ادبیات بھی بیسویں صدی کے ربعِ اول تک اس قسم کی تنقید سے عاری تھے۔ اس طرف سب سے پہلے غالباً آئی۔ اے۔ رچرڈز (I. A. RICHARDS) نے توجہ کی۔ اس نے اپنی معرکۃ الآرا تالیف 'Practical Criticism' (مطبوعہ لندن: ۱۹۲۹ء) کے ذریعہ ادبی تنقید پر لسانیات کی ابتدا کی۔ اس کے فوراً بعد ولیم امپسن WILLIAM EMPSON نے Seven types of Ambiguity (مطبوعہ لندن: ۱۹۳۰ء) میں رچرڈز کی ہم نوائی کی اور

اس کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھایا۔ ان حضرات نے شاعری پر تنقید میں فنی مہارت کے ساتھ زبان اور لسانیات کے پہلو کو بھی اہمیت دی اور اس طرح ادبی تنقید میں اطلاقی لسانیات کا باب کھولا۔ اس روایت کو اس صدی کے نصفِ دوم کے ابتدائی سالوں میں بلوم فیلڈ (BLOOMFIELD) نے ایک نئی سمت عطا کی۔ اس نے فن پارے کی حسن و قبح کی شناخت کے لیے معنیٰ آفرینی کو نظر انداز کر کے، زبان کی ساخت اور اس کی صوتی و نحوی خوبیوں پر زور دیا اور 'اسلوبیاتی تنقید' کو باقاعدہ شکل میں پیش کیا۔ اردو میں اس قسم کی اسلوبیاتی تنقید کا اولین بھرپور تجربہ ڈاکٹر مغنی تبسم کی تالیف 'فانی بدایونی' (مطبوعہ حیدرآباد: ۱۹۶۹ء) میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ گزشتہ تقریباً پندرہ سال سے پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی تنقید کا رخ اس طرف موڑ دیا ہے۔ آپ نے غالبؔ، اقبالؔ اور فانیؔ وغیرہ کے کلام کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا ہے، اور بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس میدان میں قدم رکھا ہے، اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ نارنگ صاحب فنِ نقد پر کامل عبور رکھتے ہیں، اور لسانیات کے غوامض سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ آپ نے ادبی اصولِ نقد میں لسانیاتی خصوصیات کے مطالعہ کو سمو کر اسلوبیاتی تنقید کا مشکل کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں آپ کے دو مقالات شامل ہیں۔ دونوں کا موضوع تقریباً یکساں ہی ہے۔ پہلے مقالہ کا عنوان ہے 'اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام' اور دوسرے مقالے کا "اسلوبیاتِ اقبالؔ"۔ پہلے مقالہ میں اقبال کے اردو کلام کے صوتیاتی نظام سے بحث کی گئی ہے۔ یہ اسلوبیاتی مطالعہ کا صرف ایک پہلو ہے۔ اپنے موضوع سے بحث کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار ایک بات بڑے پتے کی کہہ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "آہنگ سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے فضا سازی یا سماں بندی میں مدد ملتی ہے۔ اور یہ فضا سازی کسی بھی معنیاتی تاثر

کو ہلکا، گہرا یا تیکھا کر سکتی ہے۔" اس کے تناظر میں انھوں نے اقبال کے ابتدائی دور کی ایک مختصر نظم "ایک شام" کا ماحولیاتی اور معنیاتی تجزیہ کیا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ اقبال کے کلام میں جو چاشنی اور نغمگی ہے اس کا راز یہی ہے کہ اس میں صوتیاتی نظام بڑا منظم اور منضبط ملتا ہے اور اس حیثیت سے اقبال کا کلام رفعت کی ان منزلوں کو چھو لیتا ہے جہاں جاتے ہوئے دوسروں کے پر جلتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اقبال کے بارے میں یہ بات عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ ان کی آواز میں ایک ایسا جادو، ایسی کشش اور نغمگی ہے جو پوری اردو شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے لہجے میں ایسا شکوہ، توانائی، بے پایانی اور گونج کی ایسی کیفیت ہے جیسے کوئی چیز گنبد افلاک میں ابھرتی .... اور پھیلتی ہوئی چلی جائے۔ اس میں دل نشینی اور دلآویزی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی برّش روانی، تندی اور چستی ہے جیسے سرود کے کسے ہوئے تاروں سے کوئی نغمہ پھوٹ بہا ہو، یا کوئی پہاڑی چشمہ ابل رہا ہو۔"

گر خود فاضل مقالہ نگار کے طرز بیان پر غور کیا جائے تو اس میں بھی ہمیں مذکورہ خصوصیات ن سے بیشتر کی جلوہ گری نظر آئے گی۔ زیر نظر مقالہ میں زبان کی چاشنی بھی ہے، روانی ھی اور نغمہ کا زیر و بم بھی۔ اس حسین اور رومانی نثر کے ذریعہ مقالہ نگار نے خشک اور یر دلچسپ موضوع کو دل چسپ اور گوارا بنا دیا ہے۔ عبادت میں یہ خوبی بڑی ریاضت ور محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب لکھنے والے کو زبان کامل قدرت ہو، اس کے پاس بہترین الفاظ کا وافر ذخیرہ موجود ہو اور وہ اس خیرہ کو مناسب انداز میں استعمال کرنے کا سلیقہ بھی رکھتا ہو۔ پروفیسر نارنگ ان ام صفات سے متصف ہیں، اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ جن حضرات کو ان کی تقریریں نے اور تحریریں دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ ضرور اس کی تصدیق کریں گے۔

ایک شاہکار کے تجزیے کے بعد مسجد قرطبہ، ذوق و شوق اور خضر راہ جیسی شاہکار نظموں کا صوتیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اس میں حسب موقع میرؔ اور غالبؔ سے بھی موازنہ کیا ہے۔ اس تقابلی مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

"اقبال کے یہاں صفیری و مسلسل آوازوں اور طویل و غنائی مصوتوں کا یہ ربط و امتزاج ایک ایسی صوتیاتی سطح پیش کرتا ہے جس کی دوسری نظیر اردو میں نہیں ملتی۔ اصوات کی اس خوش امتزاجی نے اقبال کے صوتیاتی آہنگ کو ایسی دلآویزی، توانائی، شکوہ اور آفاق میں سلسلہ در سلسلہ پھیلنے والی ایسی گونج عطا کی ہے جو اپنے تحرک و تموج اور امنگ و ولولے کے اعتبار سے بجا طور پر یزداں گیر کہی جا سکتی ہے"

دوسرے مقالے میں اسلوبیات اقبال کا مطالعہ اسمیت اور فعلیت کے نظریے کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ چونکہ اول الذکر مقالے میں اقبال کے صوتیاتی نظام کا مطالعہ کیا گیا تھا اس لیے زیر نظر مقالے میں صرفی و نحوی امتیازات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس میں بھی صرف اسمیت NOMINALIZATION اور فعلیت VERBALISATION تک ہی بحث کو محدود رکھا گیا ہے۔ اس مقالے کو دراصل پہلے مقالے کے تسلسل CONTINUATION کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ اس میں فاضل مقالہ نگار نے قواعد صرف و نحو سے بحث کی ہے اور افعال و اسماء کے مختلف پہلوؤں (SHADES) پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کے اردو کلام میں ان کے استعمال کا جائزہ لیا ہے۔ یہ ایک نادر کوشش ہے۔ اس نوع کا تجربہ پہلی بار دیکھنے میں آیا ہے۔ اسکی افادیت اور اہمیت مسلم ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہ ایک ایسا نغمہ ہے جو ہر ساز پر نہیں گایا جا سکتا۔ اس کیلئے کچھ خاص دل ہی مخصوص ہوتے ہیں۔ اردو میں ابھی

یہ تجزیے عام نہیں ہیں اس لیے ان کی لَے کچھ اجنبی سی معلوم ہوتی ہے۔ نارنگ صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کی یہ تحقیق بہت دل چسپ ہے کہ اقبال کے کلام میں کہیں افعال کے مقابلہ میں اسماء زیادہ استعمال ہوئے ہیں اور نظموں کے بند کے بند افعال سے یکسر خالی ہیں اور کہیں صورت حال اس کے برعکس بھی ہے یعنی افعال کی کثرت ہے اور اسمیت کے مقابلہ میں فعلیت پر زور ہے۔ اس تبدیلی مزاج کے اسباب کا پتہ لگانے کے لیے وہ اقبال کے مزاج کی تہہ میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کی افتاد طبع کا ایک ماہر نفسیات کی طرح مطالعہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

اس میں شک نہیں کہ اقبال جب مجرد تصورات کے بارے میں فکر کرتے ہیں یعنی زمان و مکاں، یا عقل و عشق یا خودی و سرمستی ......

...... یا فقر و قلندری، تو ان کا لہجہ خاصا غیر شخصی ہوتا ہے اور اسمیت کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ مسجد قرطبہ کے پہلے، دوسرے، تیسرے اور پانچویں بند میں یہی کیفیت ہے۔ چوتھے اور چھٹے بند میں جہاں خطاب کا انداز ہے، افعال کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ ساتواں بند جس میں تاریخی صورت حال کا بیان ہے، اس میں افعال اور زیادہ استعمال ہوئے ہیں اور آخری بند جس میں منظر کاری بھی ہے، وہ پہلے بند کی اسمیت سے بالکل متضاد کیفیت رکھتا ہے۔ اس بند کے ہر ہر شعر میں فعل کا عمل دخل دیکھا جا سکتا ہے۔"

[اس] طرح اقبال گویا اسمیت سے زیادہ کام لیتے ہیں اور اسے ایک تخلیقی حربے کے طور [پر] استعمال کرتے ہیں لیکن جلد ہی وہ اس کی حد بندی سے باہر نکل آتے ہیں اور فعلیت [کے] وسیع و عریض میدان میں قدم رکھتے ہیں اور اس طرح وہ اسمیت اور فعلیت کے [مت]ناسب استعمال سے اپنے کلام کو موزونی، نغمگی اور رفعت بخشتے ہیں۔ ایک عظیم شاعر

کا بھی کارنامہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے مکالماتی انداز کا بھی سہارا لیا ہے جس سے ان کے کلام میں نحوی، صرفی اور صوتیاتی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اقبال کے مجموعی کلام میں فعلیت کے عمل دخل کے بارے میں پروفیسر نارنگ کا یہ خیال بڑا وقیع اور اہمیت کا حامل ہے:

"فعل کا استعمال اقبال کے یہاں غیر رسمی (؟) نہیں ہے اور اگرچہ نئی گرامر خلق کرنے کی کوشش نہیں ملتی، لیکن یہ بات اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے کہ اقبال نے معنیاتی وسعتوں کی پیمائش میں فعلیت کے گوناں گوں امکانات سے کام لیا۔ اور لہجے کی حجازیت اور عجمیت کے باوصف اسی فعلیت نے اردو سے ان کے تہہ در تہہ تخلیقی رشتے استوار رکھنے میں مدد دی۔"

مجموعی طور پر یہ مجموعۂ مقالات بہت کارآمد اور مفید ہے۔ اس سے اقبال کی تفہیم کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اس کے مباحث بڑے اہم ہیں اور جس انداز سے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہ انتہائی معیاری ہے۔ اس سے مقالہ نگاروں کے افکار کی بلندی، تخیل کی رفعت، مطالعہ کی وسعت اور زبان پر قدرت ٹپکتی ہے اس لئے ہم اس مجموعہ کو اقبالیات میں ایک اہم اضافہ قرار دے سکتے ہیں۔ اقبالیات پر اس وقت جتنا لٹریچر موجود ہے، اس میں زیر نظر مجموعہ کو ایک امتیازی شان حاصل ہوگی اس لیے کہ یہ باطنی حُسن کے ساتھ ظاہری حسن سے بھی مزین ہے۔ اسکی کتابت اور طباعت بھی بہت اعلیٰ اور معیاری ہے۔ پروفیسر نارنگ کو کتابیں ترتیب دینے اور انھیں حسین انداز میں شائع کرانے کا ملکہ حاصل ہے۔ منشورات، اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں، اردو افسانہ، روایت اور مسائل، اور انیس شناسی کو اس دعوے کے ثبوت میں بلا خوف تردید پیش کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ بھی اسی زمرے میں آتا

ہے۔ اس طرح نارنگ صاحب کی خوش سلیقگی، حسن ترتیب اور ذوق جمالیات نے اردو میں فن طباعت کو نئی سمت عطا کی ہے۔ اس کا ٹائیٹل نہایت جاذب نظر اور دیدہ زیب ہے۔ اس کی کتابت جناب خلیق ٹونکی نے کی ہے جو اس وقت بلاشبہ ہندوستان کے بہترین خطاط ہیں۔ ایسا حسین وجمیل مرقع پیش کرنے کے لیے فاضل مرتب لائق مبارکباد ہیں۔

آخر میں اتنا ضرور عرض کرتا چلوں کہ ان تمام اوصاف کے باوصف چند باتیں ایسی بھی ہیں جو کھٹکتی ہیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ اس میں مقالہ نگاروں کا تعارف نہیں ہے۔ یہ بات جدید ترین اصولوں کے منافی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں سے زیادہ تر حضرات ادب میں اپنا مخصوص مقام رکھتے ہیں اور ہند وبیرون ہند کے ادبی حلقوں میں کافی معروف ہیں۔ تاہم ان میں ایسے حضرات بھی شامل ہیں جنھیں ابھی شہرت اور ناموری کے مراحل سے گذرنا ہے۔ لہٰذا ان تمام شرکا رِ محفل کا تعارف کرا دیا جاتا تو عام قاری کے لیے یہ مجموعہ اور بھی زیادہ مفید ہو جاتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں اشخاص، اماکن اور کتب وغیرہ کا اشاریہ بھی نہیں دیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کے مجموعۂ مضامین میں اشاریے کا رواج نہیں ہے۔ غالباً اسی لیے فاضل مرتب نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ لیکن ایک جامع اور تفصیلی اشاریے کی اہمیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اسے شامل کر دیا جاتا تو یہ یقیناً ایک خوش آئند اضافہ ہوتا اور کتاب کی افادیت بھی بڑھ جاتی۔

اعلان

حضرت مفتی صاحبؒ کے سلسلے میں جو خاص نمبر شائع ہونے جارہا ہے۔ اس کی تاخیر کی اصل وجہ حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب ایڈیٹر رسالہ برہان کی طویل علالت ہے۔ آپ سے ان کی صحت کلی کے لیے دعا کی استدعا کرتا ہوں اور انشاء اللہ تعالیٰ میری یہ کوشش رہے گی کہ یہ شاندار معیاری نمبر حضرت مفتی صاحبؒ کے شایان شان بہت جلد شائع ہو اور حضرت مفتی صاحبؒ کے نام سے ایک اکیڈمی قائم کی جائے اور ان کی میموریل سوسائٹی یقیناً بنی چاہیئے اور مفتی عتیق الرحمن روڈ جامع مسجد کے علاقے میں قائم کیا جائے ــــ اس لیے دہلی اور باہر کے حضرات، حضرت مفتی صاحبؒ کے معتقدین اور محسنین سے اپیل کرتا ہوں کہ اس معاملے میں پوری دلچسپی لیں۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

جن حضرات نے اب تک مضامین نہیں بھیجے ان سے درخواست ہے کہ پہلی فرصت میں مضمون روانہ فرمائیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے جتنے بھی خطوط ہوں ان کو جمع کر کے اس لکھنے والے مضامین میں اس کو شامل کریں تاکہ اس کی میں اور اضافہ ہو۔ شکریہ

خادم

عمید الرحمن عثمانی

منیجر رسالہ برہان دہلی

ایڈیٹر	معاون ایڈیٹر
سعید احمد اکبر آبادی	عمید الرحمٰن عثمانی
سالانہ چندہ	قیمت فی پرچہ
چالیس روپے	تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۵ | رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق مئی ۱۹۸۵ء | شمارہ ۵

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اُردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

محمد اظہر صدیقی

ایک سال بیت گیا ——— ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو دن کے تین بجے ——— جب آسمان پر سورج اپنی پوری تابانیوں، حرارت اور تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا —— ٹھیک اُس وقت ایک آفتاب درخشاں اور ماہتاب ضوفشاں غروب ہوگیا جو علم ودین، شریعت وطریقت اخلاق وشرافت کی روشن روایات، تفقہ فی الدین دانشمندی وفراست دُور اندیشی وبصیرت کے آسمانوں پر گذشتہ تریسٹھ سال سے چمک رہا تھا ——— اور اپنی زرتاب کرنوں سے زندگی کے بہت سے میدانوں اور علم ودین و دانشمندی کے ایوانوں، ادب دانش کی محفلوں تصنیف وتالیف کے چمنستانوں کو برابر اور مسلسل منور کر رہا تھا ——— یعنی ملتِ اسلامیہ عالم کے مخلص رہنما خادم انسانیت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ ۸۳ سال کی عمر میں اس دارِفانی سے رخصت ہوگئے۔

ہاں وہ آفتاب درخشاں غروب ہوگیا جس کی زرتاب کرنوں نے تاریخ کے صفحات کو اخلاص وایثار خدمتِ خلق قرآن وسنت کی ترویج واشاعت کے، بہت سے روشن اور گراں مایہ نقوش عطا کئے تھے، آہ وہ آفتاب جس کی بدولت اور جس کی مخلصانہ کوششوں

سے کتنے نوجوانوں کے ذہن وفکر کے افق روشن ہوئے تھے، ان کو زندگی کے میدانوں، علم وادب کے شبستانوں اور درس وتدریس کے مسندوں کی رونق بننے کی صلاحیت ملی تھی۔

بلاشک وشبہ حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی ــــ قیمتی زندگی ــــ جہد مسلسل اور کوشش پیہم کا نمونہ تھی وہ ملت کی تعمیر واصلاح کے اہم مقصد میں اور علم ودین کی ترویج واشاعت میں اس طرح لگے رہے کہ کوئی لمحہ بے فکری کا باقی نہیں رہا اس لئے کہ وہ اس نبی برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شیدائی اور پیرو تھے جو رحمت اللعٰلمین تھا، معلم اخلاق تھا، محسن انسانیت تھا ــــ راہ کی دشوار گذاریاں، پیچ وخم ــــ راستہ کے نشیب وفراز اور ناہمواریاں ان کے پائے عزم وثبات میں کبھی لغزش نہ لا سکیں۔ ان کا عقیدہ تھا، کہ زندگی کے آخری سانس تک ملت اسلامیہ اور پوری انسانیت کی خدمت کے میدان میں پیہم، مسلسل اور لگاتار سرگرم عمل رہنا اس امت کے فرد کی حیثیت سے ان کا مقصد حیات اور فریضہ ہے جو خالق کائنات کی طرف سے خیر امت کے اہم لقب کے ساتھ اس زمین کے اوپر بھیجی گئی ہے

لاریب ــــ ! کہ مفتی صاحب مجسم محبت تھے مجسم شرافت تھے ان کا قلب ایک ایسا صاف وشفاف آئینہ تھا جس پر کسی کی برائی کا کوئی معمولی سا بھی داغ نہ تھا، تنگ نظری وتنگ دلی سے وہ کوسوں دور رہے وہ اسلاف واکابر اور روحانیت کے تاجدار بزرگوں، اولیائے کرام، اور علمائے اسلام کے اس بلند ومقدس قافلہ کی یادگار تھے جس کے بغیر ہماری شاہراہ علم وعمل تنگ وتاریک دکھائی دیتی ہے۔ وہ عظمت کا منار بھی تھے، علم وتفقہ کا پہاڑ بھی تھے فکر وتدبر کا ایسا روشن چراغ بھی تھے جس کی لو آندھیوں کا مقابلہ کرتی ہے، طوفانوں اور سیلابوں کی تباہ کاریوں کے سامنے سینہ تانے کھڑی رہتی ہے اور گھٹاٹوپ اندھیاروں میں روشنی پیدا کرتی ہے ــــ ہاں ــــ ! وہ چراغ ضوفشاں جو زبان حال سے یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ ؎

جلتے رہے ہم تند ہواؤں کے مقابل
آزاد چراغ تہہ داماں نہ رہے ہم

حضرت مفتی صاحبؒ ہندوستان کے انقلابی علماء کے اس گروہ میں شروع سے ہی شامل رہے جس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک تاریخی موقع پر ـــــ اجلاس جمیعۃ علمائے ہند منعقدہ کراچی ۱۹۳۱ء میں مہاتما گاندھی کو مخاطب کرتے ہوئے اور اُن سے علمائے ہند کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ ـــــ

"گاندھی جی ــــ ! آپ کے سامنے یہاں جو یہ بوریہ نشین علماء بیٹھے ہوئے ہیں اُنھوں نے انقلابِ فرانس نہیں پڑھا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت مسلمانوں میں اور پورے ملک میں اِن سے بڑی انقلابی جماعت کوئی دوسری موجود نہیں ہے ــــ"

حضرت مفتی صاحبؒ نے ۱۹۱۹ء سے ہی ملکی تحریکات میں فکری و عملی حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور زندگی کے آخری سانس تک ملک وملت کی خدمت کرتے رہے۔

بلا شک وشبہ وہ مدبر تھے مفکر تھے اور سیاسی بصیرت اور ملکی و بین الاقوامی معاملات میں بلند پایہ فہم و فراست رکھتے تھے مگر وہ اس قسم کے سیاست داں نہیں تھے جس کے متعلق ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ ــــ "سیاست داں صرف اپنی ذات کے لئے سوچتا ہے" یا گذشتہ سال ہمارے نائب صدر جمہوریہ کا یہ مقولہ "ٹائمز آف انڈیا" میں شائع ہوا تھا کہ ــــ "ایک سیاسی لیڈر اگلے الیکشن کے بارے میں سوچتا ہے جب کہ سیاسی مدبر اگلی نسل کے لئے سوچتا ہے ــــ"

بلا شک وشبہ حضرت مفتی صاحبؒ ایسے سیاسی مدبر، مفکر اور دانشور تھے جن کی نگاہیں دنیائے انسانیت کے مستقبل پر لگی رہتی ہیں اور جن کے دل و دماغ اور ذہن و فکر کی ساری توانائیاں حال کو سنوارنے، اس کے پیچیدہ مسئلوں اور الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وقف رہتی ہیں، آنے والی نسلوں کی فکر بھی دامن گیر رہتی ہے

اور مستقبل کو تابناک بنانے کی دھن اور لگن سے بھی وہ خالی نہیں ہوتے ۔ الیکشنی سیاست سے حضرت مفتی صاحب کی دلچسپی صرف اسی حد تک رہتی تھی ان کی خواہش اور کوشش ہوتی تھی کہ ملک کے قانون ساز اداروں میں ایسے صاف ذہن وسیع قلب، سیکولر مزاج انصاف پسند لوگ کامیاب ہوکر پہنچیں جو ملک کی جمہوری وسیکولر اسپرٹ کے مطابق عدل وانصاف کے تقاضوں کی تکمیل کرسکیں اور خاص طور پر اقلیتوں کے سلسلہ میں جن کے دل ودماغ ہمدردی ودلسوزی کے جذبات سے لبریز ہوں، اس سلسلہ میں اپنے اثرات، مشوروں، کوششوں اور جدوجہد میں وہ کبھی تامل وکوتاہی نہ فرماتے تھے ۔۔۔۔ ایسے نازک وقت بھی آئے جب اک خاص قسم کی فضا ملک میں ایسی قایم ہوئی اور ایسا ماحول سیاسی بازیگروں نے بنا دیا جس میں سچی بات کہنا اور مذہب و فرقہ کی سطح سے بلند ہوکر کسی سیکولر مزاج امیدوار کی حمایت کرنا اک صبر آزما کام ہوگیا ۔ مگر یہ مفتی صاحبؒ کا دل گردہ تھا ان کی جرأت وہمت کا کمال بھی تھا، ان کی حق پرستی کا ثبوت بھی تھا اور ان کی دور اندیشی وبصیرت کا مظاہرہ بھی کہ ایسے ماحول میں بھی انھوں نے مناسب وموزوں امیدواروں کی حمایت فرمائی چاہے اس کی وجہ سے کچھ سیاسی رہنماؤں کی پیشانیاں شکن آلود ہوگئیں اور ع

کچھ خاص دوستوں کے بھی چہرے بھی اتر گئے

آج ملتِ اسلامیہ ہند کو نہایت نزاکتوں کا سامنا ہے، دشوار گذار راستوں سے گذرتے ہوئے اس کو ۳۸ سال کا عرصہ گذر چکا ہے مگر افسوس کہ امن وسکون کی وہ منزل اس سے دور ہی دور ہوتی چلی جاتی ہے جس پر پہنچ کر وہ اپنی سماجی اور انسانی ڈیوٹی اور تعمیر وترقی کی ذمہ داریاں پوری کرسکے اور دنیا کو دکھا سکے کہ مسلمان جب انسانیت کی خدمت کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کے ہر قدم سے ایسے روشن نقش ابھرتے چلے جاتے ہیں جو مورخوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتے ہیں، مصلحین کو طریق کار بخشتے ہیں اور خدمتِ انسانی

کے راستہ کے مسافروں کے لئے مشعل راہ بنتے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس ملک میں مسلمانوں کو امن و عافیت اور سکون و اطمینان کی وہ منزل نصیب نہیں ہو پائی جہاں پہنچ کر اس کی افتادیت کے جوہر کھل سکتے۔ زندگی کے موڑ، حالات کی کروٹیں اور وقت کی رفتار یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ ؎

یہ کیسی منزل ہے کیسی راہیں کہ تھک گئے پاؤں چلتے چلتے

مگر وہی فاصلہ ہے قایم جو فاصلہ تھا سفر سے پہلے

مگر حضرت مفتی صاحبؒ کے درج ذیل خیالات و افکار ملاحظہ فرمایئے کہ وہ کس حوصلہ اُمنگ ولولہ اور ہمت کے جوہروں سے لبریز ہیں اور مایوس سے مایوس کمزور سے کمزور دل و دماغ کو بھی عمل کی تلقین کرتے اور عزم و حوصلہ کا پیغام دیتے ہیں۔

"میں ہندوستان کے مسلمانوں سے قطعاً مایوس نہیں۔ ان کی ایک ایک بستی میں ایسے سیکڑوں تڑپنے والے دل موجود ہیں جو اسلام کو چلتی پھرتی حالت میں اور مسلمانوں کو اس کا عملی نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ان تڑپتے ہوئے دلوں کو کس طرح جوڑا جائے ہمارے یہاں الحمدللہ مسلمانوں کی متعدد تنظیمیں کام کر رہی ہیں اور ان میں لاتعداد ایسے افراد موجود ہیں جن کے تقدس اور تقوی کی قسم کھائی جا سکتی ہے میں اس زوال اور افلاس کے عالم میں پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ مخلص اور بے لوث کارکنوں کا جو سرمایہ مسلمانان ہند کے پاس موجود ہے اس کی مثال اس ملک میں کسی گروہ یا جماعت کے پاس نہیں پائی جاتی۔ لیکن امت ان جماعتوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اس کی ذمہ داریاں ان سے زیادہ وسیع ہیں جو اب تک ہماری تمام تنظیموں نے لے رکھی ہیں۔ اس لئے ہم نے چاہا تھا کہ ہماری ان تمام تنظیموں اور ان سے ماوراء ہمارے تمام مسالک اور مکاتب خیال کے اکابر کا ایک فورم ایسا ضرور ہونا چاہیے جہاں ہم بیٹھ کر اپنے حالات کا جائزہ لے سکیں

ایک دوسرے کے کاموں میں ہاتھ بٹا سکیں اور مشترکہ امور میں مل جل کر آگے بڑھ سکیں مسلم مجلسِ مشاورت اسی فورم کا دوسرا نام ہے۔

اپنے ملک کے غیر مسلموں کو ہم ایک طرح سے مظلوم سمجھتے ہیں۔ وہ عام مسلمانوں سے کچھ مخصوص تاریخی پس منظر کی وجہ سے بدگمان ہیں اور اس بدگمانی کے باعث ان کی اکثر صلاحیتیں اور قوتیں ان مسائل پر صرف ہوتی رہتی ہیں جو صرف ایک پسماندہ اور آپس میں بھٹی ہوئی قوم کا خاصہ ہیں۔ ان کی اس سے بھی بڑی مظلومیت یہ ہے کہ ان کی رہنمائی کی باگ ڈور کسی اخلاقی قیادت کی بجائے سیاسی مفادات، زبان و ذات کی خود غرضی اور گروہی اغراض رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے۔ ایک عام غیر مسلم شہری کے زخمی دل پر پھاہے رکھنے والا کوئی نہیں۔ ہماری تمنا تھی کہ مسلمان اس طرح آگے آئے کہ ان غیر مسلموں کے دلوں میں بھی ڈھارس پیدا ہوتی اور وہ سمجھتے کہ چشتی رح اور محبوب الٰہی رح اور انھیں کی نہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے واقعات بیان کرنے والے محض تاریخ انسانی کا کوئی باب نہیں بلکہ مشاہدہ کی آنکھ آج بھی اس سیرت و کردار کو دیکھ سکتی۔ رہا مسلم تنظیموں کا معاملہ تو جماعت کے دائرہ سے نکل کر انھیں امت کا وسیع تر دائرہ میسر آ رہا ہے اور اس طرح ان کی صلاحیت کار کو ایک عظیم میدان فراہم ہو رہا ہے جہاں وہ باہمی تعاون سے اپنی استعداد اور قربانی کی حد تک آگے بڑھ سکتے ہیں۔ کام اصلاح کا ہو یا دعوت تبلیغ کا، تعلیمی ہو یا اقتصادی اور اس کا دائرہ سیاست تک پھیلا ہوا ہو یا علم و دانش کے ارتقاء تک ہر ایک کو اپنی اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے پھیلاؤ، وسعت اور گہرائی و گیرائی ملتی جاتی اور نئے نئے رفقائے کار فراہم ہوتے۔

افسوس کہ آج سے — ایک سال پہلے — تقدیر کے ایک بہت بڑے المیہ سے دوچار ہو کر علم و عمل کے ایک ایسے چراغ سے ہم محروم ہو گئے۔ بہت بڑا سہارا تھا جو ٹوٹ گیا اب

یاس ہے نا امیدی ہے، غم ہے، سوگ ہے، آنکھوں کی اشک فشانی ہے دل کی فریاد ہے نامرادیوں کا ڈر اور ناکامیوں کا خوف ہے۔ زندگی کا کارواں چل رہا ہے مگر ہر موڑ پر بلکہ ہر قدم پر خطرے ہیں اندیشے ہیں جو شب کے پر ہول سناٹے میں زندگی کے قافلہ کو در پیش ہیں اور راستہ میں پستیاں بھی ہیں بلندیاں بھی ہیں اور بہت سی ٹھوکریں بھی ہیں پیچ ہے۔ بالکل سچ ہے۔ ایک وقت کروٹیں بدلتا رہے گا انسان پیدا ہوتے رہیں گے مگر حضرت مفتی صاحبؒ جیسا مختلف صفات کا مجموعہ شخصیت اس دور زبوں حالی اور عہد زوال میں کہاں پیدا ہوگی ــــ؟

دین و دانش فکر و ذہن اور علم و عمل کے ایک پیکر عظیم کا اٹھ جانا قوم کا بہت بڑا نقصان ہوتا ہے حضرت مفتی صاحبؒ کے حلقہ احباب و ارادت اور ان کے ہر چھوٹے بڑے واقف کار کا فرض ہے کہ وہ ان روشنیوں کو قائم رکھنے میں بھر پور امداد و تعاون کریں جو حضرت مفتی صاحبؒ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں اور جس کو قائم رکھنے اور جلا دینے کے لئے انھوں نے زندگی کی ساری توانائیاں بلکہ اپنا گراں مایہ خون دل و جگر صرف کیا۔ رب کریم و کارساز ہم سب کو ان کی روایات ان کی یادگاروں اور ان کی عظمتوں کو قائم رکھنے کی توفیق دے۔ کہ درحقیقت یہی ہے سچا حقیقی اور دردر خراج عقیدت اس مفکر ملت کی روح اقدس کو جو علم کی روشنی تھا، فکر و عمل کا چشمہ صافی تھا، اخلاق و ہمدردی انسانیت و محبت کی شمع فروزاں تھا ــــ اور جو بستر مرگ پر بھی ملت کی تعمیر دینی اداروں کی ترقی و حفاظت اور ہر انسان کی خدمت و اعانت کو وقت کا سب سے بڑا تقاضہ اور سب سے بڑی عبادت سمجھتا رہا ــــ اور جس کے فکر و عمل میں اس سچائی کا عکس پوری طرح جھلکتا تھا کہ ؎

عارضی ہے جذب تسخیر جہاں اک اے دوست	فتح کہتے ہیں جسے قلب کی تسخیر میں ہے

تمام حضرات مخلصین اور ذمہ داران مدارس دینیہ سے خاص طور پر درخواست ہے کہ ماہ مبارک میں ایصال ثواب و بلندیٔ درجات کے لئے دعاؤں کا خاص اہتمام فرمائیں۔

اسلامی دنیا میں ترجمے کی تحریک[1]

ترجمہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، دہلی یونیورسٹی

ہر نیا مذہب اپنے اصول و شریعت کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کام کے لیے سب سے پہلے اپنے ماننے والوں کی توجہ اپنے احکام اور اصولوں کی طرف مبذول کراتا ہے۔ اس لیے قدرتی بات ہے کہ اسلام میں علمی تحریکیں قرآتِ قرآن کریم، تفسیرِ قرآن اور احادیثِ نبوی کی تحصیل و تعلیم سے شروع ہوئیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے اور عظیم اُستاد کی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے ماننے والوں کو شریعت، حقوق، اخلاق اور تاریخ کا درس دیا۔ آپؐ کے بعد آپ کے صحابۂ کرام نے آپ کی پیروی کی اور آپ کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچایا۔

---

[1] فرانسیسی زبان میں ابراہیم مدکور کی کتاب "عرب دنیا میں ارغنونِ ارسطو" کے باب کا فارسی ترجمہ ایرانی رسالے "نشرِ دانش" سالِ سوم، شمارۂ پنجم، مرداد و شہریور ۱۳۶۲ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ مصنف نے اپنی کتاب میں تفصیلی حواشی بھی لکھے ہیں جو مترجم اسماعیل سعادت نے طوالت کے خوف سے حذف کر دیے ہیں، لیکن راقم نے بعض ضروری حواشی کا مطالب کی صراحت کی خاطر اضافہ کر دیا ہے۔

اسلام کا یہ طریقہ، درس و تدریس اسی حد تک محدود نہیں رہا، بلکہ جلد ہی مسلمانوں نے حصولِ علم کے لیے اسلام سے قبل عرب دنیا سے زیادہ متمدن دنیا کی طرف توجہ کی۔ اسلامی فتوحات نے مسلمانوں کا تسلط ان وسیع و عریض ممالک پر قایم کر دیا جو عظیم تہذیب و تمدن کے امین تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے نئے مذہبِ اسلام کو قبول کیا۔ ایرانی، ہندوستانی، سریانی، مصری، مغربی دنیا اور اسپین کے لوگوں نے دینِ اسلام کی فتح مند شریعت کے سامنے گردن جھکا دی۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے اپنے قدیم عقاید پر قایم رہنا چاہا، انھوں نے بھی سربراہانِ اسلام کے ساتھ تعاون کی راہ نکالی۔ خاص طور پر اسلام کے دورِ اوائل میں عربوں نے مفتوح اقوام کے ساتھ اعتدال اور نرمی کا رویّہ اپنایا۔ بلاشبہ عربوں کا یہ طریقہ کار بیشتر قوموں کی تاریخ میں آپ اپنی مثال ہے۔ کلیسا کے اربابِ حل و عقد کی مخالفت و مخاصمت کے باوجود مسلمانوں اور یہودیوں یا مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ازدواجی رشتے قائم ہوتے رہے۔ تمام اسلامی قلمرو میں عربی نے ایک مشترک زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ حاذق طبیبوں اور عظیم دانشور حضرات کو اسلامی خلفاء کے درباروں میں تقرب حاصل ہوا۔ ایسے لوگوں میں عام طور پر یہودی، عیسائی اور خاص طور پر نسطوری[۵] شامل تھے۔ اس کے نتیجے میں اسلامی دنیا کے مختلف عناصر میں ربط و ضبط برقرار رہا اور اس نئی دنیا میں عقلی افکار کے وسیع پیمانے پر تبادلے اور اشتراک کو بہت رونق حاصل ہوئی اس طرح عربوں کا یونانی اور ایرانی تہذیب و تمدن سے براہِ راست سابقہ پڑا اور وہ تہذیب و تمدن اور ثقافت کے ان اہم دھاروں سے بلاواسطہ شدید طور پر متاثر ہوئے۔ آج اس بے بنیاد تصور کی کوئی حیثیت نہیں کہ قبل اسلام عرب دنیا نے اپنے زمانے کی دیگر تہذیبوں اور تمدنوں سے آنکھیں بند کر لی تھیں، البتہ یہ مسلّم ہے کہ اسلام نے دوسری قوموں سے نزدیکی روابط قایم کرنے کے امکانات میں اضافہ کر دیا تھا۔

یہ بے بنیاد خیال ہے کہ مسلمانوں کا علم اور فلسفہ یک بارگی وجود میں آیا۔ منطقی طریقہ کار ایسے مفروضے کو قبول نہیں کرتا۔ یونان ہی طرح عرب دنیا میں بھی عقلی افکار کی متعدد مذہبی، اقتصادی

---

۵ عیسائیوں کا ایک فرقہ

سیاسی اور سماجی عوامل کے تحت تشکیل عمل میں آئی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے اپنی تمام تر توجہ ہمسایہ ممالک میں اپنی قوت بڑھانے اور آئینِ اسلام کی اشاعت پر مبذول رکھی۔ جب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور ہر طرف امن و امان کی حکمرانی ہو گئی تو عقلی افکار کو عروج حاصل ہوا۔ عام طور پر اموی خلفاء کی اس بنا پر سرزنش کی جاتی ہے کہ ان میں علمی ذوق کا فقدان تھا اور اس وجہ سے انھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں[1] علمی تحریکوں کی تشویق نہیں کی۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے، لیکن یہ نہیں بھلایا جا سکتا کہ پے در پے اندرونی اور خارجی جنگوں نے اموی خلفاء کو چین و آرام سے نہیں بیٹھنے دیا۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں کے علوم کی ترقی، ترویج اور...... عباسی خاندان کے برسرِ اقتدار آنے تک مؤخر ہو گئی[2] یہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ عباسی خلفاء کا دورِ حکومت جنگ و جدل سے محفوظ نہیں رہا، لیکن اِن خلفاء کو اپنے دور کے اوائل میں نسبتاً زیادہ اطمینان اور قوت و اقتدار حاصل رہا۔

۱۔ ترجمے کے میدان میں مسلمانوں کی ابتدائی کوششیں | پہلی صدی ہجری کے اواخر میں اسلامی دور کے مترجمین نے مختصر تصانیف کے تراجم کیے۔ ترجمے کی واقعی تحریکیں دوسری صدی ہجری کے وسط سے شروع ہوتی ہیں۔ تیسری صدی ہجری میں، جو اسلام کے ادبیاتِ عالیہ کا دور ہے، یہ روایت اپنے عروج پر پہنچی اور پانچویں صدی ہجری تک جاری رہی۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں بھی ہمیں مترجم نظر آتے ہیں، لیکن یہ تمام حضرات اپنے پیشرو ہمکاروں سے کم درجہ رکھتے ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان تین صدیوں سے زیادہ طویل عرصے تک قدیم تہذیب و تمدن سے متعلق علمی، فلسفی، ادبی اور مذہبی آثار کے تراجم میں سخت مشغول رہے۔ اس کوشش کے نتیجے میں مسلمان اس عظیم انسانی میراث کے وارث بن گئے جس کا سرچشمہ اس زمانے کی

---

[1] ۶۶۱ سے ۷۵۰ عیسوی تک

[2] بنی امیہ کے زوال کے بعد ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء سے ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء تک یہ خاندان پانچ صدیوں سے زیادہ عرصے تک حکمراں رہا۔

چھ اہم زبانوں یعنی عبرانی، سریانی (شامی زبان) فارسی، سنسکرت، لاطینی اور ان سب سے زیادہ اہم یونانی زبان میں محفوظ تھا۔

مسلمانوں نے بیت الحکمت کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی۔ اس میں مترجمین کو ملازم رکھا گیا۔ ان کی تالیفات کی حفاظت بھی اسی ادارے نے کی۔ بیت الحکمت نے اپنے نمائندے بیش ارزش کتابوں کی تلاش میں ایران، ہندوستان اور قسطنطنیہ روانہ کیے۔ ان نمائندوں نے دوسری زبانوں میں محفوظ افکار و عقاید کو پوری علمی دیانت کے ساتھ عربی میں منتقل کیا۔ پہلے کے عربی تراجم کی تصحیح کی یا ان کا دوبارہ ترجمہ کیا۔ ان گوناگوں تراجم کو ان کی علمی جدوجہد اور تحقیق و تتبع کے میدان میں کارہائے نمایاں کا آغاز سمجھنا چاہیے۔

کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اسی طرح آدمی کی ضروریات خود ہر قسم کی جسمانی اور فکری جدوجہد کے لیے تحریک کی قوت بہم پہنچاتی ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی جسمانی اور روحانی غذا حاصل کرنے کے لیے دوسرے قدیم تمدنوں کے ثمرات تک رسائی حاصل کی۔ اس صورتِ حال کے باوجود کہ مسلمانوں کے اولین تراجم علمی نوعیت کے تھے، لیکن ان کا تعلق براہِ راست روزمرہ کی زندگی اور کام سے تھا۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے۔ زندگی گذارنا افضل ہے۔ اس کے بعد ہی انسان فلسفے یا دوسرے امور کی طرف راغب ہوتا ہے۔ اموی خلفاء کے دورِ حکومت میں مصر کے حاکم خالد بن یزید[1] کیمیا اور طبیعی علوم سے بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے وہ مصر میں مقیم بھی رہا۔ اس نے کیمیا کے موضوع پر کتابیں بھی لکھیں۔ اس کیمیا دوست حاکم نے حکم دیا کہ اسکندریہ کے حکماء کیمیا اور طب کی کتابوں کو جو یونانی یا قبطی زبان (مصری زبان) میں موجود تھیں، عربی زبان میں منتقل کریں۔ ابن ندیم[2] کے مطابق

---

[1] متوفی ۷۰۴ء　[2] محمد بن اسحاق الندیم جو ابو یعقوب الوراق کے نام سے بھی معروف ہے، عربی کی مشہور کتاب الفہرست کا مصنف ہے۔ یہ کتاب ۳۷۷ھ میں مرتب کی گئی۔ اس کے کچھ حصے ضائع ہو گئے ہیں۔ چار جلدیں پیرس کی شاہی لائبریری میں موجود ہیں۔ عربی کتب کی یہ سب سے پرانی اور قابلِ اعتماد فہرست ہے۔

دنیائے اسلام میں یہ سب سے پہلے تراجم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس حقیقت کے پیشِ نظر ابن خلدون اور جوردین (Jourdain) کی یہ تحقیق اشتباہ پر مبنی نظر آتی ہے کہ اقلیدس کی کتاب "اصول" سب سے پہلی یونانی کتاب ہے جس کا ترجمہ عباسی خلیفہ منصور[ا] کے حکم سے عربی میں کیا گیا تھا۔ ابنِ ندیم کی تحقیق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس وجہ سے خالد بن یزید کے دور کے تراجم عباسی خاندان کی حکومت کے دوران ہونے والے تراجم سے بلحاظِ زمانہ قدیم تر ہیں۔ اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اپنے خاندان کے حکمرانوں میں علم و معرفت کے سب سے زیادہ دلدادہ تھے۔ ان کے حکم سے طب کے موضوع پر ایک رسالہ عربی میں منتقل کیا گیا۔ یہ بات بہر حال صحیح ہے کہ یہ تمام تراجم ناقص تھے اور اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ تراجم علم و معرفت کے میدان میں محض شخصی تجسس و تلاش کی نشاندھی کرتے ہیں اور چنداں اہمیت کے حامل نہیں۔

۲۔ عباسیوں کی خدمات یہ افتخار عباسی خاندان کے حصے میں آیا ہے کہ اسلامی تراجم کو اس دور میں نہایت سنجیدگی اور مناسب روش کے ساتھ پیش کیا گیا۔ دوسرے عباسی خلیفہ یعنی منصور کو علم و دانش سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس نے علم کے میدان میں عظیم کوششوں اور زبردست تحقیقات کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے بغداد کی بنیاد رکھی (۱۴۵ھ/۷۶۳ء) اور اس جدید شہر کو اتھنز اور اسکندریہ کی علمی روایات کا وارث بنا دیا۔ اس عباسی دارالخلافے کی بنیاد رکھتے وقت اس نے اطباء اور مترجمین کی تلاش کی جو بعد میں اسلامی تہذیب و تمدن کے مروج قرار پائے۔ خلیفہ منصور کے جانشینوں نے بھی اس کے طریقہ کار کی پیروی کی اور علم و دانش کی سرپرستی کی۔ اس ضمن میں مامون کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نے جدید افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت کی تحریک کو حدِ کمال تک پہنچا دیا۔ اس نے کلاسیکی آثار کے مطالعے اور اس قسم کی اہم کتابوں کے ترجمے کی تشویق میں اضافہ کیا۔ اس طریقے پر عباسی خلفاء کی شاندار کوششیں اسلامی قلمرو میں علمی زندگی کی نشوونما اور ترقی کا سبب بن گئیں۔ ناانصافی ہوگی اگر ہم

[ا] دورِ حکومت ۷۵۴ - ۷۷۵ء۔

ان خلفاء کے ساتھ ان علم دوست حضرات کا ذکر کریں جن کی ایک طویل فہرست ابنِ ابی اصیبعہ نے دی ہے۔ رنان (Renan) اور اس کے بعد کارادو وو (carradeVaux) کا خیال ہے کہ مشرقی دنیا میں علم و فلسفہ صرف بعض فرماں رواؤں کے سایۂ حمایت میں پروان چڑھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اِن فرماں رواؤں کے دوش بدوش ایسے اشخاص بھی تھے جو درس و تدریس کے والہ و شیفتہ تھے۔ چنانچہ اُس زمانے میں مساجد اور دیگر غیر سرکاری ادارے خلفاء کے عظیم الشان محلات کی طرح تحقیق و مطالعے کے مراکز تھے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اگر علمی کاوش اور حصولِ علم و دانش کی کوششیں صرف درباروں تک محدود ہوتیں تو یہ کام درباروں کے محدود دائرے سے باہر قدم نہیں بڑھا سکتا تھا۔

بغداد نے جو اسلامی دنیا کے افق پر فکر و فلسفے کے عظیم مرکز کی حیثیت سے نمودار ہوا، اپنی علم کی تابناک شعاؤں سے اسلامی دنیا کے دوسرے حصّوں کو بھی جگمگا دیا۔ دوسرے ممالک کے لوگ ہر طرف سے اس علمی کعبے کی زیارت کے لیے دوڑ پڑے۔ اسپین سیاسی معاملات میں مشرق کو مغرب سے جدا کرتا تھا۔ یہاں دانشور اپنے مشرقی ہمکاروں سے ترجمے اور دوسری تحقیقات اخذ و اقتباس کرتے تھے۔ مقری نے اپنی کتاب کے ایک مکمل باب میں اسپین کے ایسے اشخاص کا ذکر کیا ہے جو حصولِ علم و دانش کی خاطر بغداد آئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسپین جو مغربی دنیا کا ایک نزدیکی ہمسایہ ملک تھا، ترجمے کے اس شاندار کام میں خود کیوں شریک نہیں ہوا۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اول تو اس سرزمین میں علمی روایت مشرقی دنیا کے مقابلے میں کچھ تاخیر سے پہونچیں۔ دوسرے اسپین کے لوگوں کو یہ ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی کہ وہ یونانی یا لاطینی کتابوں سے رجوع کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متعلقہ کتابوں کے عربی تراجم جو دنیائے اسلام میں کیے گئے تھے، ان کی دسترس سے باہر نہیں تھے۔ البتہ یہ کہا گیا ہے کہ اسپین میں عبدالرحمٰن سوم (۹۱۲ - ۹۶۱ء) کے دورِ سلطنت میں دیوسکوریدوس (دیسقوریدوس۔ یاسقوراینروشس) کی کتاب "الحشائش والنباتات" کے ترجمے کی تصحیح و تکمیل کی گئی۔ اصطفن

بن باسیل نے اس کتاب کا بغداد میں عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا، لیکن یہ کام بنیادی حیثیت نہیں رکھتا۔ بہرحال خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں عباسی قلمرو کی حدود سے باہر ترجمے کی کوئی سنجیدہ اور قابلِ قدر کوشش عمل میں نہیں آئی۔

۳۔ عظیم مترجمین | عباسیوں نے اس کام (یعنی علمی اور فلسفیانہ تصانیف کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی خاطر) ایرانی، ہندوستانی، صابی[۱]، یہودی، اور عیسائی زبان دانوں کی خدمات حاصل کیں۔ اس دور میں ترجمے کے تین اہم مراکز تھے، اسکندریہ، جندیشاپور[۲] اور حران[۳]، عربی زبان میں کتابوں کے تراجم کی اہم ترین کوشش اسکندریہ میں شروع ہوئی۔ اسکندریہ درحقیقت علم و دانش کے اعتبار سے ایتھنز کا قائم مقام اور وارث تھا۔ یہ شہر اسلامی اور یونانی افکار کے درمیان ایک وسیلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان افکار و خیالات کے اثرات اسلامی علوم و فلسفے پر نہایت گہرے ہیں۔ عربی علم کیمیا ان اثرات کا حاصل ہے۔ اسی طرح اسلامی طب بنیادی طور پر جالینوسی ہے بلکہ اسے اسکندرانی کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ فلسفے کے

---

[۱] صابئین ایک ایسے فرقے کو کہا گیا ہے جو فرشتوں کی عبادت اور زبور کی تلاوت کرتا ہے۔ بعض دیگر اہل تحقیق کے نزدیک یہ یہود کا کوئی فرقہ ہے۔

[۲] دجلہ کے پار عراق کے مشرق میں ایک علاقہ پہلے ایلام کہلاتا تھا۔ قدیم زمانے میں اس علاقے کا دارالخلافہ شوش تھا اور اب یہ خطہ خوزستان کہلاتا ہے۔ جندیشاپور اسی خطے کا ایک مشہور شہر ہے جسے شاپور نے بنوایا تھا۔ جندیشاپور کے اطبا اپنے فن میں ہمیشہ مشہور رہے ہیں چونکہ ان کے پاس قدیم شاہان ایران کا علم موجود تھا، جس سے دوسرے اطبا محروم تھے۔ تاریخ الحکماء: القفطی، اردو ترجمہ غلام جیلانی برق، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۵، ص ۱۶۸۔

[۳] یہ شام کا مشہور شہر ہے جو موصل، شام و روم کی سڑک پر واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ طوفانِ نوح کے بعد یہ پہلا شہر تھا جو سطحِ ارض پر تعمیر ہوا تھا۔ اس میں مدتوں تک مجوسی آباد رہے اور بڑے بڑے حکماء نے یہاں جنم لیا۔

میدان میں بھی ہم بعد کی سطور میں مکتب عربی پر نو افلاطونی اثرات کی طرف اشارہ کریں گے۔
جندیشا پور وہ شہر تھا جہاں عباسی خلیفہ منصور نے اپنے اولین مترجمین کی تلاش کی۔ یہی وہ شہر بھی تھا جہاں خسرو اوّل انوشیروان نے طب کا مشہور مدرسہ قایم کیا تھا۔[۱] بختیشوع کے معروف اور دانشوروں کے خاندان کو عباسی خلفاء کا قرب حاصل تھا۔ اس خاندان نے طب اور عربی زبان میں تراجم کے میدان میں شایانِ شان خدمات انجام دی تھیں۔ یہ خاندان جندیشا پور ہی کا رہنے والا تھا۔ حرّان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ شہر قدیم یونانی تہذیب کا ماؤا و مامن تھا۔ اس شہر نے عالمِ اسلام کو کثیر تعداد میں دانشور اور مترجم دیے۔ حرّان کے ایسے صاحب علم اشخاص میں ثابت بن قرہ[۲] اس کا لڑکا سنان بن ثابت[۳]، الباطنی منجم اور ریاضی داں، ماہر نباتیات ابن وحشیہ اور صاحبِ کتاب الفلاحۃ النبطیہ (۲۹۲ ہجری قمری) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ بیشتر اسلامی مترجمین کا انہی تین عظیم شہروں سے تعلق تھا اور تمام نسطوری یا یعقوبی طبیب اور یونانی فلسفے کے شارحین مشرق ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

تھوڑی ہی مدت میں مسلمانوں نے اپنے عیسائی اساتذہ کے دوش بدوش غیر عربی زبان کی کتابوں کے تراجم اور ان کی تفسیر کا کام شروع کر دیا۔ فارسی، ہندوستانی، عبری اور سریانی زبانوں کی کتابوں کے خاص طور پر تراجم اور ان کی شرح کی گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مسلمان مترجم

۱۔ انوشیروان (۵۲۱ - ۵۷۹ء) نے جندی شاپور میں فلسفہ و طب کی ایک درسگاہ قایم کی تھی، جس میں شام کے چند عیسائی عالم تدریس پر مامور تھے۔ ۵۲۹ء میں افلاطونی اسکول کے سات حکیم ایتھنز سے نکال دیے گئے تھے جنھیں انوشیروان نے اپنے ہاں پناہ دی تھی۔

۲۔ یہ حرّان کے مقام پر ۲۲۱ھ میں پیدا ہوا۔ اس نے منطق، حساب، علم ہندسہ و علم الافلاک پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ یہ جمعرات کے دن ۲۶ ماہِ صفر ۲۸۸ھ میں فوت ہوا۔

۳۔ اپنے والد کی طرح مشہور طبیب تھا۔ ۳۳۱ھ میں بغداد میں فوت ہوا۔ یہ علم ہیئت کا زبردست عالم تھا اس فن پر اس کی کافی تصانیف ہیں۔ تاریخ الحکماء ص ۲۷۴۔

اور مفسّر کیا یونانی زبان سے واقف تھے؟ رینان پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہے کہ "کسی بھی زمانے میں، کوئی بھی دانشور یونانی نہیں جانتا تھا"، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا حکم آسانی سے نہیں لگایا جا سکتا۔ مثلاً سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ کندی[1] بظاہر یونانی زبان جانتا تھا۔ اور اس نے یونانی سے کتابوں کے عربی ترجمے کیے ہیں۔ کندی کے بارے میں یہ تصور مشتبہ معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ہم اس کی دستیاب تصانیف میں سے مختصر رسالوں کا مطالعہ کریں تو ان میں ایسے شواہد نہیں ملتے جو کندی کی یونانی زبان سے واقفیت کی گواہی دیں۔ احتمال یہ ہے کہ اس نے اپنے ارد گرد موجود بہت سے ایسے مترجمین کی مدد سے، جو یونانی زبان جانتے تھے، اس زبان کے بارے میں جستہ جستہ معلومات اور تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر لی تھی اور اِن اطلاعات و واقفیت کی بنیاد پر وہ غلط تراجم کی تصحیح کا کام کرتا رہا۔ دوسرے مسلمان فلسفیوں کے بارے میں آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ یونانی زبان نہیں جانتے تھے۔ ہربلوٹ (Herbelot) اور دیگر متعدد مصنفین اشتباہ کا شکار ہوئے ہیں اور لکھا ہے کہ ابنِ رشد (متوفی: ۵۹۵ھ) نے ارسطو کی تصانیف کو گویا یونانی زبان سے عربی میں منتقل کیا تھا مونک (Monk) اور رینان بھی اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اسلامی خلفا اور دوسری سربرآوردہ شخصیتوں کے حضور میں مترجمین کو قرب حاصل تھا، اسی طرح وہ اہمیت جو لوگ اِن کے تراجم کو دیا کرتے تھے، وہ اس قدر واضح ہے کہ اس کا ذکر ضروری نہیں۔ اس امر کا پتہ ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے ایک روز اپنے دربار میں اعلان کیا کہ "جس شخص کی جو خواہش ہو وہ جبریل بختیشوع (رح) سے کہہ دے۔ میں ایسی ہر خواہش پوری کر دوں گا"[2]۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا

---

[1] ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق الکندی متوفی ۲۴۶ھ۔ اسے اولین عرب فلسفی سمجھا جاتا ہے۔

[2] ہارون الرشید نے اس طبیب کی بہت عزت کی۔ زرّیں خلعت عطا کی اور بے شمار مال و دولت سے نوازنے کے بعد کہا کہ آج سے تمہیں رئیس الاطبا بنایا جاتا ہے اور اس کے بعد دنیا تمہارے ہر حکم کی تعمیل کرے گی۔

ہے کہ حنین بن اسحاق اپنے تراجم کو سونے کے برابر تول کر ہارون کے ہاتھ فروخت کیا کرتا تھا[1]
یہ بیان بہرصورت افسانہ معلوم ہوتا ہے، البتہ اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ تراجم اور
خاص طور پر حنین کے تراجم کس قدر زیادہ معتبر اور اہمیت کے حامل تھے۔

ایرانی مترجمین میں عبداللہ بن المقفع[2] کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اس کا اسلوب آج بھی لکھنے
والوں کے لیے نمونے اور سرمشق کا حکم رکھتا ہے۔ اس مصنف نے اسلام لانے کے بعد عربی
زبان سیکھی اور اس پر عبور حاصل کیا۔ اس نے چند اخلاقی کتابیں، جس کا بہترین نمونہ کلیلہ
ودمنہ ہے، عربی زبان میں منتقل کیں۔ اس کے لڑکے محمد نے بھی اس کی وفات کے بعد منطق پر
چند رسالے مثلاً فرفوریوس کا رسالہ الیساغوجی، ارسطو کی تصانیف قاطی غوریاس، ارمینیاس
اور آنالوطیقا، جو پہلے سے فارسی میں متعارف تھیں، عربی زبان میں منتقل کیں۔ تاریخی لحاظ
سے یہ تراجم بڑی اہمیت کے حامل ہیں چونکہ بظاہر یہ سب سے پہلے تراجم ہیں جن کے ذریعے
مشائی فلسفی نظام[3] عربی زبان میں منتقل ہوا۔ حاجی خلیفہ کا کہنا ہے کہ اتن نامی شخص نے خالد
بن یزید کے حکم سے منطق پر ارسطو کی کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ اگر یہ ترجمہ واقعی ہوا تھا تو

اور ... طب میں ماہر تھا متعدد یونانی کتابوں کو سریانی و عربی میں منتقل کیا۔ المتوکل نے اسے کتابوں کا ترجمہ
... پر مامور کیا۔ منطق پر ایک عمدہ کتاب لکھی ... ایک صبح مردہ پایا گیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ
تاریخ الحکماء ص ۲۴۶ [2] ابو عمرو (بعد میں: ابو محمد) روزبہ اور بعد میں اس کا نام عبداللہ بن المقفع
دادویہ تھا۔ ۱۰۶ تا ۱۴۲ھ / ۷۲۳ تا ۷۵۱ء-۳۶ برس کی عمر میں مقتول ہوا۔ ایرانی الاصل تھا۔ ہندوستان کی
مشہور کتاب پنچ تنتر کا اس نے کلیلہ ودمنہ کے عنوان سے عربی میں ترجمہ کیا۔ تاریخ الحکماء ص ۱
[3] افلاطون کی یہ عادت تھی کہ وہ طلبہ کو پڑھانے کے دوران ٹہلتا رہتا تھا اور تلامذہ ساتھ ساتھ
ہوتے تھے۔ پیتھاگوراس اور اس کے شاگردوں کے متعلق بھی یہی مشہور ہے۔ افلاطون نے ایک اکیڈمی
کی بنیاد ڈالی۔ اس اکیڈمی والے اکیڈمی کی نسبت سے مشہور ہوئے اور ارسطو کے پیروکار

قدیم ترہو گا جس کا ذکر ہم آیندہ کریں گے۔ البتہ اس ترجمے کا وجود مشکوک ہے چونکہ متقدم مورخین جیسے ابن ندیم اور القفطی[1] اس ترجمے کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ابن مقفع کے لڑکے محمد نے جو تراجم کیے وہ غلطی سے اس کے والد سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ اس قدیم اشتباہ کا حال ہی میں پہلی بار پل کراؤس نے اپنی تحقیقات کے ذریعے اظہار کیا ہے۔

بہر حال ارسطو کی تصانیف اور یونانی علوم و معارف کا بیشتر حصہ حنین (متوفی: ۲۶۰ ہجری قمری)، اور اس کے لڑکے اسحاق (متوفی: ۲۹۸ یا ۲۹۹ ہجری قمری) اور ان کے معاصرین کی درس گاہ میں عربی زبان میں منتقل ہوا۔ اس معروف درس گاہ کے بارے میں روز بروز ہماری معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ متعدد دانشور اور طبیب اس کیڈمی سے وابستہ تھے۔ ان میں سے حجاج بن مطر، یحیی البطریق (متوفی بہ سال ۲۲۰ ہجری) اور قسطا بن لوقا (متوفی در حدود ۳۰۰ ہجری) قابلِ ذکر ہیں۔ اس ادارے میں کلاسیکی تصانیف کا عربی میں ترجمہ کیا جاتا تھا اور تلامذہ کو مختلف زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔ یہ شاگرد بعد میں اپنے اساتذہ کے کام کو آگے بڑھاتے تھے۔ ایسے شاگردوں میں حنین کا ہمشیر زادہ حبیش[2] ممتاز شخصیت کا مالک ہے۔ حبیش کو حنین سے اپنی یہ رشتے داری بڑی مہنگی پڑی یعنی حنین کی شہرت کی وجہ سے یا اس بنا پر کہ عربی رسم الخط میں حنین اور حبیش کے لکھنے میں بڑی مشابہت ہے، ایسے بہت سے تراجم جو حبیش کا کارنامہ ہیں، اس کے ماموں حنین سے منسوب کر دیے گئے تھے[3]۔

حنین اور اسحاق عربی، فارسی، سریانی اور یونانی زبانیں خوب جانتے تھے۔ یہ دونوں فلسفیانہ اور علمی کتابوں کی تلاش میں ہر جگہ خاص طور پر مشرقی روم کا سفر کیا کرتے تھے حنین

---

[1] مصنف تاریخ الحکماء

[2] حبیش ابن الحسن الاعسم النصرانی۔ تراجم کے علاوہ اس کی ایک کتاب کا نام "کتاب الزیادۃ فی المسائل التی الحنین" ہے۔ تاریخ الحکماء ص ۲۵۵۔

[3] اسی طرح کی اطلاع تاریخ الحکماء میں بہم پہنچائی گئی ہے۔ ص ۲۵۵۔

دو برس مشرقی روم میں مقیم رہا تاکہ یونانی زبان سیکھے۔ حال میں شائع ہونے والی اپنی تالیفات میں اس ذہین مترجم نے اپنے تراجم کے اسلوب، صحیح طریقۂ کار اور دیانت کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ بعض متون کا اس نے جوانی میں مناسب ترجمہ نہیں کیا تھا، چنانچہ ایسی تصانیف کا اس نے دوبارہ ترجمہ کیا ہے۔ انہی کتابوں میں اس نے اپنے اُن معاصر مترجمین پر تنقید کی ہے جنھوں نے عجلت میں ناقص تراجم اہلِ علم کو پیش کیے ہیں۔ حنین اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس کے تمام نئے اور نظر ثانی شدہ تراجم ایسے یونانی منابع و مآخذ پر مبنی ہیں جن کے ایک یا دو سے زیادہ نسخے اس کی دست رس میں تھے۔

اسحاق جو اپنے والد حنین کی طرح دیانت داری اور غور و فکر کے ساتھ ترجمہ کرتا تھا، دنیائے اسلام میں پروان چڑھا تھا۔ وہ عربی میں گفتگو کرتا تھا اور اس وجہ سے عربی ہی میں ترجمہ کر سکتا تھا۔ اس کے برخلاف اس کے والد نے یونانی متون کا غالباً سریانی میں ترجمہ کیا، اس امید پر کہ بعد میں ان سریانی تراجم کو وہ خود یا کوئی دوسرا شخص عربی میں منتقل کردے گا۔ مشّائی فلسفے کو دنیائے اسلام میں متعارف کرنے کا سہرا اسحاق کے سر ہے، چونکہ ارسطو کی نصف سے زیادہ تصانیف کا اسی نے عربی میں ترجمہ کیا ہے، یا ان کی تصحیح کی ہے۔ فلسفے کی کتابوں کے تراجم میں اسے مہارت حاصل تھی۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ اس نے ارغنون کا جو عربی میں ترجمہ کیا ہے اسے الدستور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ارغنون کے دوسرے تراجم کا اس کے ترجمے سے مقابلہ کیا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسحاق اور اس کے والد بلا شبہ جہانِ اسلام کے سب سے عظیم مترجم رہے ہیں۔

ایک دوسرا عیسائی دانشور یحییٰ بن عدی[1] (متوفی بہ سال ۳۶۳ ہجری قمری) ترجمے کے کام میں حنین و اسحاق کی مدد کرتا تھا۔ اس نے ان سریانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جنھیں حنین نے یونانی سے

---

[1] ابوزکریا یحییٰ بن عدی بن حمید نے ۸۱ برس کی عمر پائی۔ منطقی تھا۔ اس نے متکلمین کی بے شمار کتابیں نقل کی ہیں۔ خود اس کی اپنی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تاریخ الحکماء ص ۳۶۱

سریانی میں منتقل کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے قابلِ تعریف سنجیدگی اور غور و فکر کے ساتھ ارسطو کی تصانیف کو اسلامی دنیا میں متعارف اور نقل و اقتباس کرنے میں مدد کی۔ اسے اسحاق کے بعد فلسفے اور منطق کی کتابوں کا غالباً سب سے اہم مترجم سمجھا جا سکتا ہے۔ یحییٰ بن عدی منطق کے دو بڑے اساتذہ فارابی اور ابو بشر متّیٰ بن یونس کا شاگرد تھا۔ یہ صرف ایک مترجم ہی نہیں تھا بلکہ خیال پرداز اور شارح کی حیثیت سے بھی اسے ایک عظیم سند سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے "المنطقی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ عربی میں منطق کی اولین کتابوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ارغنون کے اس نسخے میں جو پیرس کی نیشنل لائبریری میں محفوظ ہے، چند بار اس کا ذکر نظر آتا ہے اور اسے ایک باوثوق اور معتبر ماخذ شمار کیا گیا ہے۔ ابن ندیم، جو اس کا معاصر ہے، اس کی کتابوں اور تبحرِ علمی کی تعریف کرتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یحییٰ ابن عدی کا شمار ان اولین مترجمین میں ہوتا ہے جن کی دنیائے اسلام ارغنونِ ارسطو کی ترویج و اشاعت میں احسان مند ہے۔

کارا دو اسلامی دور کے مترجمین کو، ان کی وسیع معلومات کی بنا پر، خود دائرۃ المعارف کا درجہ دیتا ہے۔ اس سے قبل ایک دوسرے عربی سوانح نگار نے اِن مترجمین کو عالم و دانشور قرار دیا تھا۔ حقیقت ہے بھی یہی کہ یہ مترجم عملی اور نظری علوم میں زبردست تبحر کے مالک تھے۔ یہ لوگ طب کے موضوع پر خاص طور پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اس زمانے میں علم کی اہم صفت یہ بھی کہ تاریخی منابع، اسناد اور متون میں گہری تحقیق کی جائے۔ بعض مترجم محقق ہونے کے علاوہ خاص خاص علوم میں گہری بصیرت و بصارت کے حامل تھے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا کہ اسحاق کو فلسفے اور فلسفیانہ کتابوں کے ترجمے پر قدرت حاصل تھی اور اس کے والد طب کی کتابوں کا مطالعہ اور ترجمہ کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ ان کی شہرت جالینوس کی تمام طبی کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ حنین کے بارے میں یہ بیان مبالغے سے خالی نظر نہیں آتا، لیکن اتنا مسلّم ہے کہ اسے علم طب میں تخصص حاصل تھا اور وہ طبّی کتابوں کے ترجمے پر قدرت رکھتا تھا۔

ایک دوسرے درست کار صابئی مترجم ثابت بن قرہ (متوفی بہ سال ۲۸۸ ہجری قمری) ہے۔ علم ہندسہ پر اس کی تالیفات موجود ہیں جو اسے ریاضیات کی تاریخ میں ایک بلند مرتبہ بخشتی ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خلفا اور دوسرے سربرآوردہ مسلمانوں نے اپنی علمی تحریک کے اولین دور میں اس تحریک کی راہنمائی اہل اور واقف کار اشخاص کے سپرد کی۔ اِن لائق اور واقف کار بیشتر مترجمین نے یونان کے عظیم دانشوروں کی تصانیف اور ہندوستانی و ایرانی فکری ورثے کو ترجمے کے ذریعے مسلمانوں تک پہنچایا۔

۴۔ اسلامی تراجم کے موضوعات | ہم نے عرض کیا ہے کہ کیمیا اور طب وہ اولین موضوعات تھے جن کی طرف مسلمان سب سے پہلے متوجہ ہوئے۔ لیکن ایک انسان کا ذہن جیسے ہی تحقیق وجستجو کی راہ پر لگ جاتا ہے، تو جب تک اسے خاطر خواہ تسلی نہ ہو جائے یا جب تک وہ منزل مقصود تک نہ پہنچ جائے یا کم از کم اسے یہ گمان نہ ہو جائے کہ اس نے مقصد حاصل کر لیا ہے، وہ چین سے نہیں بیٹھتا۔ اس کے علاوہ علوم کی مختلف شاخیں قدرتی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں، خاص طور پر ایسی درس گاہوں میں جہاں تعلیم کی وسعت اور اس کا پھیلاؤ (دائرۃ المعارف) کے انداز کا ہو، مختلف علوم ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اس وجہ سے اسلام کی علمی تحریک محض کیمیا اور طب تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کا دائرۂ کار علوم طبیعی، مابعد الطبیعی اور مذہبی علوم میں تحقیقات تک وسیع ہو گیا۔ بائبل، انجیل، مانوی اور زرتشتی کتابیں مسلمانوں کے مذہبی علوم کی تشکیل میں بڑا حصہ رکھتی ہیں۔ اِن کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ نجوم، ریاضی اور سیاست کے میدان میں ہندوستانی اور فارسی زبانوں سے عربی میں ترجمے کیے گئے۔ اس کے سوا، ہندسہ، طب اور نجوم پر یونانی کتابوں کے عربی میں تراجم ہوئے۔ فی الحال ہم اِن مختلف تراجم کے عرب تہذیب پر اثرات سے بحث نہیں کرنا چاہتے چونکہ ہمارا موضوع صرف فلسفہ اور مخصوصاً منطق ہے۔

فلسفے کی دنیا میں مسلمان سقراطی[۱]، نیمہ سقراطی[۲]، سوفسطائی[۳]، شکاکی[۴]، رواقی[۵] اور

ابی قوری[۵] سے قبل کے بعض فلسفیوں سے واقف تھے۔ ایسے قطعی شواہد موجود ہیں جن سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ دی مقراطیس[۶] اور ابی قوری کی تصانیف اُن عظیم اسلامی درسگاہوں کے نصاب میں کتابیں داخل تھیں جہاں علمِ کلام کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مادّی اصالت کے رواقی عقیدے نے اولین معتزلیوں[۷] کے ذہن پر ناقابلِ انکار اثر ڈالا۔ مثال کے طور پر نظّام ایسے افکار د

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) ۴۶۹ — ۳۹۹ قبل مسیح۔ ایک غریب بت تراش کا لڑکا تھا، لیکن بعد میں اس نے فطرتِ انسانی کو تراشنا شروع کیا۔ ایک زبردست مصلح اور حکیم تھا۔ یہ فیثاغورس کا شاگرد اور افلاطون کا استاد تھا اسے زمانہ روا... نے وقت نے فواحش سے روکنا چاہا اور وہ باز نہیں آیا اس لیے قتل کر دیا گیا۔

[۲] سوفسطائی طرزِ فکر کے حامیوں میں سب سے زیادہ مشہور پروٹاگوراس تھا جو دیمقراطیس کا دوست اور ہموطن تھا۔ اس وقت تک یہ لفظ سوفسطائی اپنے اصلی معنوں میں یعنی معلّم حکمت کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس اصطلاح کو سقراط، افلاطون، ارسطو اور ان کے شاگردوں نے ایسا بدنام کیا کہ یہ لفظ استدلالی دھوکے باز کے لیے استعمال ہونے لگا۔ [۳] یعنی متشککین۔ تشکیک کا علم بردار پیرہو ہے جو ارسطو کا معاصر اور اسکندرِ اعظم کا دوست تھا۔ اسکندر نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو پیرہو اس کے ساتھ تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: داستانِ دانش از خلیفہ عبدالحکیم مطبوعہ انجمن ترقی اُردو۔

[۴] رواقیت کا امام زینو (۳۴۰ – ۲۶۵ قبل مسیح) ابی قور کا معاصر تھا۔ رواقیت نے تکلّفات اور ہوس پرستی اور جاہ طلبی کے خلاف علم بلند کیا اور ایسے عقاید کی تعلیم دی جن کی بنا پر انسان کی سیرت استوار ہو سکے۔ [۵] ابی قور (۳۴۱ – ۲۷۰ ق م) اثینیا کا رہنے والا تھا۔ اس نے ۳۰۶ ق م کے قریب اپنے باغ میں ایک قسم کی درسگاہ قایم کی اور سکونِ قلب اور لذّت پرستی کے فلسفے کا درس دیا۔ اس کے فلسفے کو لذّتیت کا فلسفہ کہا جا سکتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: داستانِ دانش۔

[۶] دیمقراطیس کو ذرّاتی طبیعیات کا بانی سمجھنا چاہیے۔ اسی نوعیت کی طبیعیات نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہماری جدید سائنس پیدا کی۔ جس طرح تمام تصورات کا امام افلاطون ہے اسی طرح تمام مادّیت کا بانی مقراطیس ہے۔

(حاشیہ ۷، صفحہ ۱۶ پر)

خیالات کا قائل تھا جن کا سرچشمہ رواقی تھا۔ اسی طرح یونانی شکاکیوں (متشککین) کے کچھ ایسے عقاید بھی تھے جو ارسطوی فلسفے سے مختلف ہیں، لیکن اس قسم کے عقاید بعض متکلمین کے افکار و خیالات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح عرب تذکرہ نگاروں نے طالس[1]، فیثاغورث[2]، آناکساگوراس[3] اور امپیڈومکس کے افکار و عقاید کے مختصر انتخابات نقل کیے ہیں۔ اس قسم کے نمونے شہرستانی کی "الملل والنحل" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ اطلاعات ناقص اور بعض اوقات مشتبہ ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی مفکر فلسفے کے متنوع نظاموں سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ہوا یہ ہے کہ شہرستانی نے فیثاغورث کے فلسفے اور نو افلاطونی فلسفے کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور بعض نو افلاطونی عقاید کو رواقیوں سے منسوب کر دیا ہے۔ درحقیقت مسلمان افلاطون اور ارسطو کے سوا، دوسرے یونانی فلسفیوں سے براہ راست واقف نہیں ہوئے تھے، بلکہ پلوٹارک، جالینوس اور فارفریوس کی تصانیف نے انھیں متعارف کرایا تھا۔

قدیم یونانی فلسفے کی جن کتابوں کے عربی میں تراجم ہوئے ہیں ان میں غالباً کوئی ترجمہ ایسا نظر نہیں آیا جس کا موضوع افلاطون اور ارسطو کے فلسفے یا اس کی تفسیر و شرح کے سوا کچھ اور ہو۔ اسلامی دور کے مترجمین نے افلاطون کے مکالمات جیسے کتاب سیاست یا کتاب

(حاشیہ نمبر بقیہ صفحہ ۱۵) ۵ اس فرقے کا بانی واصل بن عطا (۸۰-۱۳۱ھ) حسن بصری کا شاگرد تھا۔ استاد سے اختلاف کی وجہ سے اس نے قدیم عقاید سے ہٹ کر بعض نئے عقاید کا اعلان کیا تو استاد نے فرمایا "اعتزل عنا" اس دن سے یہ فرقہ معتزلہ کہلایا۔　　[1] یا تالیس ملطہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا زمانہ ۶۰۰ ق م کے قریب ہے۔ یہ ایونیا کے مذاہب فلسفہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

[2] اس کا سن پیدائش ۵۸۲ء اور جائے پیدائش ساموس بتائے جاتے ہیں۔

[3] یہ مفکر ایونیا میں پیدا ہوا۔ یہ اس ذراتی طبیعیات کا بانی ہے جس نے دوبارہ انیسویں صدی میں ہماری موجودہ سائنس پیدا کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔　　[4] فلاطینوس کا سب سے مشہور شاگرد ہے اس نے اپنے استاد کی تعلیمات کو مدوّن کیا۔

السیاسہ (اس کا فارسی ترجمہ "جمہوریت" کے نام سے موسوم ہے) نوامیس (کتاب النوامیس)، سوفسطائی (سوفیست)، فیدون اور سقراط کے رسالۂ دفاع کو عربی میں منتقل کیا ہے۔ ہم نے اس بے بنیاد نظریے کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا ہے جس کی وجہ سے افلاطون کو مسلمانوں میں مناسب طور پر سمجھا نہیں گیا۔ ہم نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اس کے برخلاف سقراط کے عقاید نے اسلام کے مختلف مکاتیبِ فکر کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ "اکیڈمی" کا یہ بانی سقراط اپنی زندگی کے طریقہ کار اور اصالتِ روح پر مبنی اپنے عرفان و فلسفے کی وجہ سے تھا بھی اسی لائق کہ اسلامی فلسفی، زہاد اور متکلمین اس طرف متوجہ ہوتے۔

ہمارا یہ مقصد نہیں کہ مسلمانوں کی نظر میں افلاطون کو ارسطو جیسی قدر و منزلت اور اعتبار حاصل تھا۔ ارسطو بلاشک و تردید اسلامی علوم عالیہ کا متفقہ طور پر استاد ہے۔ اسلامی فلسفیوں نے ارسطو کی جو مبالغہ آمیز تعریف و توصیف کی ہے، رینان نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ارسطو کے اسی بلند مرتبے کی وجہ سے اسلامی دور کے مترجم بڑے شوق سے اس کے آثار کی جستجو میں رہتے تھے اور اس کی تمام طبیعی، مابعد الطبیعی، اخلاقی، اقتصادی اور منطقی کتابوں کا انھوں نے کئی بار ترجمہ کیا ہے۔ اس ضمن میں "ارغنون" کا ذکر ضروری ہے جسے معروف ترین مترجمین نے مختلف منابع و مآخذ سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ ارغنون اپنے فارسی، سریانی یا مختلف یونانی نسخوں سے عربی میں منتقل کی گئی ہے۔ اس کے مترجمین میں حنین، عبدالمسیح بن ناعمہ ابو بشر متّی کے علاوہ، جن میں سے بیشتر محقق و منطقی اور چند زبانوں کے جاننے والے تھے، محمد بن المقفع، اسحاق اور یحییٰ بن عدی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ارسطو کی کتابوں کی بہتر طور پر تفہیم کے لیے لازمی تھا کہ ان کو ایسی شرحوں اور تفسیروں کی روشنی میں پڑھا جائے جو شارحین نے کی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ناگزیر تھا کہ ان کتابوں کی وضاحت و تشریح کے لیے ایسے اولین منابع اور نسخوں پر بھروسہ کیا جائے جو دستیاب تھے۔ اس بنا پر ارسطو کے براہ راست شاگردوں اور مکتب "مشائی" کے بانیوں کی تصنیفات و تالیفات سے رجوع کیا گیا۔ ارسطو کے ان شاگردوں میں سب سے زیادہ تھیوفراسٹس سے استفادہ کیا گیا جو ارسطو سے قریبی تعلقات رکھتا تھا اور اپنی تصانیف کے ذریعے مسلمانوں میں متعارف تھا۔ اس کے بعد اسکندر افرودیسی[1] تھا۔

(حاشیہ نمبر ۱ اگلے صفحے پر)

جو مسلمان فلسفیوں کی نگاہ میں ارسطو ہی کی مانند معتبر سمجھا جاتا تھا۔ ابن سینا کے بقول یہ فاضل المتاخرین، تھا۔ مابعد الطبیعہ اور آنالوطیقا پر اس کی شرحوں کو مسلمان فلسفی تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اسکندر افرودیسی کی کتاب النفس کی شرح سے عقل کے معروف نظریے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کتاب نے اسلامی علوم عالیہ اور پوری قرون وسطی کو متاثر کیا ہے۔ اس وجہ سے عربوں نے مکتب مشّائی کا بلا واسطہ مطالعہ کیا اور اس مکتب کے عظیم ترین نمایندوں کی کتابوں کے وسیلے سے یہ مکتبِ فکر عربوں میں متعارف ہوا۔

اسکندر افرودیسی کا معاصر ایک دوسرا یونانی مفکر جالینوس بھی دنیائے اسلام کی علمی تحریک میں نہ صرف ایک طبیب کی حیثیت سے بلکہ ایک مورّخ اور فلسفی کے طور پر قطعی انداز میں اثر انداز ہوا ہے۔ اسی کے توسط سے رواقیوں اور تشکّکیوں کے آراء و افکار مسلمانوں میں متعارف ہوئے ہیں۔ افلاطون کی تیماؤس کی شہرت بہت بڑی حد تک اسی کی کوششوں کی مرہونِ منّت ہے۔ اس رسالے کی جو شرح اس نے لکھی، اس کی وجہ سے یہ کتاب قدیم دور کے اواخر میں سریانی اور عربی ادب میں معروف ہوگئی۔ اسلامی دور کے منطقی اور مترجم منطق کے بارے میں جالینوس کے آثار کے بہت طلبگار تھے۔

اسلامی فلسفیوں نے ارسطو کو صرف خود اس کے آثار اور مشائیوں کی کتابوں کے ذریعے پہچانا تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ اسلامی فلسفیوں کے جو افکار و عقاید ہم تک پہنچے ہیں وہ ارسطو کے افکار و عقاید سے متفاوت ہیں۔ مکتبِ اسکندرانی مسلمانوں اور ارسطو کے درمیان ایک واسطہ بنا اور اسی واسطے نے مسلمانوں پر بڑی قوت سے اپنا اثر ڈالا۔ فلسفیوں پر اسکندرانی مکتب کا اثر خاص طور سے اس بنا پر زیادہ تھا کہ یہ اثر براہ راست قبول کیا گیا تھا اور مزید براں

(حاشیہ نمبر ا از صفحہ ۱۷) لہ جالینوس طبیب کا ہم عصر تھا۔ اپنے عہد کا عظیم المرتبت فلسفی تھا۔ ارسطو کی کئی کتابوں کی تفسیر لکھی۔ اس کی تصانیف اس قدر مقبول ہوئیں کہ عہدِ روما سے لے کر آج تک مسلسل فلسفیوں کے زیرِ مطالعہ رہیں۔ تاریخ الحکماء ص ۸۷

مکتب اسکندرانی کی ایسے افکار و خیالات سے تشکیل ہوئی تھی جو مذہب کی توقعات سے میل کھاتے تھے یعنی اِن افکار و عقاید اور مذہب کی روایات میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اسلامی فلسفی ارسطو کے بظاہر براہِ راست شاگردوں جیسے بابر فوریوس، تمیسیتوس، آمونیوس، سیمپلیکوس اور یحیی نحوی سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، کیونکہ اسکندرانی شارح اِن کے اسلاف کے بلاواسطہ اور نزدیکی اساتذہ تھے۔ شہرستانی، فرفوریوس اور تمیستیوس (ثامسطیوس) کا تحسین آمیز الفاظ میں ذکر کرتا ہے اور انھیں ارسطو کے صاحبِ نظر شارحوں میں شمار کرتا ہے، لیکن شہرستانی کا یہ خیال ہے کہ انھوں نے ارسطو کو اور نو افلاطونی عقاید کو ایک ہی سمجھا ہے۔ فارابی[1] نے آمونیوس کا صراحت سے ذکر اور اس کے نظریات سے اخذ و اقتباس کیا ہے۔ یحیی نحوی نے آفرینشِ جہان کا اپنا نظریہ پیش کیا اور اس ضمن میں ارسطو کے فلسفے سے اختلاف کیا۔ اس وجہ سے وہ متکلموں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکا ہے۔ صرف اسکندرانی شرحوں کے طفیل غالباً ارسطو کی "ارغنون" عربی میں متعارف ہوئی۔ یہ شرحیں بعض لحاظ سے ارغنون کا تکملہ تھیں اور ارغنون کے ترجمے کے ساتھ ہی ساتھ عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ جہاں تک ان دوسری نو افلاطونی شرحوں اور تفسیروں کا تعلق ہے جو مسلمانوں کی نظر میں ارسطوئی عقاید کا لازمی حصہ تھیں۔ اِن کا معاملہ اس سے مختلف نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ مکتب اپنے خاص تاریخی اور جغرافیائی حالات کی وجہ سے اپنے فلسفی نظاموں اور تحریروں کو دنیائے اسلام میں شائع کر سکا ہے۔

اگر ارسطوئی فلسفہ، اسلامی فلسفیانہ عقاید کا ایک بنیادی رکن ہے تو افلاطونی اور نو افلاطونی فلسفہ اسلامی فلسفے کے لیے ایسے مواد اور مصالح کی تشکیل کرتا ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نو افلاطونی فلسفے کے مزاج کو مدتوں پہلے سمجھ لیا گیا تھا، لیکن یہ اب تک،

[1] ابو نصر محمد بن فارابی ملقب بہ معلم ثانی ۲۶۰ھ/ ۸۷۳ء میں فاراب میں پیدا ہوا۔ یہ اسلامی دور کے عظیم فلسفیوں میں شمار ہوتا ہے اس کی وفات ۳۳۹ھ/ ۹۵۰ء میں ہوئی۔

معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ نو افلاطونی مواد اور بنیادی اصول آخر کن ذرائع سے اخذ کیے گئے ہیں کبھی اِن ذرائع اور ماخذ کی تلاش اشاد یا ہیں اور کبھی اثولوجیائے منحول اور کتاب العلل میں کی جاتی ہے۔ افلوطین[1] (الشیخ الیونانی) کے بارے میں کہنا چاہیے کہ اس کی تصانیف کا ترجمہ ہرگز عربی زبان میں نہیں ہوا خواہ شہرستانی اسے ہر چند مکتبِ اسکندرانی کا استاد قرار دے اور اس کے بعض اہم ترین نظریات کی طرف اشارہ کرے۔ اثولوجیائے منحول اور کتاب العلل نے بلاشک وشبہہ اس کے آرار وعقاید کی گونج کو اسلامی دنیا کے فلسفیوں کے کانوں تک پہنچایا، لیکن اِن دو کتابوں کے علاوہ اسکندرانی فلسفیوں کی ان تفسیروں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جنھوں نے اس مسخ شدہ ارسطوئی فلسفے کو جو افلاطونی، رواقی اور نو افلاطونی عقاید وافکار سے مشتبہ ہو گیا تھا، مسلمانوں تک پہنچایا۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر ابھی تک غور نہیں کیا گیا ہے۔ جس وقت فرفوریوس یا سیمبلیکیوس ارسطو کے فلسفے کی شرح وتوضیح کرتے ہیں تو خود کو اپنے تمام آرار وعقاید سے آزاد نہیں کر لیتے اور اپنے عقاید کو مکمل طور پر چشم پوشی نہیں کر لیتے۔ اس لیے دوسری صدی میں ارسطو کے فلسفے کی ازسرِ نو اشاعت جوراوسون (Ravaisson) اور رینان کے ہاتھوں عمل میں آئی وہ فلسفہ، ارسطو کی خالص اور بے لاگ شکل وصورت نہیں تھی۔ مکتب اسکندریہ کے شارحین نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ افلاطونی، مشائی اور رواقی مکاتیب فلسفے کو ایک جگہ جمع کریں اور ان میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ اسلامی فلسفے کے بنیادی نظریات کو واضح طور پر پیش کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اسکندرانی اور مشائیوں کی شرحیں ہمارے سامنے ہوں۔ چونکہ جب تک یہ شرحیں ہمارے سامنے نہیں ہوں گی اس وقت تک اسلامی دنیا میں فلسفیانہ افکار کی تاریخ یہ ہمارے نظریات وخیالات ناقص اور غیر منطقی ہوں گے۔

---

[1] افلوطین یا فلوطین۔ نو افلاطونی مکتب کا ایک فلسفی تھا۔ مصر میں مقیم رہا۔ اموتیدس ساکاس کی خدمت میں رہا اور ہندوستانی حکمت کا خواہاں تھا۔

منطق میں مسلمان کم از کم بلا واسطہ طور پر نہ تو رواقیوں کے 'جدل' سے اور نہ ہی ابی قور کے 'معیار' سے واقف تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں کہ نو افلاطونی مفکّروں نے منطق کے میدان میں اپنا مخصوص نظریہ پیش نہیں کیا۔ ان کا اپنا عرفان ایک حد تک اس امر کے خلاف تھا جبکہ افلاطین کا 'جدل'[۱] بیشتر مابعد الطبیعی اور ماورا تجربہ تھا۔ جس کتاب نے مکمل طور پر اسلامی منطق کے بنیادی اصولوں کی تشکیل کی وہ ارسطو کی کتاب ارغنون تھی، لیکن یہ صورت حال اس کے بعد عمل میں آئی جب متقدم شارحوں اور مفسروں نے اس کتاب کے بارے میں اپنا تجزیہ اور توضیح پیش کی۔ ابن ندیم نے ہندوستانی کتابوں کی ایک طویل فہرست میں ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس کا نام "حدود منطق الہند" ہے۔ کیا یہ کتاب، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، درحقیقت منطق کے موضوع پر تھی؟ اس کا جواب ہم قطعی طور پر اقرار میں نہیں دے سکتے چونکہ لفظ منطق گفتار و زبان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال اگر یہ کتاب واقعی طور پر منطق ہی کے موضوع سے بحث کرتی تھی تو اس کا امکان یہ ہے کہ یہ کتاب گوتما (Gotama) کی نیایا (Nyaya) ہی ہوگی[۲]۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا تھا یا نہیں؟ اس سلسلے میں جو احساس ذہن پر غالب آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سوال کا منفی جواب دیا جائے چونکہ اس کتاب کے نقوش و اثرات عربی ادب میں کہیں نظر نہیں آتے اور خود ابن ندیم بھی اس کے عربی ترجمے کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔

---

[۱] رواقیوں کے 'جدل'، ابی قور کے معیار اور افلاطین کے جدل وغیرہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو داستانِ دانش، ص ۱۸۵، ۱۹۹۔ بہرحال ان الفاظ سے مراد غالباً ان فلسفی نظاموں کا طریقۂ کار اور دوسرے نظاموں سے ان کی کشمکش ہے۔

[۲] نیایا سوترا یہ ہندوستانی فلسفے کی کتاب اکش پادہ گوتما سے منسوب ہے۔ اس کے بارے میں اطلاع مفقود ہے۔ اس کی تاریخ تصنیف چوتھی صدی عیسوی ہے۔ اس کے بعض حصے قدیم زمانے کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں ہندوستانی منطق کا نظام نیایا بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ **عربی تراجم کی ارزش** عربی تراجم کے بارے میں تاریخ نے ہمارے لیے زیادہ مواد محفوظ نہیں رکھا ہے۔ اس سلسلے میں جو کچھ تھوڑا بہت محفوظ بھی ہے وہ دنیا کے چاروں کونوں میں منتشر اور مشرق و مغرب کے کتب خانوں میں منقسم ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ اس مواد اور کتابوں کے اصل متون کے ساتھ مقابلے سے پہلے ہم ان عربی تراجم کے بارے میں کوئی قطعی اور کلّی رائے نہ دیں، لیکن اپنے تازہ مطالعات اور حال ہی میں دستیاب ہونے والے نسخوں کے تجزیے اور اس کے علاوہ اسلامی دور کے تراجم کے اسلوب کو قطعی انداز میں سمجھنے کے بعد ہم نے اپنے آپ کو یہ اجازت دی ہے کہ اس سلسلے میں کچھ مزید عرض کریں۔

اسلامی دور کے مترجمین کی دقّتِ نظر، اخلاقی اوصاف اور نہایت وسیع معلومات کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو ان سب سے زیادہ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ان مترجمین نے ترجمے کے میدان میں مکمل طور پر "علمی رویے" کی پیروی کی ہے۔ ایک ہی متن کو چند مختلف مترجموں نے ایک دوسرے سے متفاوت منابع کو سامنے رکھ کر عربی کا لباس پہنایا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مترجم اُن ترجموں پر جو ان سے قبل جلدی میں کیے گئے تھے یا یہ تراجم ایسے لوگوں نے کیے تھے جو بہتر صلاحیتوں کے حامل نہیں تھے، تجدیدِ نظر یا ان کی تصحیح کیا کرتے تھے۔ اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے بعض اعداد و شمار بڑی حد تک مدد کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر تیئیس (۲۳) اشخاص نے ارسطو کی تصانیف کا پہلی بار ترجمہ کیا ہے یا ان پر تجدیدِ نظر کی ہے۔ ان تیئیس مترجمین میں آدھے سے زیادہ یونانی زبان جانتے تھے۔ دنیائے اسلام میں ارسطو کی بیس متعارف کتابیں تقریباً (۸۸) بار عربی میں منتقل کی گئی ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ارسطو کی ہر کتاب کے تقریباً چار سو سے زیادہ تراجم کیے گئے۔ یہی صورت حال جالینوس کی تصانیف کے ساتھ پیش آئی۔ اِن اعداد و شمار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اشخاص کس قدر فعالیت سے کام لیا کرتے تھے اور ان کی یہ کوششیں کس حد تک قابلِ قدر اور پر ارزش ہوتی تھیں۔ ایک ہی متن کے جو مختلف ترجمے آج دستیاب ہیں ان کی مدد سے اس متن کے سلسلے میں تقابلی مطالعہ اور

گہری تحقیق ممکن ہو گئی ہے۔

عربی تراجم پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بیشتر سریانی تراجم پر مبنی ہیں۔ اور اس وجہ سے اصل سے چنداں مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ ظاہر ہے کہ سریانی ادبیات، یونانی اور عربی زبانوں کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت رکھتا تھا اور اسی زبان نے یونانی فکر کے آخری آثار کو زمانے کی دست برد سے محفوظ رکھا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں اوساکی درسگاہ میں مشائی فلسفہ، زبان کی گرائمر، خطابت، موسیقی، طب اور نجوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تحقیق و مطالعے کے اس مرکز میں خاص طور پر منطق کو اہم مقام حاصل تھا۔ اسلام کی آمد سے دو صدی قبل ارسطو کی کتاب ارغنون کے چند حصے سریانی زبان میں منتقل ہوئے تھے۔ اسلام میں علمی تحریک کے بیشتر علمبردار نسطوری یعنی سریانی تھے۔ قدرتی بات ہے کہ اِن روشن دل راہنماؤں نے سب سے پہلے اپنی زبان میں موجود منابع اور ایسے مآخذ سے رجوع کیا جن سے وہ واقف تھے۔ چونکہ سریانی نسبتاً کم مایہ اور تہی دست تھی اور اس میں یونان کی تمام تصانیف موجود نہیں تھیں اس کے نتیجے میں اس زبان کے ادب نے اسلامی دنیا کے وسیع مطالعات کی ضروریات کو پورا نہیں کیا۔ بہت سے یونانی آثار، یونانی زبان سے براہِ راست عربی میں منتقل ہوئے تھے چونکہ اُن کے سریانی تراجم دستیاب نہیں تھے۔ مثلاً:

ارغنون کے صرف ایساغوجی، ارمینیاس اور آنالوطیقائے اول ایسے ابواب تھے جو سریانی میں متعارف تھے۔ مسلمانوں نے بعد میں یونانی منابع سے استفادہ کرنے کے بعد اس کتاب کو مکمل طور پر عربی زبان میں ترجمے کرنے کا ڈول ڈالا گیا۔ اسی طرح، جیسا کہ مجھے علم ہے، کسی بھی یونانی زبان کی ریاضی پر کتاب کا عربی میں ترجمہ سریانی زبان کے واسطے سے نہیں ہوا۔ بعد کے ادوار میں سریانی زبانوں نے خود کو عربی زبان کے وسیلے سے مالا مال کیا اور اس طرح وہ زبان جو کبھی خود عربی زبان کے لیے اخذ و اقتباس کا ذریعہ تھی، اب اسی سے اپنا دامن بھرنے لگی۔ اسلامی دور کی تحقیقات نے بلاشبہ سریانی ادب کو ایک حیاتِ تازہ بخشی۔ اس کے باوجود

عربوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ یونانی کتابیں جو قبلاً سریانی زبان میں ترجمہ ہو چکی تھیں، ان کو اسی صورت میں قبول کر لیں۔ بلکہ انھوں نے یہ کوشش کی کہ ایسی کتابوں کے اصلی سرچشمے کا رُخ کریں۔ حنین یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس نے قدیم غلط سریانی تراجم کی ان کے اصل یونانی متون سے مقابلہ کرنے کے بعد تصحیح کی ہے۔ اس زمانے میں اسلامی دنیا کے اندر خلفا اور سربرآوردہ اشخاص میں اصل متون کی حصولی اور ان کے عربی تراجم حاصل کرنے کے لیے ایک قسم کی رقابت حکم فرما رہی ہے۔

ان تمام حقایق کے باوجود بعض مترجمین نے ترجمے کے کام میں بلاواسطہ طریقۂ کار نہیں اپنایا اور اس وجہ سے کہ ان کا یہ کام براہ راست انجام نہیں دیا گیا، دل میں اعتماد واعتقاد پیدا نہیں کرتا۔ اس قسم کے مترجم عام طور پر یونانی زبان سے سریانی زبانوں میں ترجمہ کیا کرتے تھے اور اس کے بعد سریانی ترجمے سے عربی میں ترجمہ ہوتا تھا اور یا پھر اسی سریانی ترجمے پر اکتفا کیا جاتا تھا اور سریانی سے عربی میں ترجمے کو دوسروں کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ اب ممکن ہے یہ تصور ذہن میں ابھرے کہ یہ مترجم محسوس کرتے ہوں گے کہ وہ اس قدرت و تبحر کے حامل نہیں جو یونانی زبان سے عربی میں بلاواسطہ ترجمہ کرنے کے لیے لازمی ہے، لیکن ایسا تصور بے بنیاد ہے حقیقت یہ ہے کہ سریانی سے ترجمہ کرنے کا رواج بیشتر ترجمے کے اسلوب کے تقاضوں کو پورا کرنے کی وجہ سے تھا یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ خود مترجمین کی یہ خواہش تھی کہ وہ جدید علمی ذخیروں کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔ پہلی وجہ کے سلسلے میں کہنا چاہیے کہ تقریباً تمام مترجم سریانی زبان جانتے تھے جبکہ ان میں ایسے اشخاص کی تعداد بہت کم تھی جو یونانی زبان سے واقف ہوں۔ اس لیے حالات کا یہی تقاضا تھا کہ یونانی جاننے والے یونانی متون کو پہلے کسی دوسری زبان میں، جس کی مدد سے عربی میں ترجمہ کرنا آسان تر ہو، منتقل کریں۔ یونانی زبان کے آثار سریانی سے عربی میں منتقل ہوئے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مترجم عربی سے واقف نہیں تھے بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ اس طرح دوسروں کی ضروریات بھی پوری ہو جاتی تھیں اور ایک قسم کا روحانی

ینتشلزم صورت پذیر ہو رہا تھا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ مترجم، جن میں اکثر سریانی تھے، چاہتے تھے کہ عربی زبان کو مالا مال کرنے کے ساتھ ساتھ وہ خود اپنی زبان کو بھی وسعت دینے اور مالا مال کرنے کی کوشش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف یونانی بلکہ عربی متون کو بھی اپنی سریانی زبان میں منتقل کیا ہے۔ حتیٰ کہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ان مترجمین نے پہلے یونانی سے عربی زبان میں اور اس کے بعد اپنے عربی تراجم کو سریانی زبان میں منتقل کیا ہے۔

یہ طریقہ کار جس کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا، حنین نے بہت زیادہ برتا ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ یہ مترجم، جس نے عربی زبان نسبتاً دیر میں سیکھی تھی، کس طرح اس قدر صراحتِ بیان اور زیبائی انداز کے ساتھ عربی میں لکھ سکا ہے۔ اس کی شرحوں اور تفاسیر کے وہ حصے جو ہم تک پہنچے ہیں، اس کے اندازِ بیان کی فصاحت و ایجاز کے حیرتناک نمونے ہیں۔ ہم اس ضمن میں قاری کی توجہ اس کے ایک رسالے کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے جو اس نے جالینوس کے آثار کے بارے میں لکھا ہے اور جس میں اس کا اندازِ تحریر و بیانِ محکم، استوار اور مجمل ہے۔

حنین کے تراجم کی کیفیت و نوعیت کے بارے میں ہم برگسترآسر (Bergstrasser) کی گواہی پر اعتماد کریں گے، جو اس ضمن میں بہت بڑی سند کی حیثیت رکھتا ہے اور جس نے حنین کے تراجم کا ان کے اصل یونانی متون سے مقابلہ کرنے کے بعد اُن کی صحت اور اعتبار پر شہادت دی ہے۔ اس کے علاوہ برگسترآسر، سیمون (J. Semon) کے اس الزام کی تردید بھی کرتا ہے کہ حنین نے اپنے تراجم میں مناسب الفاظ کا انتخاب نہیں کیا اور عامیانہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حنین کو وضاحتِ مطالب کا اتنا پاس تھا کہ اس نے کبھی کبھی معمولی سے الفاظ استعمال کیے ہیں اور کوشش کی ہے کہ حقِ مطلب کو زیادہ وفاداری کے ساتھ ادا کرے، چاہے اس عمل میں اسے اپنے اسلوب کی زیبائش ہی کو کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔ بہر حال برگسترآسر کا خیال ہے کہ اس کے تراجم صحت و اعتبار کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں اور یہ تراجم

دل میں یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ صحتِ الفاظ و بیان کسی تکلّف اور مصنوعی روش کا نتیجہ نہیں بلکہ الفاظ و تعبیرات پر حنین کے اطمینان بخش اور ماہرانہ تسلط کا حاصل ہے۔ یونانی سے عربی میں اس کے تراجم، رواں، درست اور لفّاظی سے پاک ہیں اور خود بھی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے اس کے تراجم میں فصاحت نظر آتی ہے۔ حنین کے تراجم کی اِن خصوصیات کا عموماً تمام اسلامی دور کے تراجم پر اطلاق کیا جا سکتا ہے چونکہ یہ تراجم یا تو خود حنین نے کیے ہیں یا اسی کے ادارے میں ان کی تصحیح و تنقیح ہوئی ہے۔

ارغنون کا وہ اہم خطّی نسخہ جو پیرس کی نیشنل لائبریری میں محفوظ ہے، اسلامی مترجمین کے لیے مایۂ افتخار ہے۔ یہ نسخہ اپنی نوعیت کا واحد نسخہ ہے اور دوسرے مآخذ کے مقابلے میں اس نسخے سے ہم عربی تراجم کے بارے میں زیادہ بہتر طور سے انصاف کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسے موضوع کے بارے میں ہے جس میں تفنّنِ لفظی کی گنجائش نہیں۔ بہت سے مشرق شناس اور معاصر دانشوروں نے اس کے بعض حصّوں کو شائع اور ان پر تبصرہ کیا ہے اور سب ہی نے اس کی تعریف کی ہے۔ مونک (Munk) نے ایک جگہ اس کے بارے میں لکھا ہے کہ: اس گرانبہا نسخے کی تنقیدی حیثیت پر اگر ایک اجمالی نگاہ ڈالی جائے تو بہت بڑی حد تک ہم اس حقیقت کے قائل ہو جاتے ہیں کہ عربوں کے پاس نہایت صحیح اور توجّہ سے کیے گئے تراجم موجود تھے۔ اس وجہ سے وہ لکھنے والے جنھوں نے اِن تراجم کا مطالعہ کیے بغیر انھیں ابتدائی، بیکار اور غیر پختہ نوعیت کا قرار دیا ہے زبردست غلطی کا شکار ہیں۔ اس قسم کے لکھنے والوں نے اپنی رائے کو لاطینی زبان کے ایسے تراجم کی بنیاد پر تشکیل دیا ہے جو عربی زبان سے نہیں بلکہ عبرانی زبان کے تراجم سے لاطینی میں منتقل کیے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا نسخہ عربی میں ارغنون کا سب سے قدیم ترجمہ ہے۔ اس وجہ سے ہم اس کو اسلامی دنیا میں منطق سے متعلق مطالعات کے آغاز کا اندازہ لگانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ ترجمہ چند مترجمین کی کوششوں کا ماحصل ہے جن کی زبان اور اسلوب ایک دوسرے سے

مختلف تھا، لیکن انھوں نے مکمل یونانی متن کو صراحت، توجہ اور بغیر کسی غلطی کے عربی میں منتقل کیا ہے۔ یہ نسخہ ترجمے کے کام میں دیانت داری برتنے کی بہترین مثال ہے۔ اس میں صرف چند مختصر عبارتیں ایسی ہیں جہاں مترجم اصل عبارت کا صحیح طور پر مطلب نہیں سمجھ سکا ہے مترجم اس ترجمے میں اصل متن کا اس قدر پابند رہا ہے کہ کہیں تحت اللفظ ترجمہ ہی اس کے قلم سے نکلا ہے۔ اس ترجمے کے پیشِ نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر عربی زبان کا مترجم ہمیشہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تب بھی اس نے اصل مطلب کے اظہار میں ہمیشہ دیانت وامانت سے کام لیا ہے۔ اس نسخے میں ایک قابلِ توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ اس کے مترجم وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اسلامی فلسفے میں مستقل حیثیت رکھتے ہیں یا ان سے مشابہ ہیں۔ اس اعتبار سے بھی یہ ترجمہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس کی مدد سے اسلامی علوم میں مستعمل الفاظ وکلمات کی تشکیل کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔

اسلامی دور کے مترجمین کی دہری ذمّے داری تھی۔ ایک یہ کہ وہ اصل متون سے صحیح روایت پیش کریں۔ دوسری یہ کہ نئے اور جدید مقام پر مناسب الفاظ وکلمات کو منطبق کریں۔ اس میدان میں بھی انھوں نے اپنی صلاحیت اور ہوشمندی کا سکہ جما دیا ہے۔ اوائل میں انھوں نے یہ الفاظ عربی زبان سے مستعار لیے۔ اس طرح عربی زبان کی وسعت اور لچک داری کی خصوصیات کی بنا پر انھوں نے نئے الفاظ ڈھالے جن کا اس زمانے میں بہت رواج ہو گیا۔ اس کے برخلاف اگر کبھی عربی نے مناسب الفاظ کی فراہمی میں ان کا ساتھ نہیں دیا تو انھوں نے دوسری زبانوں سے مدد لی۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی، سریانی، فارسی اور ہندوستانی الفاظ اسلام کے جدید علوم میں راہ پا گئے۔ اس صورتِ حال کا اندازہ لگانے کے لیے خوارزمی کے ایک مختصر رسالے "مفاتیح العلوم" پر نظر ڈالنی کافی ہوگی۔ یہ اپنی نوعیت کے سب سے قدیم رسالوں میں شمار ہوتا ہے اور اس میں اسی قسم کے نئے الفاظ کے نمونے نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں نے وہ تمام علوم جو دوسروں سے اخذ کیے، ان کے بعض فنّی الفاظ مستعار لیے چونکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مفاہیم

الفاظ سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ اِن الفاظ کی مدد سے ہم بظاہر یہ بھی تعین کر سکتے ہیں کہ فلاں کتاب پہلی بار سریانی سے عربی میں منتقل ہوئی تھی یا یونانی زبان سے۔ اس نوعیت کی تحقیق سے علوم اسلامی کے مآخذ پر بھی گرانقدر روشنی پڑے گی۔ بادمستارک (Baumstark) نے انثولوجیا مے منحول کو سامنے رکھ کر اس قسم کی تحقیق کی ہے۔ اس کے بارے میں ہم آئندہ اشارہ کریں گے۔

سریانی، فارسی اور ہندوستانی الفاظ کے علاوہ، عربی تراجم میں متعدد یونانی اصطلاحات بھی نظر آتی ہیں جو یا تو اپنی اولین صورت میں استعمال کی گئی ہیں یا ایک نئی ہیئت اور شکل وصورت کے ساتھ عربی ادبیات میں راہ پا گئی ہیں۔ عربی داں دانشوروں نے اس قسم کی اصطلاحات کی فہرست تیار کی ہے اور کیمیا اور طب کی عربی کتابوں میں اُن کے استعمال کی نشاندھی بھی کی ہے۔ مثلاً فلسفے میں ہیولا، اسطقس، فانطاسیا، ناموس، لوقیا جیسے الفاظ کے استعمال سے ہم بآسانی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا سرچشمہ کون سی زبان ہے۔

یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ علمی اصطلاح خود زمانے کی دین ہوتی ہے۔ ایک اصطلاح جس قدر استعمال میں آتی ہے اسی قدر وہ اپنی جگہ بناتی ہے۔ اسی طرح اس سے پہلے کہ ایک اصطلاح اپنا مستقل مقام بنائے، وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں پے در پے تبدیل ہوتی رہتی ہے، تب کہیں جاکر آخرکار اپنے اصل مقصد سے مطابقت اور اصل موضوع سے ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ عربی کی فنی اصطلاحات بھی تحول وتغیر کے ایسے ہی گوناگوں مراحل سے گذری ہیں۔ اِن کی آخری شکل، ترمیم وتنسیخ کے ایک طویل سلسلے کا نتیجہ ہے۔ مثلاً ارسطو کے (Ovoia)[1] کا پہلے "عین"، ترجمہ کیا گیا تھا جو دراصل عربی لفظ ہے، لیکن یہ لفظ ایک مختلف مفہوم کا حامل تھا۔ اس لیے فارسی زبان کے لفظ "جوہر" نے اس کی جگہ لی اور بعد کے ادوار میں اسلامی فلسفے اور

---

[1] اس یونانی لفظ کا تلفظ (Ocoia) ہے۔ اسی کا ترجمہ عین اور پھر جوہر کیا گیا۔

علوم کی زبان میں یہ لفظ خوب استعمال ہونے لگا۔ یہ ذہن میں رہے کہ چوتھی صدی کے بعض متکلمین، خاص طور پر اشعری فلسفیوں سے مخالفت کی وجہ سے، ارسطو کے مفہوم جوہر کے لیے لفظِ عین ہی ستعمال کرتے تھے۔ خوارزمی کے بقول پانچویں صدی اور اس کے بعد کسی نے کلمۂ عین استعمال نہیں کیا اور یہ لفظ اس معنی میں آج تک منسوخ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ الفاظ میں بھی مفاہیم کی طرح ایک قسم کی کشمکش جاری ہے اور اس کشمکش میں زیادہ واضح، مطلب کو بہتر طور پر ادا کرنے اور موجز الفاظ دوسرے الفاظ کی جگہ لیتے ہیں۔ بہر طور مترجمین نے اسلامی علوم کی اصطلاحات کی تشکیل اور تکامل میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ الفاظ کا یہ رول اب تک واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں آیا ہے۔ امید ہے کہ اس کے بارے میں ہمارے معروضات ایک حد تک کافی ہوں گے۔

اسلامی دور کے مترجم ایک دوسری مشکل سے بھی دوچار ہوئے، جسے حل کرنے کے لیے وہ آمادہ نہیں تھے اور یہ مشکل تھی اصل کتابوں کو غلط طور پر دوسروں سے منسوب کتابوں سے ممتاز کرنے کی۔ اس کے باوجود ان مترجمین نے اپنی حقیقت دوستی اور نسبتاً زیادہ مہارت کی بنیاد پر یہ مسئلہ بھی حل کیا ہے۔ ایک قسم کی تنقیدی روح نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ ایسی کتابوں کی شناخت کریں جن کے اصل ہونے میں شک و شبہ تھا۔ مثال کے طور پر حنین، جالینوس کے اسلوب سے اس طرح واقف تھا کہ وہ آسانی سے قطعی طور پر یہ بتا سکتا تھا کہ یہ کتاب اس عظیم یونانی طبیب کے قلم کا نتیجہ ہے یا نہیں۔ اپنی اس واقفیت کی بنا پر اس نے ایسی چند کتابوں کو جو غلط طور پر جالینوس سے منسوب تھیں، اس کی اصل کتابوں سے جدا کر دیا۔ اس کے باوجود یہ تنقیدی رویہ ہمیشہ کارآمد ثابت نہیں ہوتا اور فاحش غلطیاں برقرار رہتی ہیں۔ خاص طور پر تولوجیائے منحول اور کتاب العلل کے بابے کی کتابوں کے غلط انتساب کا پتا نہیں لگایا جا سکا ان دونوں کتابوں نے، جو غلط طور پر ارسطو سے منسوب تھیں، قرونِ وسطیٰ میں مشائی فلسفے کو بہت زیادہ اشتباہات سے آلودہ کیا۔ اسلامی فلسفی اور مترجم اس کتاب کے غلط انتساب کو محسوس

نہیں کر سکے اور انہیں لاطینی علوم عالیہ کے لیے میراث بنا دیا گیا۔ لاطینی علوم عالیہ میں بھی آنکھیں بند کرکے اِن کتابوں کو ارسطو کے قلم کا نتیجہ سمجھا گیا، لیکن اس اشتباہ میں ایسے عوامل کارفرما رہے جن کی وجہ سے اسلامی دور کے مترجمین کا قصور بہت زیادہ نظر نہیں آتا۔ یہ دونوں کتابیں سب سے پہلے سریانیوں نے ارسطو سے منسوب کیں۔ اس کے نتیجے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سریانی تھے جنھوں نے مسلمانوں کو اس غلطی کا مرتکب بنایا۔ اثولوجیائے منحول کے بارے میں یہ عرض کیا جانا چاہیے کہ بادمستارک (Baumstark) نے جس طرح قطعی انداز میں صراحت کی ہے اس کے بعد اس میں شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ مسلمانوں کی اس غلطی کے ذمے دار سریانی تھے۔ بادمستارک نے اس کتاب کی بعض فنی اصطلاحات کے تجزیے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اثولوجیا کا سب سے قدیم عربی ترجمہ اس کے سریانی ترجمے کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ خود کتاب العلل بھی سریانی زبان کے وسیلے سے عربی میں منتقل کی گئی تھی۔ اس بارے میں خاص طور پر یہ قوی شہادت ہوگی کہ اس کتاب کا موضوع سریانی متکلمین کے افکار سے مکمل مطابقت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے یہ بات دل کو لگتی ہے کہ کتاب العلل کا عربی ترجمہ بھی سریانی ترجمے سے کیا گیا تھا۔ اس طرح سریانی زبان نے جہاں عربی ادب کی خدمت انجام دی وہاں اس قسم کے اشتباہات بھی اس کے ذریعے عربی ادب میں داخل ہو گئے اور سریانی زبان کے وسیلے سے اگر بہت سی علمی اور فلسفیانہ کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں تو اسی کے ساتھ مسروقہ تحریریں بھی اسی زبان کے ذریعے عربی میں رائج ہوئیں بہرحال ہم جو کچھ اسلامی دور کے مترجمین کے بارے میں عرض کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ مترجم سہو و خطا سے مبرّا تھے اور اپنے کاموں میں دقّتِ نظر اور دیانت جیسی شرائط کو انتہائی فرض شناسی کے ساتھ برتتے تھے۔

اسلامی دور کے مترجمین نے ترجمہ کرنے کے اپنے بنیادی فرائض پر ایک دوسری خدمت انجام دینے کا اضافہ بھی کر لیا۔ یہ مترجم چونکہ علم و دانش کی اشاعت کے خواہاں تھے اس لیے

انھوں نے مختلف علوم پر جیسے طب، علومِ طبیعی، کیمیا، نجوم، ریاضیات اور فلسفے پر بہت سی کتابیں خود بھی تصنیف و تالیف کیں۔ یہ کتابیں کہنا چاہیے کہ اِن کے مطالعات کا ماحصل تھیں۔ وہ اِن کتابوں کے نام بھی ایسے رکھتے تھے جن سے ان کے انکسار کا احساس ہوتا تھا۔ بہرحال اِن تصانیف نے اسلامی دنیا میں عقلی مطالعات کی شعاعوں کو پہنچایا اور اسی طرح انھوں نے اس زمانے کے مسلّمہ علوم کی مکمل تصویر کا خلاصہ اور اس کی روح کو پیش کر دیا اس کام نے علوم کے ایک طرح ابتدائی نقوش کو غیر متخصص اشخاص میں عام کر دیا۔ اسی کے بعد اہلِ تخصص کی سنجیدہ اور گہری تحقیقات کا دور شروع ہوا اور مسلمانوں نے اپنے گوناگوں علوم پر مدارس و مکاتیب میں آزادانہ کام شروع کیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی مترجمین کا کام نہایت اہم اور قابلِ توجّہ ہے۔ اِن مترجمین نے ایک عظیم تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ اِن کے تراجم الفاظ و معانی دونوں کے لحاظ سے نہایت معتبر ہیں۔ ان کا سبب یہ ہے کہ اِن مترجمین نے بعض اشتباہات سے قطع نظر یونانی تہذیب و تمدّن کو خود اس تہذیب و تمدن کے علمبرداروں کی طرح اسلامی دنیا میں منتقل کیا۔ تاریخ علوم کے لحاظ سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ اِن تراجم کی ایک دوسری ارزش بھی ہے جو اِن کے دوسرے اہم پہلوؤں سے کسی طرح کم نہیں۔ وہ ارزش یہ ہے کہ اِن تراجم نے یونان اور عربستان کے درمیان ایک رابطہ برقرار کیا، عربی علوم عالیہ کو یونانی علوم کی طرف متوجّہ کیا اور مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح اِن مترجمین نے عہدِ قدیم کا قرونِ وسطیٰ سے رشتہ استوار کیا۔ اِن تراجم ہی کے واسطے سے لاطینی زبان جاننے والے بہت سے کلاسیکی آثار سے روشناس ہوئے۔ آج بھی بعض ایسی یونانی تصانیف کا ہمیں علم ہے جن کا اصلی متن نابود ہو چکا اور جنھیں ان تراجم نے دست بردِ زمانہ سے محفوظ رکھا ہے۔ ایسی تصانیف کے بارے میں اپنی واقفیت کے لیے ہم انھیں تراجم کے احسان مند ہیں۔

ختم شد

ہمدردیوں کا شکریہ

احقر کی والدہ ماجدہ (اہلیۂ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ) کے سانحۂ ارتحال پر بہت سے مخلص حضرات اور بزرگوں نے تعزیتی خطوط سے نوازا اور بہت سے حضرات نے غریب خانہ پر تشریف لاکر اس غم واندوہ کے موقع پر تعزیت فرمائی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اِس ہمدردی و خلوص سے غمزدہ دل کو دلاسا ملا ربِّ کریم ان تمام حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

سب حضرات کا فرداً فرداً خطوط کے ذریعہ شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں ہو سکا اس لئے ذریعۂ ہذا تمام حضرات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں اُمید کہ اسی پر اکتفا فرمائیں گے۔

—— حق تعالیٰ اس تعلق و اخلاص کو قائم رکھے جو ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔

شکر گذار:

صاحبزادہ عمید الرحمٰن عثمانی

نگران برہان وندوۃ المصنفین۔ دہلی

علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی فقہ حنفی کی تائید

اسباب اور ثمرات

از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبہ عربی امر سنگھ کالج سری نگر کشمیر

(۲)

حضرت شیخ احمد سرہندی اور مدرسہ ولی اللہی

گو ہندوستان میں فقہ حنفی کی ترویج و اشاعت صوفیائے کرام اور مبلغینِ اسلام ہی کے ذریعہ ہوئی[۱] تاہم یہاں حنفی مسلک کو آخری دور کی دو[۲] نمایاں ترین شخصیتوں کی عظمت وجلالت سے استحکام ملا، ہماری مراد مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی اور حضرت شاہ ولی اللہ

لہ ابن خلدون: ص ۳۸۸، مطبعۃ البہیۃ، مصر

عہ "ابتداءً مؤطا میں دس ہزار حدیثیں تھیں مگر امام صاحب نے سب کو قلم زد کر دیا۔ اب ۱۷۲۵ باقی ہیں جس میں مسند و مرفوع ۶۰۰، مرسل ۲۲۲، موقوف ۶۱۳ اور تابعین کے اقوال و فتاویٰ ۲۸۵ ہیں" مقدمہ اوجز المسالک ص ۲۸ بحوالہ محدثینِ عظام: مولانا تقی الدین ندوی: ص ۸۳

محدث دہلویؒ سے ہے۔ دونوں مجددین کرام اصول و فروع میں امام ابو حنیفہؒ کے مقلد تھے۔ حضرت مجدد صاحبؒ نے اگرچہ تحریری طور پر فقہ حنفی کی کوئی خدمت انجام نہیں دی ہے تاہم ان کی سخت حنفیت مسلک حنفی کے استحکام میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔ ان کے سینکڑوں ارادتمند اور مسترشدین، جو وقت کے بلند مرتبہ علماء تھے، اپنے شیخ کے نقش قدم پر چلنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ امام اعظمؒ کے بارے میں حضرت مجددؒ کا ذاتی خیال یہ تھا کہ اگر دوسرے ائمہ مجتہدین بھی عظمت و جلالت میں کچھ کم مرتبہ نہیں رکھتے ہیں تاہم امام صاحبؒ کا مقام نہایت بلند ہے:

چہ کنم کہ دیگراں را با وجود وفور کمال تقوی در جنب ابی حنیفہؒ برنگ طفلاں می یابم[5]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی حنفی مسلک کے مقلد تھے۔ البتہ اپنی زندگی کے وسطی دور میں تقلید کے بارے میں انھوں نے تجدیدی افکار پیش کئے (یہ وہی دور تھا جب وہ "تفضیل" کی طرف بھی مائل ہو رہے تھے) جس کا مقصود تقلید و جامد پر ضرب لگانا تھا جس نے عرصہ دراز سے مسلمانوں کو فکری جمود اور علمی افلاس میں مبتلا کیا تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ تجدیدی قدم بھی امام ابو حنیفہؒ کے مزاج اور فکر کے عین مطابق تھا امام صاحب نے دین و شریعت میں فکر و نظر کو جو مقام و مرتبہ دیا تھا انہی کے نام لیواؤں نے آخری ادوار میں لکیر کے فقیر بن کر اس سے منھ موڑا تھا اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اسی اندھی تقلید کو توڑنے کی کوشش کی۔ ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ مسلمانوں کو ائمہ مجتہدین کی تقلید سے یکسر آزاد ہونے کی طرف راغب کیا جائے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ جیسا عبقری فاضل اور نباض مصلح ہندوستانی مسلمانوں کو جن کی معاشی و سیاسی

---

[5] مکتوبات: دفتر دوم، مکتوب ۵۵

حالت انتہائی ابتر اور معاشرتی ماحول انتہائی پراگندہ تھا، ائمہ کرام کی تقلید سے بے نیاز ہونے کا خطرہ کیوں کر مول لے سکتے تھے۔ چنانچہ اِس وسطی دور میں بھی جب وہ تقلید میں وسعت پیدا کرنے کے خواہاں تھے کھلی عدم تقلید کے خطرات و مضرات کو صاف صاف بیان کیا: فرماتے ہیں:

ومما ینا سب ہذا المقام التنبیہ علی مسائلِ ضلّت فی بوادیہا الافہام وزلّت الاقدام و طغت الاقلام منہا انّ ہذہ المذاہب الاربعۃ المدوّنۃ المحرّرۃ قد اجتمعت الامۃ او من یعتدّ بہ منہا من جواز تقلیدہا الیٰ یومنا ہذا، وفی ذلک من المصالح ما لا یخفی۔ لاسیما فی ہذہ الایام التی قصرت فیہا الہمم جدًّا واشربت النفوس الھویٰ واعجب کلّ ذی رأیٍ برائہ [۱]

اس موقعہ پر بعض ایسے مسائل پر، جن میں بہت سے لوگوں کی عقلیں گمراہ ہوئیں، قدم پھسل گئے اور قلم بے لگام ہوئے، متنبہ کرنا مناسب ہوگا۔ ان میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ فقہ کے یہ چار مذاہب مرتب اور مدوّن صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں، اِن کی تقلید پر تمام امت اور قابلِ اعتبار علماء نے جواز کا فتویٰ دیا ہے جو آج تک برابر قائم ہے کیونکہ اس میں بہت سی ایسی مصلحتیں مضمر ہیں جو پوشیدہ نہیں ہیں بالخصوص اِس زمانے میں جب کہ لوگوں کی ہمتیں کافی پست ہوگئی ہیں، ان کے دل نفسانی خواہشات سے بھر گئے ہیں اور ہر شخص کو اپنی رائے پر پندار ہے۔

---

[۱] حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱، باب: فی عدّۃ امورٍ مشکلۃ من التقلید واختلاف المذاہب وغیرہما۔

خاص فقہ حنفی کے بارے میں بھی انھیں بہت جلد اطمینان قلب ہوا کہ سنّت کے عینِ مطابق ہے یہاں تک کہ فیوض الحرمین میں فرماتے ہیں:

عرّفنی رسول اللہ انّ فی المذہب الحنفی طریقۃ انیقۃ ھی اوفق الطرق بالسنۃ المعروفۃ التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابہ[۱]

مجھے رسول اللہؐ نے اِس حقیقت سے باخبر فرمایا کہ حنفی مذہب میں پسندیدہ راہ ہے یہ دیگر مذاہبِ فقہیہ کے بنسبت اُس سنّتِ معروفہ سے زیادہ موافقت رکھتا ہے جو امام بخاری اور اُن کے تلامذہ کے عہد میں مرتب و منقح ہوئی۔

انھیں حرمین شریفین میں پیغمبرِ اکرمؐ سے جو فیوض و فتوحات براہِ راست حاصل ہوئے تھے، اُن میں ایک وصیت یہ تھی:۔

الوصاۃ بالتقلید بھذہ المذاھب الاربعۃ لا اخرج منھا۔[۲]

آپ نے مجھے اِس بات کی وصیت فرمائی کہ میں مذاہبِ اربعہ سے باہر قدم نہ رکھوں۔

--- آخر عمر میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ حنفی مسلک کے ٹھیٹھ مقلد ہوئے تھے اور اسے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و مذہبی تنظیم اور معاشرتی ڈسپلن کے لئے بہت ضروری سمجھتے تھے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ جن کے بارے میں پروفیسر محمد مجیب لکھتے ہیں کہ وہ شاہ ولی اللہ صاحب کے فکر و فلسفہ کے وسیع النظر

---

[۱] فیوض الحرمین: ص ۴۸

[۲] عقد الجید: ص ۳۸

عالم تھے [1] ــــ حضرت شاہ صاحب رح کے افادات اور نظریات کی روشنی میں صاف صاف لکھتے ہیں:

"ایسے لوگوں کو جو حنفی بننا نہیں چاہتے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کو ہندوستانیت سے خارج کر دیا ہے۔ انھیں کوئی حق نہیں کہ ہندوستانی معاملات میں دخل دیں۔ [2]"

ایک دوسرے مقام پر مولانا سندھی رح فرماتے ہیں:۔

"ایسے عالم جن کو حنفیت پر اعتماد نہ ہو اور وہ مذاہبِ اربعہ میں سے کسی مذہب کے پابند ہو کر نہ رہ سکیں اُن سے شاہ ولی اللہ نے تبری کی ہے" [3]

ان تاریخی حقائق کے باوجود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح حنفی مسلک کی وہ علمی خدمت انجام نہیں دے سکے جو بالآخر انہی کے دبستان سے وابستہ علماء کے حصے میں آئی۔

ہندوستان میں عدمِ تقلید کا رجحان

غدر نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جہاں سیاسی حیثیت سے ذلت وادبار کی

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی مکتوبات: پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کے "مقدمہ" مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ــــ مولانا سندھی رح کے بارے میں ایسا ہی خیال مولانا سید سلیمان ندوی رح نے بھی اپنے ایک مطبوعہ مکتوب میں ظاہر کیا ہے یہ مکتوب اُنھوں نے مولانا منظور صاحب نعمانی کو بھیجا تھا مولانا ندوی کی مولانا سندھی کے بعض ذاتی افکار سے شدید اختلاف رکھتے تھے مگر اس کے باوجود اُنھوں نے کھلے دل سے فلسفۂ ولی اللّٰہی میں ان کے تبحر و تعمق کا اعتراف کیا ہے۔

[2] امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف: مولانا سندھی رح: ص ۸، [3] ایضاً

بستی میں جھونک دیا وہاں اپنے ساتھ آزاد خیالی اور من پسندی کی وبا بھی لے آیا۔ آزاد خیالی اور عدم تقلید کے نام پر اسلافِ کرام سے عمومی بدظنی اور ان کی علمی وفکری سرمائے کی تحقیر و توہین عام ہوئی جس کے نتیجے میں بے شمار ابجد خواں اپنی اپنی جگہ مستقل شیخ الاسلام بن بیٹھے۔ یہ حقیقت آنکھوں سے بالکل اوجھل ہوگئی کہ امتِ اسلامیہ کے جلیل القدر علماء مذاہبِ اربعہ میں سے کسی نہ کسی مسلک و مذہب کے مقلد تھے اور اُن کی تقلید امام ان کے اعلیٰ مراتب و مقاصد حاصل کرنے کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوئی تھی۔[1] اس کے برعکس ہندوستان میں اِن ایام میں تقلید ایسی مبغوض اور معتوب چیز بن گئی تھی جس کے اختیار کرنے میں ساری ذلتیں مستور سمجھی جاتی تھیں اور ترک کرنے میں ترقی ہی ترقی مضمر قرار دی جاتی تھی۔ اس سے لازماً تقلید کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان بغض و عناد کی بدترین بیماری پھوٹ گئی اور مسلمان رسوائے زمانہ خانہ جنگی میں مبتلا ہوئے۔ اس خانہ جنگی کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی تھا کہ بڑے بڑے علماء اور اکابرِ امت کھلی گالی گلوچ اور بے لگام بدزبانی کا نشان بن جاتے تھے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت نمایاں طور پر اس ظلم و زیادتی کا ہدف بنی ہوئی تھی۔ بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرتِ

---

[1] حافظ ابن تیمیہؒ، قاضی شوکانیؒ، شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ جیسے لوگ بھی ائمہ فقہا کے مقلد تھے۔ حافظ صاحبؒ اور شیخ نجدیؒ دونوں امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد تھے، قاضی شوکانیؒ کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں کہ مرتبۂ اجتہاد پر فائز ہونے کے باوجود اپنی تالیفات میں کسی جگہ دائرہ مذاہب اربعہ سے باہر نہیں ہوئے الا ماشاء اللہ (اتحاف النبلاء: ص ۴۰۹) یہ دوسری بات ہے کہ علامہ انور شاہؒ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ قاضی شوکانیؒ کے علم و فضل کے معترف تھے مگر ان کی تقلید کے بارے میں مختلف خیال رکھتے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ قاضی شوکانی ائمہ کی تقلید سے منع کر کے اپنی تقلید کروانا چاہتے ہیں (ان الشوکانی ... ینکر علی تقلید الائمۃ ثم یرید ھو ان یدعوا لناس الی تقلیدہ) فیض الباری ج ۱ ص ۱۵۱۔

محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ایک جگہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اس توہین و تحقیر سے بے حد رنجیدہ ہو کر اپنی کتاب "توثیق الکلام" میں لکھتے ہیں:

"جس وقت امام صاحبؒ کی توہین سنی جاتی ہے دل جل کر خاک ہو جاتا ہے"[۱]

بعض لوگ احناف کو صاف الفاظ میں مباح الدم قرار دیتے تھے۔ مولانا سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے اپنے سفر نامہ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں ایک مولوی صاحب نے کسی حنفی المسلک مسلمان کو مستحل الدم قرار دے کر اس کی بیوی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ لرزا دینے والا واقعہ درج کرنے کے بعد مولانا مرحوم اپنا تاثر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"یہ واقعہ سننے پر مجھے عورت کے نکال لانے پر اتنا تعجب نہ ہوا جتنا اس حنفی کو مستحل الدم سمجھنے پر، باوجودیکہ اس میں (حنفی مذہب میں) کچھ نہیں ہے۔"[۲]

مولانا ممدوح ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"مقلدین کی مساجد میں گوشت کے ٹکڑے اور دوسری ناپاک چیزیں رات کے وقت ڈال دی جاتی تھیں"[۳]۔

اس طرح کے واقعات نقل کرنے کے بعد مولوی محمد الحسنیؒ مرحوم لکھتے ہیں:

"اہلِ حدیث کا احناف سے بغض و عناد اِس درجہ بڑھ گیا تھا کہ اس نے اخلاقی اور انسانی حدود کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔"[۴]

---

۱ بحوالہ سوانح قاسمی: مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ: ج ۲ ص ۲۲

۲ دہلی اور اس کے اطراف: ص ۵۹ ۳ ایضاً: ص ۹۹

۴ مولانا محمد علی مونگیری۔

اس بدترین صورتِ حال کا ایک اور افسوسناک پہلو یہ بھی تھا کہ گو اس زمانے میں علوم وفنون میں تحقیق وتمحیص کا ایک نیا دور شروع ہوچکا تھا مگر امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے فقہی اسکول کو بدنام کرنے کے لئے اُنہی گھسی پٹی باتوں کی تشہیر کی جاتی تھی جو بعض متقدمین نے کسی وجہ سے ظاہر کی تھیں [1]، بے بنیاد اور من گھڑت روایتیں پھیلائی جاتیں اور تاریخی واقعات بے دردی سے مسخ کئے جاتے تھے یہاں تک کہ من پسند خیالات کو تقویت پہنچانے کے لئے قرآنی آیات کی بھی تحریف وتاویل کی جاتی تھی۔ آیت واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ الخ (البقرہ - ۱۷۰) پر تقلید فقہی کے مخالفین کے تفسیری نوٹ اس سلسلے میں پڑھنے کے لائق ہیں [2]۔ وہ علماء، جو معتدل فکر وقلم کے مالک سمجھے جاتے ہیں، بھی اس قسم کی لغزشوں سے محفوظ نہیں رہتے تھے۔ وہ بھی کسی نہ کسی طرح تقلید فقہی سے نفرت دلانیوالے نکتے اُبھارتے تھے یہ "نکتہ آفرینی" دیکھ کر "تقلید" کی بدنامی کی شدت ہی کا اندازہ نہیں ہوتا ہے بلکہ تعصب اور تنگ نظری کا عبرتناک انجام کھل کر سامنے آتا ہے۔

---

[1] بعض ناقدین کی رائے میں یہ امام ابوحنیفہؒ کا فضل وکمال تھا جو بعض علماء کیلئے ابتلا کا باعث بنا یہاں تک کہ بعض اہلِ علم اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شاعر نے اسے امام ابوحنیفہؒ ہی کے بارے میں کہا ہے ؎

حسدوا الفتیٰ اذ لم ینالوا سعیہٗ والناس اعداءٌ لہٗ وخصوم

[2] مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"بعض کج رائے فرقوں نے آیت سے تقلید فقہی کا عدم جواز ثابت کرنا چاہا ہے حالانکہ قاعدہ اقتضاء النص اس کا مقتضی ہے کہ آیت سے تقلید کے عدم جواز پر نہیں عین جواز پر استدلال کیا جائے آیت میں جس امر کی مذمت وارد ہوئی ہے وہ نفس تقلید نہیں بلکہ گمراہ ونادان اسلاف کی تقلید ہے اور یہ قید خود اس امر کی دلیل ہے کہ محققین اہلِ علم کی تقلید جائز ہی نہیں بلکہ عین مطلوب ہے۔" تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۲۹۱۔

حکومتِ برطانیہ کے پہلے قاضی القضات

مولانا نجم الدین علی خاں علوی ثاقب کاکوروی

مسعود انور علوی کاکوروی۔ ریسرچ اسکالر۔ شعبۂ عربی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی ہے ان کی ذہنی حالت یہ ہو رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی جوش و خروش سے گھبرا اٹھے ہیں انھیں ایسے فاضل علمائے حق شناس کی تلاش ہے جو "مسلم پرسنل لا" کو رائج کر کے مسلمانوں کے فقہی مسائل کو ان کے اطمینانِ قلب کے مطابق نافذ کر سکیں اس عہد کا ہندوستان اپنے علم و فضل میں مشہور ہے خصوصاً صوبۂ اودھ کا تو ہر ہر قصبہ کف گل فروش ہو رہا ہے۔ چنانچہ جوینده یابنده بود ان کو اسی صوبہ کے مشہور مردم خیز قصبہ کاکوری کے افقِ درخشاں پر ایک نیر تاباں نظر آگیا اور اُن کی مردم شناس نظروں نے تاڑ لیا کہ بس یہی وہ شخصیت ہے کہ جو تدوینِ فقہ کو زمانے کے حالات پر ڈھال کر مسلمانوں کے مذہبی امور کے شافی و اطمینان بخش فیصلے قرآن و حدیث اور ائمۂ اربعہ کے فتاوی کی روشنی میں انجام دے سکے۔ چنانچہ انھوں نے اسی نیر تاباں کو "قاضی القضات" جیسے موقر اور اہم منصب پر متمکن کیا اُسے تمام اختیارات دیے کہ وہ مختلف مقامات پر اپنی مرضی کے مطابق اور باصلاحیت قاضی مقرر کرے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے

کر اُس نے اس کام کو ایسا بوجوہ احسن انجام دیا کہ گورنر جنرل اور کمپنی بہادر کے جملہ ڈائرکٹرس اس کے فضل و کمال کے گرویدہ ہو گئے اور جو خصوصی اعزاز و مراعات اُسے تفویض ہوئے تھے وہ اُس کے بعد پھر کسی قاضی کو نہ دیے گئے۔

اس نیّر تاباں کو عرف عام میں نجم الدین علی خاں علوی بہادر اشرف جنگ ثاقبؔ کاکوروی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

عہد اکبری سے قصبہ کاکوری (ضلع لکھنؤ) میں علویوں کے دو ممتاز خاندان آباد ہیں جن میں سے ایک خاندان مخدوم زادگان ہے جس کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم نظام الدین القاری المعروف بہ شاہ بھکاری (م ۹۸۱ھ) کے توسط سے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ دوسرا خاندان ملک زادوں (مولوی زادوں) کا ہے جس کے نسب کا سلسلہ ملک بہاء الدین کیقباد بن ملا ابوبکر جامی سے ہو کر حضرت علی رضہ پر منتہی ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں خاندانوں میں ہر دور میں بڑے بڑے مشاہیر، فضلاء، علماء، فقرا اور ارباب دول و ثروت اور صاحبان دل پیدا ہوئے ہیں۔

نام و نسب : قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں ملک زادگان کے اس گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے اسلاف جس قدر باعث رشک ہوئے اسی قدر اس کے اخلاف بھی قابل فخر ہوئے ہیں۔ مولوی مسیح الدین خاں علوی سفیر شاہ اودھ اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔

"یہ وہ زمانہ تھا تینتیس چالیس برس کا بیشتر کہ صرف میرے اپنے خاندان میں سات آدمی صدر الصدور تھے اور بارہ منصف تھے، تین صدر امین تھے چھ آدمی تحصیل دار تھے اڑھائی سو روپیہ سے ڈیڑھ سو تک کے نوکر تھے۔ ایک میرے چچا بادشاہ اودھ کی سرکار میں چار ہزار روپے مہینے کے نوکر تھے۔ ایک میرے چچا پندرہ سو روپے مشاہرے کے سرکار دولت مدار کی طرف سے نواب خورد سال فرخ آباد کے بجنط یعنی نائب مختار تھے، ان کے اختیار اور داد و مدار کی کیفیت اور میں کیا بیان کروں۔ حقیقت میں وہ خود گویا فرخ آباد کے نواب تھے۔

قریب دو ڈھائی سے آدمی کے اپنے عزیز اور اقربا دو سو روپے درماہے سے لے کے دس پندرہ روپے درماہے تک وہاں ان کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ اور اس چھوٹے سے قصبہ کے بہت ہمارے بھائی بند ممتاز عہدوں پر بادشاہ اودھ کی سرکار میں اور سرکار دولتمدار انگریزی میں نوکر تھے۔ راقم خود چھ سو روپے درماہے کا نوکر تھا۔ میرے والد مغفور اور میرے بڑے بھائی مرحوم صدالصدور تھے ایک میرے چھوٹے بھائی دو سو مہینے کے نوکر تھے[۱] الخ

سلسلۂ نسب: سلسلۂ نسب تیس واسطوں سے حضرت علی مرتضی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ تک اس طرح پہنچتا ہے۔

نجم الدین علی خاں ثاقب (۱) بن حضرت ملا حمید الدین محدث رح (۲) بن ملا غازی الدین شہید (۳) بن ملا محمد غوث (۴) بن ملک ابوالخیر (۵) بن ملک عبدالغفار معروف بہ ملک ابوالمکارم (۶) بن ملک عبدالسلام (۷) بن ملک میٹھے (۸) بن ملک حافظ چاند (۹) بن ملک حسام الدین (۱۰) بن ملک نظام الدین (۱۱) بن ملک بہار الدین کیقباد (۱۲) بن ملا ابوبکر جامی[۲] (۱۳) بن خواجہ درویش علی محمد (۱۴) بن خواجہ شیخ احمد جام زندہ فیل (۱۵) بن خواجہ شیخ جامی (۱۶) بن خواجہ ابوطالب جامی (۱۷) بن خواجہ محمد شاہ شاہ جامی (۱۸) بن خواجہ محمد رضا جامی

۱۔ رپورٹ مرسلہ مولوی محمد مسیح الدین خاں بہادر از مقام کاکوری متعلق اودھ موصولہ ۷ جون ۱۸۷۵ء محفوظ سرسید اکادمی، سرسید ہاؤس مسلم یونیورسٹی علی گڈھ: ۶، راقم الحروف اس کے واسطے محترم ومکرم ڈاکٹر صفی احمد صاحب انچارج اکادمی کا ممنون ومشکور ہے۔

۲۔ ملا ابوبکر جامی کی شادی ملک اسعد الدین سالاری وزیر اعظم سلطان حسین شرقی فرمانروائے سلطنت جونپور کی بیٹی کے ساتھ ہوئی جن کے بطن سے بہار الدین کیقباد پیدا ہوئے اس وقت سے نانہیالی نسب کے لحاظ سے ان کا لقب ملک قرار پایا جبھی سے ان کی اولاد ملک زادے کہلائی۔ ۱۲ منہ۔

٭ ٭ ٭

(۱۹) بن خواجہ موسیٰ جامی (۲۰) بن خواجہ عمران جامی (۲۱) بن خواجہ عثمان (۲۲) بن خواجہ ابو حنیفہ (۲۳) بن خواجہ اسفندیار (۲۴) بن خواجہ ابوالحسن کوفی (۲۵) بن خواجہ ابو تراب (۲۶) بن خواجہ محمد رضی کوفی (۲۷) بن خواجہ محمد (۲۸) بن حضرت ابوالقاسم (۲۹) بن حضرت محمد ابن الحنفیہ (۳۰) بن حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ولادت اور تعلیم: آپ کی ولادت ۱۵ ربیع الاول ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء کو کاکوری میں ہوئی۔ مادۂ سال ولادت کسی نے "نجم ثاقب" نکالا۔[۱]

تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد ملا حمید الدین محدث (۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء) ملا حسن فرنگی محلی و مولوی غلام یحییٰ بہاری سے حاصل کی۔ بچپن ہی سے بڑے ذہین و طباع تھے۔ صاحب سفر نامۂ لندن رقمطراز ہیں کہ "پندرہ[۱] برس کی عمر میں تمام معقولات و منقولات کی کتابوں سے فارغ التحصیل ہوئے[۲] علم حدیث کی سند شیخ ابوالحسن سندی سے حاصل تھی۔[۳]

صاحب نزہۃ الخواطر تحریر کرتے ہیں:

الشیخ الفاضل الکبیر القاضی نجم الدین بن حمید الدین بن غازی الدین بن محمد غوث الکاکوروی۔ قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں کان من العلماء المشہورین فی الھند ولد بکاکوری لخمس عشرۃ خلون من ربیع الاول

شیخ فاضل بزرگ قاضی نجم الدین بن حمید الدین بن غازی الدین بن محمد غوث کاکوروی۔ قاضی القضات نجم الدین علی خاں ہندوستان کے مشہور علماء میں سے تھے۔ ۱۵ ربیع الاول ۱۱۶۷ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ اپنے والد سے علم حاصل کیا پھر شیخ عبدالرشید

---

[۱] باقیات الصالحات۔ مولوی ممتاز الدین حیدر (مخطوطہ)

[۲] سفر نامۂ لندن مسیح الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ (مخطوطہ): ۳۶۴

[۳] تذکرہ مشاہیر کاکوری، حافظ شاہ علی حیدر قلندر ص: ۳۳۷

سنۃ سبع وخمسین ومائۃ والف، واشتغل بالعلم علی ابیہ مدۃ ثم اخذ عن الشیخ عبد المجید جونپوری المدفون بلکھنؤ والشیخ غلام یحییٰ بن نجم الدین البھاری وملا حسن بن غلام مصطفیٰ اللکھنوی ولعلہ اخذ الفنون الریاضیۃ عن العلامۃ تفضل حسین الکشمیری [۱]

جونپوری جن کا مزار لکھنؤ میں ہے اور شیخ غلام یحییٰ بن نجم الدین بہاری اور ملا حسن بن غلام مصطفیٰ لکھنوی سے تحصیل علم کیا اور شاید فنون ریاضی کا اکتساب علامہ تفضل حسین کشمیری (م ۱۲۱۳ھ) سے کیا تھا۔

یوں تو تمام علوم وفنون میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے لیکن علم جفر ورمل اور ریاضی میں بڑی دست گاہ تھی۔ سفرنامہ مولوی مسیح الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ [۲] میں درج اس واقعہ سے آپ کی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۷۵ء) کو خود علم جفر کا بڑا شوق تھا۔ انھیں اتفاق سے اس فن میں حکیم ماشاء اللہ خاں سے ایک کتاب مل گئی تھی جسے نواب بہت عزیز رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کی تصحیح کے لیے علمار فیض آباد و بیرون جات مقرر ہوئے مگر کسی سے اس کی صحت نہ ہو سکی۔ قاضی القضات صاحب بھی اس کی تصحیح کے واسطے طلب کیے گئے چنانچہ انھوں نے محض

---

[۱] نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر۔ سید عبد الحی الحسنی ص ۷۰-۴۹

[۲] حاجی مسیح الدین خاں (بن قاضی علیم الدین خاں بن قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں) سفیر شاہ اودھ و میر منشی گورنر جنرل بہادر (م ۱۲۹۹ھ) کا یہ سفرنامہ اس عہد کے اودھ کی حالات اور انگریزوں کے مستند و دلچسپ حالات میں ایک نادر و نایاب مخطوطہ ہے۔ چودہ سو صفحات پر مشتمل یہ مخطوطہ پانچ ابواب پر منقسم ہے جن میں سے ایک باب میں مؤلف موصوف نے اپنے اہل خاندان کے حالات بھی تحریر کیے ہیں۔

یادداشت پر اس کی تصحیح شروع کردی اور ساتھ ہی ساتھ ایک بسیط شرح بھی لکھنی شروع کی خود نواب موصوف روزانہ اس کو آکر دیکھتے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا کہ نواب کو آتے دیکھ کر یہ تعظیماً کھڑے ہوتے مگر وہ باصرار ان کو بٹھادیتے اور خود کھڑے ہو کر ان کا کام دیکھتے رہتے تھے۔ نواب نے اپنی تخت نشینی کے بعد یہ طے کر لیا تھا کہ اب کسی کو معافی نہ دی جائے گی چنانچہ جن جن اشخاص کو معافی دی گئی تھیں وہ بھی ضبط کر لی گئیں۔ ملا حمید الدین محدث کاکوروی کو بھی ایک موضع موسومہ بہ "دگھیا" معاف ہوا تھا وہ بھی ضبط ہو گیا۔ قاضی القضاۃ صاحب نے اپنے حسن خدمت اور کارگذاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے معافی کی درخواست دی بہ ظاہر اس موضع کی واپسی کی کوئی صورت نہ تھی لیکن نواب نے ان کی لیاقت ذاتی اور حسن عمل کی بنا پر وہ موضع دوبارہ معافی میں دے دیا۔ چنانچہ یہ معافی کا پروانہ لے کر گھر آئے اور حسب دستور سابق درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔"

آپ کے علم وفضل اور کمال کا شہرہ سن کر الماس علی خاں نے اپنے مدرسہ کا منصب مدرسی قبول کرنے کو کہا جسے آپ نے قبول کر لیا۔[۱]

"آغاز تیرھویں صدی ہجری میں منجانب ایسٹ انڈیا کمپنی جب عہدۂ قاضی القضاتی کے تقرری کی تجویز کلکتہ میں ہوئی تو اس زمانہ میں علامہ تفضل حسین خاں نے (جو آصف الدولہ بہادر (۱۱۸۸ھ تا ۱۲۱۲ھ) کے وقت میں کلکتہ میں سفیر تھے) ان کے فضائل وکمالات علمی کا تذکرہ نواب گورنر جنرل بہادر سے کیا اس وقت اس عہدہ کا تقرر سرکار انگریزی میں در پیش تھا۔ بہت سے علماء کے نام پیش تھے۔ خوش قسمتی سے یہی منتخب ہو کر مالک محروسہ سرکار کمپنی کے اول

قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔"

مولوی مسیح الدین خاں علوی سفیر اودھ لکھتے ہیں:

.... ہندوستان کے گورنر جنرل نے نواب آصف الدولہ کو لکھا کہ ایک کسی فاضل مستعد کو یہاں بھیج دیجیے۔ ہم کو واسطے منصب قاضی القضات کے درکار ہے یہاں سے حضرت جدامجد قاضی نجم الدین علی خاں مغفور کو حکم روانگی کا ہوا۔ آپ نے بہت شرائط کیے وہ سب شرائط منظور ہوئے۔ جملہ ان شرائط کے ایک شرط یہ بھی کہ جمعہ کے دن ہم تعطیل کریں گے۔ چنانچہ صدر عدالت میں غدر کے پیشتر تک جمعہ کو تعطیل ہوا کرتی تھی۔ اور مصارف راہ کے کہ ان دنوں میں بہت دشوار گذار تھے آپ نے سوا تنخواہ کے طلب کیے تھے دو ہزار روپیہ عطا ہوئے غرض ان دنوں میں گورنر جنرل معہ ارباب کونسل دیہی حکام صدر عدالت دیوانی کے بھی تھے اس سبب سے قاضی القضات اور دو مفتی صدر عدالت کے بھی منجملہ ارباب کونسل کے سمجھے جاتے تھے۔ جناب جدامجد کا ساڑھے چھ سو روپے درماہہ تھا اور جو عزت و آبرو ملحوظ تھی اس کا لکھنا زاید ہے۔ ابتدا میں جب آپ تشریف لے گئے، گورنر جنرل خود پالکی تک استقبال کر کے لے گئے اور رخصت کے وقت مشایعت بھی کی اور معانقہ کیا۔ تقرر قضات سارے ممالک محروسہ کا آپ کے اختیار میں تھا چنانچہ بہت اپنے عزیزوں کو اور کتنے طالب علموں کو بڑے بڑے شہروں میں قاضی مقرر کیا پانچ سات آدمی طالب علم آپ کے شاگرد بنگالے کے رہنے والے تھے جہاں جہاں کے وہ ساکن تھے، وہیں کے قضات مقرر ہوئے۔[۵]

---

[۵] تذکرہ مشاہیر کاکوری: ۴۳۳

[۶] رپورٹ بابتہ مسائل تعلیم مسلمانان ہند مولوی مسیح الدین خاں: ۹

انگریزوں نے آپ کی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے عہدہ قاضی القضاتی کے واسطے مقرر کیا چنانچہ علامہ تفضل حسین خاں نے ۱۲۰۵ھ میں گورنر جنرل بہادر کے حکم سے تقرری کا خط بھیجا لیکن والد ماجد نے لائق و فائق بیٹے کو اتنی دور کلکتہ نہ جانے دیا۔ مگر پھر جب علامہ موصوف نے بہت اصرار کیا تو اجازت دے دی چنانچہ آپ کلکتہ پہنچے اس زمانہ میں سرجان شور گورنر جنرل تھے وہ استقبال کے لیے آئے پالکی سے خود اُتارا اور باقاعدہ معانقہ کیا۔ آپ جب تک وہاں رہے بڑی عزت و احترام کے ساتھ رہے گورنر جنرل عیدین کے مواقع پر خود آتے اور معانقہ کرتے تھے[1]

باوجودیکہ آپ ایسے منصب پر فائز تھے کہ درس و تدریس کا موقعہ نکالنا مشکل ہوتا تھا لیکن کلکتہ کے دوران قیام آپ نے یہ مشغلہ برابر جاری رکھا چنانچہ صاحب "تذکرہ علمائے ہند" آپ کے حالات میں یوں لکھتے ہیں کہ:

"بمنصب اقضی القضاۃ کلکتہ ممتاز بود مع ہذا اندریس وافادہ طلبہ علوم بغایت می کوشید"[2]

"باوجودیکہ کلکتہ کے قاضی القضاۃ کے منصب پر ممتاز تھے لیکن درس و تدریس اور طالبان علم کے افادہ کے لیے کوشاں رہتے"

ہندوستان کے تمام صوبوں اودھ، الہ آباد، اکبر آباد، اڑیسہ۔ بنگال اور بہار روڈھا کہ وغیرہ تمام جگہوں پر آپ کے ہی فتاوی پر مسلمانوں کے فیصلے ہوتے تھے۔ ۲۵ سال عہدہ قاضی القضاتی پر رہے اور نہایت خوبی سے اپنے فرائض منصبی انجام دیے اور اس کے بعد بہ سبب کبر سنی اس عہدہ سے مستعفی ہوئے[3]

---

[1] سفرنامہ لندن ص: ۱۷۳

[2] تذکرہ علمائے ہند۔ مولوی رحمان علی

[3] سفرنامہ ص: ۱-۰۲۷

فولاہ القضاء الاکبر فاستقل بہ خمسًا وعشرین سنۃ۔　گورنر جنرل نے ان کو قاضی القضاۃ بنایا جس پر وہ پچیس ۲۵ سال رہے۔

اس بارہ میں مولوی مسیح الدین خاں صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

..... ہمارے سب اعمام اور والد ماجد جب فارغ التحصیل ہوتے گئے، ایک ایک ضلع میں مفتی عدالت اور صدر امین مقرر ہوئے، پچیس ۲۵ برس تک آپ نے وہاں تشریف رکھی۔ جب محکمہ صدر عدالت دیوانی کا گورنر جنرل کی کونسل سے علیحدہ ہوگیا تب آپ نے استعفا دیا مگر استعفا منظور نہ ہوا۔ اور جو وجوہ استعفا کے تھے اس کا تدارک ہوا آٹھ ۸ برس یا کچھ کم زیادہ آپ نے پھر تشریف رکھی جب اخیر میں مستعفی ہوئے حکام صدر عدالت نے بنہایت بکراہ منظور کرکے گورنر جنرل کے پاس اس درخواست سے رپورٹ کی کہ کل مشاہرہ کی پنشن مقرر ہو اور جو تعریف و توصیف لکھی اس کا ذکر یہاں عبث ہے۔[۵] الخ

نواب علی حسن خاں سلیم تذکرۂ صبح گلشن میں لکھتے ہیں کہ

"ثاقب - اقضی القضاۃ محمد نجم الدین خاں بہادر رئیس قصبہ کاکوری کہ بہ فاصلۂ پنج کروہ از بیت الحکومت لکھنؤ واقع است۔ وایں قصبہ دراں نواح جماعت ارباب فضل و کمال و مردم خوش رفتار و نیکو کردار و سنجیدہ مقال راحاوی و جامع بود۔ والد ماجدش مولانا حمید الدین در علوم ظاہری و باطنی از اقران و امثال قصب السبق می ربود۔ وجد بزرگوارش ملا محمد غوث فضائل پناہ و کمالات دستگاہ و در علم حدیث استاد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ بود وخود ش کہ نجم ثاقب سماء دین و دولت است بر اکثر فواضل خلقی و خلقی و

---

۵ نزہۃ الخواطر ص ۷: ۴۹۷۔

۵ رپورٹ ص: ۹

علوم عقلی و نقلی و موزونی طبعی و سلیقۂ سخن سنجی احتوا داشت و در صدر الامارۂ کلکتہ
لبلوشان و سمو مکانش احدے از ارباب علم و رسم بر مقصد اقضی القضاتی نہ
گذاشت پایان عمر از عمر قضا دست کشید و بر وظیفۂ بلا شرط خدمت مبلغ سہ صد
روپیہ مشاہرہ قناعت ورزید و از شہر کلکتہ بعزم وطن رخت کشید در اثنار
راہ ہمیں کہ بہ بلدۂ بنارس رسید از عالم قدس ندار ارجعی الی ربک شنید
ناچار بہ تقاضائے اجل موعود صوب وطن توجہ نمود سنہ تسع و عشرین و مأتین و
الف سال ایں واقعہ بود بیلے

"ثاقب قاضی القضاۃ محمد نجم الدین خاں بہادر لکھنؤ سے دس میل قصبہ کاکوری کے
رئیس تھے قرب وجوار کے تمام قصبات سے زیادہ یہاں صاحبان فضل و کمال و مردم
خوش رفتار اور نیک کردار سچے لوگ تھے۔ آپ کے والد ملا حمید الدین علوم ظاہری و باطنی
میں اپنے عصروں میں ممتاز تھے دادا ملا محمد غوث صاحب فضل و کمال اور علم حدیث میں
شہنشاہ عالمگیر کے استاد تھے۔ اور آپ دنیاوی و دینی اعتبار سے نجم ثاقب تھے اخلاق
[illegible] دار علوم عقلیہ و نقلیہ، موزوں طبعی و سخن سنجی میں ممتاز تھے۔ کلکتہ میں کوئی بھی اہل علم
آپ کے مرتبہ قاضی القضاتی پر نہ پہنچا۔ آخر عمر میں عہدہ قضا سے مستعفی ہو کر ۳۰۰ روپیہ
ماہوار پنشن قبول کی (قناعت کی) کلکتہ سے وطن روانہ ہوئے راستہ میں بنارس کے قریب
گویا عالم قدس سے یہ آواز سنی کہ اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف چلا چل ناچار اجل
موعود کے تقاضے کی وجہ سے وطن اصلی کی طرف رُخ پھیرا یہ واقعہ ۱۲۲۹ھ کا ہے لیاقت
اور حسن انتظام کی بنا پر آپ کی وفات کے بعد اعزاز خطاب اور کل تنخواہ بہ طور پنشن ملی اور پھر
آپ کی اہلیہ کو وہ پنشن ملتی رہی۔ ۵۲

---

۵۱ تذکرۂ صبح گلشن، نواب علی حسن خاں سلیم ص: ۹۶۔

۵۲ بیاض ڈپٹی امیر حسن صدیقی کاکوروی (مخطوطہ) ص: ۳۸۲

گورنر جنرل بہادر کے اس تعزیتی خط سے آپ کی وہ قدر و منزلت جو اُن کے دلوں میں تھی مترشح ہوتی ہے۔

"آپ کے شوہر قاضی القضاۃ بہادر کی وفات کا صدمہ سرکار دولت مدار کمپنی کو آپ سے کم نہیں ہوا کہ جس نے ایسے اپنے متوسل لائق شخص اور فاضل بے بدل کو گم کیا چونکہ کارخانۂ قضا و قدر میں بجز صبر اور تسلیم کے کوئی چارہ نہیں یقین ہے کہ آپ ازراہ صبر شکیبائی اختیار کریں گی اگرچہ آپ کے چاروں بیٹے[سے] اعلیٰ عہدوں پر نوکر ہیں آپ کو اپنی بسر بُرد اوقات میں احتمال تکلیف کا نہیں مگر سرکار نے براہ قدردانی و نام آوری آپ کے شوہر کے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار آپ کی پنشن تا عین حیات مقرر کی ہے[سے][لے]

بیعت: آپ کو سلسلہ قادریہ قلندریہ میں حضرت کلید عرفاں سید نا شاہ باسط علی قلندر الٰہ آبادی (م ۱۱۹۶ھ) سے تھی گویا آپ اور بانی خانقاہ کاظمیہ کاکوری حضرت عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندر علوی (م ۱۲۲۱ھ) ایک ہی شیخ سے وابستہ تھے۔ جب حضرت عارف باللہ کی ولایت کی شہرت ہوئی تو قاضی القضات نے بیعت کے لیے اصرار شروع کیا مگر عارف باللہ نے باوجود ان کی خواہش و اصرار کے مرید نہ کیا بلکہ اپنے شیخ حضرت شاہ باسط علی قلندر الٰہ آبادی کا مرید کرایا۔

وفات: کلکتہ سے مستعفی ہو کر وطن آنے کا قصد کیا چنانچہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں بیمار پڑے اور بنارس پہنچ کر یکم ۳ ماہ ربیع الاول روز سہ شنبہ ۱۲۲۹ھ کو ۶۷ سال ۱ ماہ ۱۹ یوم کی عمر میں وفات پائی۔ چونکہ وصیت تھی کہ میری نعش منتقل نہ ہو لہٰذا وہیں باغ فاطمان

[لے] سفرنامہ لندن ص: ۳۷۲

[سے] چاروں بیٹے یعنی ممتاز العلماء قاضی محمد سعید الدین خاں بہادر، مفتی حکیم الدین خاں، قاضی علیم الدین خاں [اور] خلیل الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ۔ [سے] یہ پنشن پابندی سے آپ کی اہلیہ کو ۱۲۴۹ھ ان کی زندگی تک ملتی رہی۔ [illegible]

میں دفن ہوئے[1]

غالباً تذکرہ علمائے ہند اور نزہتہ الخواطر کے مؤلفین کا مرجع مجمع العلماء منظور الدین خاں علوی (مخطوطہ) ہے کیوں کہ صاحب "نزہتہ الخواطر" نے تحریر کیا ہے۔

مات یوم الثلاثاء الثالث عشرۃ خلون من ربیع الثانی سنۃ تسع وعشرین ومائتہ والف[2]

۱۳ ربیع الثانی بروز سہ شنبہ ۱۲۲۹ھ کو وفات پائی۔

صاحب "تذکرہ علمائے ہند" لکھتے ہیں۔

بروز سہ شنبہ سیزدہم ربیع الثانی یک ہزار و دو صد و بست و نہ ہجری رحلت فرمود[3]

ڈپٹی امیر حسن صدیقی اپنی بیاض میں لکھتے ہیں:

قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں بہادر مغفور نہایت زبردست فاضل اور بڑے ادیب اور بلیغ اور صاحب تالیفات گزرے ہیں۔ ترجمہ فارسی ہدایہ کا جو بحکم گورنمنٹ کیا گیا تھا۔ آپ کی مشہور یادگار تالیف ہے جب کلکتہ میں صدر عدالت قائم ہوئی آپ اودھ کے علماء میں بذریعہ نواب آصف الدولہ اودھ منتخب ہو کر حسب الطلب گورنر جنرل کلکتہ بھیجے گئے، عہدۂ قاضی القضات بنگال اور ممالک مغربی و شمالی پر مامور ہوئے اور ۲۵ پچیس برس تک اپنی خدمت کو نہایت اعزاز اور نیک نامی کے ساتھ انجام دیا آخر میں پنشن حاصل فرما کے روانہ ہوئے اور بنارس میں پہنچ کر ۱۳ ربیع الاول ۱۲۲۹ھ کو انتقال فرمایا۔ اور مقام فاطمین میں دفن ہوئے۔

---

[1] سفرنامہ ص: ۳۷۰، تذکرہ مشاہیر کاکوری ص: ۳۰۴۔ [2] نزہتہ الخواطر ص ۷: ۴۶۸
[3] تذکرہ علمائے ہند ص: ۲۳۵۔
[4] بیاض۔ ص: ۳۸۳

آپ کی وفات پر مختلف لوگوں نے قطعہائے تاریخ کہے تھے جن میں سے منشی فیض بخش علوی کاکوروی مؤلف "تاریخ فرح بخش" اور مولوی فتح علی جونپوری کے درج ہیں۔

چو گم شد نجم تاقب از نظر ہا | بہ جنت بے تامل گشت موجود[1]
بجستم سال فوت او زہاتف | شدہ روشن از و فردوس فرمود

۱۲۲۹ھ

مولوی فتح علی جونپوری کے کہے ہوئے دو قطعات درج ہیں:

خان والائے محمد نجم دیں قاضی قضات | ہم محاسب ہم مہندس ہم فقیہ وہم حکیم
چوں سفر کرد از جہاں تاریخش از روئے حساب | از ہمہ الفاظ بر آورد ایں طبع سلیم
ہر چہ خواہی گیر از الفاظ اعدادش بزن | در نود بیس دوازدہ افزائے بردے اے فہیم
طرح کن نہ گاں و باقی کن دو چند وزن بدہ | یک بیفزا و مضاعف کن کہ گردد مستقیم
نہ بنہ در اولش بر خواں کہ تاریخش بود | ایں چنیں تاریخ الہام است از رب کریم[2]
بحر حکمت شمس ملت نجم دیں قاضی قضات | چونکہ در باغ جناں با حور عیں ہم دوش گشت[3]
سر فرو بردم پے تاریخ و در گوشم رسید | علم و فضل و درس و زہد و دیں ہمہ روپوش گشت

اولاد: آپ کے چار[4] صاحبزادے تھے جو سب کے سب آپ کے آئینہ کمال اور "الولد سرّ لابیہ" کی صحیح و بین تصویر تھے۔ تذکرہ علمائے ہند کے مؤلف نے جو یہ لکھا ہے کہ آپ کے تین[4] صاحبزادے ہوئے درست نہیں ہے۔[5]

(ممتاز العلماء قاضی محمد سعید الدین خاں بہادر: ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے منشی فیض بخش کاکوروی نے "روز نیکو سعید پیدا گشت" سے مادہ تاریخ نکالا تعلیم و تربیت

۱۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری ص: ۴۲۷۔

۲۔ مفتاح التواریخ ص: ۳۷۷۔

۳۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری ص: ۴۱۸، تذکرہ علمائے ہند ص: ۲۳۵۔

۴۔ تذکرہ علمائے ہند ص: ۲۳۵۔

اپنے والد ماجد مولانا قاضی القضات اور ملا عماد الدین لبکنی، مولوی فضل اللہ نیوتنوی سے حاصل کی باطنی تعلیم میں شاہ بدر علی صاحب خلیفہ شاہ محمد عاقل سبز پوش کے شاگرد اور مرید ہوئے تعلیم کے ختم کے بعد قاضی مقرر ہوئے اور تمام اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ بغیر آپ کے فتوے کے فوجداری مقدمات کے حکم کا نفاذ نہیں ہوتا تھا۔ اپنے علم و فضل، معاملہ فہمی، ذکی الطبعی کی بنا پر حکام اعلیٰ کی نظروں میں بڑی وقعت تھی۔ ۱۵ شعبان ۱۲۲۱ھ سال یکم جلوس کو ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی سے ممتاز العلماء و خان بہادر کا خطاب دیا پھر اپنے تقویٰ و دیانتداری کی بنا پر انگریزی حکومت کی جانب سے خورد سال نواب فرخ آباد کے چھ سو روپیہ ماہوار پر نائب مقرر ہوئے۔

شعر و سخن کا ذوق بڑا اعلیٰ تھا فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء کو کاکوری میں وفات ہوئی اور اپنے مکان محلہ قاضی گڈھی کی پشت پر دفن ہوئے۔ مولوی محی الدین عمادی ذوقی (م ۱۳۰۳ھ) بن مفتی حکیم الدین خاں بن قاضی القضاۃ نے تاریخ کہی ہے[۱]

افسوس صد افسوس کہ از باد حوادث	شد آتش گل سرد و بہار چمن افسرد
یعنی ز غم نور شبستان کمالات	چوں شمع سحرگاہ دل انجمن افسرد
زیں واقعہ درد کہ گفتیدم نتواں گفت	کاہید ز غم جان و دل پر محن افسرد
ہر قطرۂ مژگاں ترم آب گہر ریخت	چوں گرمی اشک آتش لعل یمن افسرد
از فرط غم و درد رقم سال وفاتش	شد وائے کہ ہنگامۂ بزم سخن افسرد

(باقی آئندہ)

۱۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری ص: ۹۳ — ۱۸۹، سفرنامۂ مولوی مسیح الدین خاں ص: ۳۷۲

÷ ÷ ÷

مولانا محمد عثمانؒ

تیرہ و تار تھی پہلے ہی یہاں شامِ حیات — دامنِ چرخ سے اک اور ستارا ٹوٹا

دار العلوم دیوبند کے نائب مہتمم و رکن مجلس شوریٰ حضرت شیخ الہند کے چہیتے نواسے، جنگ آزادی وطن کے سرفروش مجاہد سادگی، ایثار، حق گوئی و بیباکی کے پیکر غریبوں کے ہمدرد اور ہر چھوٹے بڑے کے کام آنے والے یادگار دیوبند عم مکرم مولانا محمد عثمان صاحب اس جہان فانی میں نہیں رہے۔ دل و دماغ، شعور اور روح یقین کرنے کو تیار نہیں۔ دماغ سُن ہے، دل ڈوبا ہوا ہے، ذہن منتشر ہے، روح بے چین ہے، زندگی تنگ و تاریک گھٹی ہوئی اور نبض حیات ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ مولانا محمد عثمان صاحب کے بغیر دیوبند کا تصور روح فرسا، کربناک اور درد و سوز سے لبریز ہے۔ مولانا عثمان صاحب کیا تھے اور کیا نہیں تھے اس کی تفصیلات تو کسی دوسرے وقت اور موقع پر بیان ہوں گی اس وقت تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک دور کی یادگار تھے۔ ایک تاریخ ساز عہد ان پر ختم ہو گیا اور ایک جیتا جاگتا نمونہ اور منہ بولتی تصویر حضرت شیخ الہند اور ملکی تحریکات کی۔ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اب غریبوں کے لئے بڑے سے بڑے "سورما" سے لڑتے جھگڑنے اور آنکھ میں آنکھ ڈال کر سچ بات کہنے والا کہاں سے آئے گا؟ ع "شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا تیرے بعد"

حبِ رسولؐ سے سرشار قلب کے مالک تھے نہایت عبادت گزار اور معمولات کے پابند تھے اسی کے ساتھ شب و روز سیاست اوڑھنا بچھونا تھی مگر صاف گوئی ان کا طرۂ امتیاز رہی اور حق گوئی مقصدِ حیات۔

حضرت مفتی صاحبؒ سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور حضرت مفتی صاحبؒ بھی ان کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ "بھائی عثمان! میں نے آپ کو

حضرت شیخ الہند کے کندھوں پر بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ کوئی معمولی شرف نہیں ہے۔ دہلی آتے تو حضرت مفتی صاحبؒ سے ملاقات کئے بغیر کبھی نہ جاتے تھے اور مفتی صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد بھی ہمیشہ دفتر برہان میں تشریف لاتے برادر عزیز عمید الرحمن سلمہٗ کا حوصلہ بڑھاتے، مفید مشورہ دیتے اور حضرت مفتی صاحبؒ کی قیمتی یادگار ندوۃ المصنفین دہلی، برہان اور مکتبہ برہان کے قائم رہنے اور پروان چڑھنے کی خواہش اور دعا فرماتے۔ ہم لوگوں کے لئے ان کی ذات ایک زبردست سہارا تھی جس سے ہمت و عزم کی روشنی دل و دماغ میں محسوس ہوتی تھی۔ افسوس صد افسوس کہ۔ ع :۔ "وہ مرد درویش جسکو حق نے دیئے تھے انداز خسروانہ" ہمیں روتا بلکتا تڑپتا اور سسکتا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا جس کی ذات غریبوں کا سہارا تھی، مظلوموں کا ملجا و ماویٰ تھی، اور دیوبند کی آبرو تھی، وقار تھی، عظمت تھی۔ آہ! اے سرزمین دیوبند! آج تیرے سر کا وہ تاج موت کے بے رحم ہاتھوں نے تجھ سے چھین لیا جس میں سچائی کے، صداقت کے، حق گوئی و بیباکی اور دیانت و امانت کے بڑے قیمتی موتی لگے ہوئے تھے۔ افسوس دیوبند کی "تعمیر نو" کرنے والا آج رخصت ہو گیا۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

(اطہر صدیقی)

بُرہان

ایڈیٹر
سعید احمد اکبرآبادی

معاون ایڈیٹر
عمید الرحمٰن عثمانی

سالانہ چندہ
چالیس ۴۰ روپے

قیمت فی پرچہ
تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۵	ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ مطابق جون ۱۹۸۵ء	شمارہ ۶

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر، پبلشر نے اعلیٰ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

جمیل مہدی

اس سے زیادہ دلدوز خبر، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے وصال کے بعد ندوۃ المصنفین ماہنامہ برہان کے لئے کوئی دوسری نہیں کہ ۲۴ رمئی کو مولانا سعید اکبرآبادی کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۰

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی رحلت، علمی، ادبی، اور دینی، اور صحافتی دنیا کا ایک ایسا نقصان ہے، جس کی تلافی کی کوئی صورت بظاہر موجود نہیں ہے۔ وہ ان نادر شخصیتوں میں سے جن کے اندر قدیم اور جدید علوم جمع ہو جاتے ہیں، اور وہ زمانہ کو اپنی خداداد ذہانت اور طبائع کی روشنی سے منوّر کرنے کا ایسا عظیم الشان کام انجام دیتے ہیں، جو قدیم علوم کے ماہرین اور جدید علوم کے علمبرداروں سے الگ الگ صورت میں ممکن نہیں۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایک طرف علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ذریعہ اور واسطے سے، اس سلسلۃ الذہب سے منسلک نظر آتے ہیں، جو اسرار علوم نبوت کے محرموں اور فقہ وحدیث کے بالغ نظر، عالموں، اسلامی شرع اور دینی کمالات کے حامل شخصیتوں کا ایک ایسا

قائد رہے، جس نے دینی علوم کو تحقیقی صلاحیتوں کے قالب میں ڈھال کر ہر زمانہ اور ہر عہد کے مطابق بنانے اور اس کی رہنمایانہ استعداد قائم رکھنے میں ناقابلِ فراموش حصہ لیا۔ دوسری طرف سے وہ جدید علوم سے پوری طرح واقف، اور دنیا میں سائنسی اور صنعتی اور معاشی انقلابات کے اثرات و نتائج سے مکمل طور پر باخبر اور نئے زمانے کے تقاضوں کا پورا شعور رکھنے والے ایک دانشور تھے، جو قدیم علوم کی آب و تاب، مذہبی روایات کے تقدس کی برقراری اور اصول و احکام و دین کی پاسداری بلکہ نگہبانی کا فرض آدھی صدی سے بھی زیادہ مدت تک انجام دیتے رہے۔ وہ ایک طرف مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (تعالی اللہ عمرہا) مولانا احمد علی لاہوریؒ، اور مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، جیسے نابغۃ العصر اور فقیہہ المثال ماہرین علوم شریعت اور رہنمایانِ دین و ملت کی بزم کے ممتاز رفیق، اور مولانا آزادؒ، مولانا مدنیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ جیسے عبقریوں کے ہمجلیس اور خوشہ چین تھے۔ دوسری طرف ان کا تعلق ان تمام مشاہیر، مستشرقین اور جدید علوم کے ممتاز ماہرین سے جنہوں نے بیسویں صدی میں اپنی ذہانت اور قدیم علوم کی جدید توجیہات اور تطابق کی شمعیں جلائیں۔ اور ایک دنیا کو ان کی روشنی سے اپنے ذوق کی تسکین اور عقائد کے استقرار و استحکام میں مدد پہنچائی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے فیضانِ علمی اور اثرات شخصی کا سلسلہ ہندوستان تک محدود نہیں تھا، بلکہ ان کی عظیم شخصیت کی کرنیں، قومی، سیاسی اور ملکی حدود کو توڑ کر مہذب دنیا کے سبھی علمی اور مذہبی حلقوں تک پھیل گئی تھیں۔ وہ ہندوستان کے علاوہ پاکستان، انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، فرانس، کینیڈا، اور ملیشیا، انڈونیشیا کے علمی اور تحقیقی حلقوں میں بھی ایک جانی پہچانی شخصیت سمجھے جاتے تھے، اور ان کا

تمام عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ وہ ایک برگزیدہ محقق اور دینی علوم کے ماہر دانشور کی حیثیت سے دنیا کے اکثر ملکوں کا دورہ کر چکے تھے۔ اور ان ملکوں کے دینی، مذہبی، علمی اور تحقیقی حلقوں میں اپنی ذکاوت، ذہانت، تبحر علمی اور تحقیقی صلاحیت کی دھاک جما چکے تھے۔ وہ ہندوستان کی ایسی علمی شخصیتوں میں ایک ممتاز دینی شخصیت تھے جو دنیا بھر میں معروف اور جانی پہچانی شخصیتیں سمجھی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے اہم دینی، علمی اور تہذیبی اداروں سے ان کا تعلق رہا۔ وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ، دارالعلوم دیوبند اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی سربراہی سے لیکر دارالعلوم دیوبند کی مجلس منتظمہ تک کی رکنیت تک وہ ایک باعزت مقام اور قابل احترام حیثیت کے مالک رہے، دہلی کے مشہور اسٹیفن کالج کے بھی وہ پروفیسر رہے۔ جہاں پاکستان کے موجودہ صدر جنرل ضیاء الحق سمیت طالب علموں اور متعلموں کی ایک کثیر تعداد نے ان کی علمی شخصیت سے فیضان حاصل کیا۔ اور اپنے ذہنوں کو ان کے چشمۂ علوم و ذہانت سے سیراب کیا۔

یوروپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں نے انکے علمی اور دینی کمالات کے اعتراف سے انہیں وزیٹنگ پروفیسر کے اعزاز سے نوازا، اور انہوں نے دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں کے علوم شرقیہ کے حلقوں کو اپنے خیالات اور علمی موشگافیوں سے متأثر کیا۔ وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں ہونے والے بیشمار علمی مباحثوں، سمیناروں اور علمی و دینی کانفرنسوں میں شریک ہوئے اور مستقل رکن کی حیثیت سے متعدد عالمی انجمنوں اور اداروں میں شریک کئے گئے۔

دارالعلوم دیوبند، ان کی مادرِ علمی، ندوۃ المصنفین، ان کا آشیانہ، ماہنامہ برہان، ان کے ذہن کا ترجمان اور ساری دنیا ان کی پرواز کی زد میں رہی۔

ندوۃ المصنفین اور ماہنامہ برہان، ان کے اصل مرکز علمی کی حیثیت سے آخر تک ان کے ساتھ رہے، انہوں نے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے علمی کاموں کے شریک، تصنیفی اور تحقیقی کاموں کے سہیم اور ان کے ذہن و فکر کے امین کی حیثیت سے اپنے علمی وقار اور ندوۃ المصنفین کی شہرت کو چار چاند لگانے میں ناقابلِ فراموش حصہ لیا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ندوۃ المصنفین کے رفیق، اور ماہنامہ برہان کے مدیر ہی نہیں تھے، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے دست راست، بلکہ ایک بھائی کی حیثیت سے ان کی زندگی تک ایسے اعلیٰ مقام پر فائز رہے جن پر مفتی صاحب کی تمام شفقتیں، برادرانہ تعلق، اور جذباتی محبتیں نچھاور رہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ندوۃ المصنفین کے قیام اور اور اس ادارہ کو ہندوستان کا سب سے بڑا علمی، تحقیقی، اور تصنیفی مرکز کی شکل میں تبدیل کرنے کے منصوبے میں لاریب — مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے سوا کوئی شریک نہ تھا، لیکن اس حقیقت میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ندوۃ المصنفین کو ایک ممتاز اور باوقار علمی اور دینی ادارہ کی آب و تاب اور عز و احتشام دینے میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کا حصہ سب سے زیادہ رہا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی رفاقت اور دست گیری کا یقین نہ ہوتا تو اس عظیم الشان اقبال اور منصوبہ کی عملی جامہ پہنانے کی ہمت ہی وہ بمشکل کر سکتے تھے۔ جہاں تک مفتی صاحب کی عزیمت اور استقلال کا سوال ہے، اس کا ثبوت ۱۹۴۷ء کے ان فرقہ وارانہ فسادات کے زمانہ میں غیر مشکوک انداز میں سامنے آیا۔ جب کہ ان فسادات کی آگ کی لپٹیں دہلی کی قدیم تہذیب اور سماجی نظام کے ساتھ ندوۃ المصنفین تک کی چار دیواری تک بھی پہنچیں۔ اور وہ اس بری طرح ان کی زد میں آیا کہ لاکھوں روپیہ کی کتابیں جل کر خاک ہو گئیں، اور بربادی اس

توقف ناک حد تک پہنچی کہ تن کے کپڑوں کے سوا، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے پاس اثاثہ کے نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ اور وہ ندوۃ المصنفین کی قرول باغ کی جلی ہوئی تاراج عمارت سے معجزانہ طور پر محفوظ اور صحیح وسالم پرانی دہلی پہونچ گئے۔ یہ وقت جو دہلی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں بھی مجسم طور پر سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا تھا، ندوۃ المصنفین کی زندگی اور موت کے بارے میں بھی فیصلہ کن وقت تھا اور یہ وہ وقت تھا کہ ایک مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے علاوہ، ندوۃ المصنفین کے احیاء جدید اور جلے ہوئے تنکوں سے آشیانہ کی تعمیر نو کی ہمت کسی کے اندر باقی نہ رہی تھی۔ اور ہم اس کے چشم دید گواہ ہیں کہ جب مفتی صاحبؒ نے دوبارہ ندوۃ المصنفین کے شیرازہ کو جمع کرنے کی تجویز رکھی تو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے ساتھ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ بھی حیرت زدہ دکھائی دینے لگے۔ لیکن مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے عزم، حوصلہ اور استقامت نے دوبارہ اس ناممکن کام کو ممکن کر دکھایا۔ جسے اس وقت بلا استثناء سبھی لوگ ناممکن سمجھ رہے تھے اور اس بارے میں کامیابی سے مایوس تھے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے ساتھ تعلق کی داستان بلا مبالغہ آدھی صدی سے بھی زیادہ مدت کا احاطہ کرتی ہے، اور کلکتہ سے دہلی تک کی غیر منقطع ہم نشینی کی مدت تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس تعلق کی خود نوشت کہانی مولانا اکبر آبادیؒ نے برہان میں مفتی صاحبؒ کی وفات کے بعد شروع کی تھی، جو افسوس ہے کہ خود انکی وفات سے ناممکن رہ گئی۔ تاہم ہم جیسے مشاہدوں کی نظر سے بھی وہ والہانہ تعلق، جذباتی وابستگی اور ذہنی ہم رنگی پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ جو مفتی صاحب کو مولانا اکبر آبادیؒ کے ساتھ تھی، وہ بلا مبالغہ مولانا اکبر آبادیؒ کو اپنا عزیز بھائی، اپنا دست وبازو، اور اپنے خاندان کا ایک فرد، ہر معنوں میں سمجھتے تھے۔ آخر عمر میں، دارالعلوم کے مسئلہ پر، دونوں

کے درمیان نظریاتی ہم آہنگی میں کچھ فرق ضرور آگیا تھا لیکن کچھ تو مفتی صاحب رح کے صاحب فراش ہوکر، سرگرم اور عملی سرگرمیوں سے الگ تھلگ ہوجانے اور کچھ محبوبیت اور رفاقت کے اس مضبوط رشتے کی وجہ سے، جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ جذباتی تعلق میں ذرا بھی فرق نہیں آیا اور دل سوزی اور دل ربائی کی کیفیت آخر تک باقی رہی۔

مفتی صاحب کی رحلت کے بعد، مولانا سعید اکبر آبادی رح کی صحت میں بھی فرق آگیا تھا، اور قوائے جسمانی میں انحطاط کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔ عوارض اور کمزوری نے ان پر اس درجہ قابو پالیا تھا کہ وہ مفتی صاحب رح کی شخصیت پر اپنا وہ تعزیتی مضمون بھی مکمل نہ کرسکے، جس کا سلسلہ انہوں نے برہان میں شروع کیا تھا۔ آخر عمر میں انہیں اپنے جوان لڑکے کی موت کا صدمہ دیکھنا پڑا، جو ان کے لئے عملی طور پر ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ اور ان کے مرض کی شدت بڑھتی چلی گئی۔ چند مہینے پہلے وہ بغرض علاج اپنے اہل خاندان کے پاس کراچی چلے گئے۔ جہاں کینسر کے موذی مرض کی تشخیص ہوئی۔ اور اسی مرض میں ۲۴ رمئی کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔ ان کے ساتھ رحم معاملہ کرے اور انہیں اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے۔ آمین

ندوۃ المصنفین کے سلسلے میں ہم نے ۱۹۴۷ء کے حالات کا تذکرہ اس مقصد کے تحت کیا ہے۔ کہ جس طرح مفتی صاحب رح کی زندگی میں، دہلی میں پھٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات، اور تقسیم ملک کے بعد کے حالات نے ندوۃ المصنفین کی زندگی اور موت کا سوال پیدا کردیا تھا، وہی صورت اس ادارے کو مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح کی وفات اور اب مولانا سعید احمد اکبر آبادی رح کے بعد ندوۃ المصنفین کے مستقبل کو درپیش ہے۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح نے اپنی حیات میں بے شمار مرتبہ ندوۃ المصنفین

کے مستقبل کے بارے میں تشویش ظاہر کی، اور ہر بار انہوں نے اس نکتہ پر گفتگو کو ختم کر دیا کہ

"ندوۃ المصنفین جیسے ادارے بار بار نہیں بنتے، ایک بار یہ ادارہ برباد ہو گیا تو دوبارہ ویسا ادارہ قائم ہونے کی کوئی امید نہیں۔"

اس سلسلے میں اطمینان کی ایک بات یہ ہے کہ عزیزی عمید الرحمٰن عثمانی نے مفتی صاحب کی زندگی میں ہی ندوۃ المصنفین کا اہتمام اور انتظام سنبھال لیا تھا اور اس فرض کو ایسی قابلیت اور ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا کہ مفتی صاحبؒ کی زندگی کے آخری لمحات ندوۃ المصنفین کے سلسلے میں یک گونہ بے فکری کے ساتھ گذرے اور اس عرصے میں ندوۃ المصنفین کے کاموں میں نہ صرف کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ عمید الرحمٰن عثمانی کے حسنِ انتظام کے بہتر آثار بھی نمایاں طور پر سامنے آئے۔ بہت سی کتابیں نئی صوری خوبیوں کے ساتھ منصۂ شہود پر آئیں۔ اور اس کے تجارتی دائرے میں بھی وسعت پیدا ہوئی سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ عمید الرحمٰن نے معاملات اور حالات پر مکمل قابو پانے کی ایسی صلاحیت کا مظاہرہ کیا جو خوش آئند بھی تھا اور امید افزا بھی۔ اس صورت حالی میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ندوۃ المصنفین انکے انتظام اور ان ہی کی نگرانی میں بدستور چلتا رہے۔ اور کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو جو چلتے چلاتے ادارے میں برہمی اور ابتری پیدا کرنے کا باعث بن سکے۔

ہمیں امید ہے کہ ندوۃ المصنفین کے بہی خواہ　　　اور متعلقین اس ادارے کے تحفظ کی ذمہ داری محسوس کریں گے اور مفتی صاحبؒ کے اہل خاندان بھی مفتی صاحبؒ کی اس حقیقی یادگار، اور ہندوستان کے ممتاز علمی اور اشاعتی ادارے کو قائم رکھنے اور ترقی دینے میں پورے جذبہ خلوص اور سنجیدگی کیساتھ عزیزی عمید الرحمٰن کا ہاتھ بٹائینگے جس کیلئے مفتی صاحب کے الفاظ سے بہتر کوئی الفاظ نہیں ملتے کہ ندوۃ المصنفین جیسے ادارے بار بار نہیں بنتے۔" اسلئے سب کی کوشش بجا ہونی چاہیئے کہ یہ ادارہ قائم رہے۔

علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی فقہ حنفی کی تائید

اسباب اور ثمرات

از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبۂ عربی امر سنگھ کالج سری نگر کشمیر

(۳)

ہم یہاں ایک مثال پیش کرتے ہیں :-

تاریخ کی تمسیخ وتحریف

نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم عدم تقلید کے داعیوں میں اپنے علم وفضل اور اعتدالِ فکر وقلم میں بڑے مشہور عالم گزرے ہیں اپنی تصنیف التاج المکلل میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے اس قول کو ـــــ کہ سالک راہِ حقیقت کے سامنے ہر وقت قرآن وسنت ہوتا ہے اور وہ اوامر ونواہی ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لئے ہر وقت قرآن وسنت ہی کو معیار بناتا ـــ عجیب چکر دے کر درجِ ذیل نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ بار بار پڑھنے کے قابل ہے :-

ان اتباع الکتاب والسنۃ ھوا المعیار لمعرفۃ الرجال۔ فان الرجال تعرف بالحق لا الحق بالرجال وھذا خصیصۃ

بے شک رجال کی معرفت کا معیار قرآن و سنت کی پیروی ہے۔ کیونکہ لوگوں سے حق پہچانا نہیں جاتا بلکہ حق سے ہی لوگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ وہ نیک خصوصیت

شریفۃ خص اللہ بہا اھل الحدیث واھل السلوک ولم یشارکھم فیھا احد من الفقہاء المقلدین۔ وانک لا تجد عالما صوفیا ولا سالکا فاضلا الا وھو یتقید بالکتاب والسنۃ ولا یقلد احدا من الائمۃ [1]

ہے جس کو اللہ نے اہلِ حدیث اور صوفیاء سے خاص کیا ہے۔ اس خصوصیت میں فقہائے مقلدین میں کوئی بھی شخص ان کا شریک نہیں ہے تم دیکھو گے کہ جو بھی کوئی صوفی عالم اور سالک فاضل ہے وہ قرآن وسنت کا پابند ہوگا اور ائمۂ مقلدین میں سے کسی بھی امام کا مقلد نہیں ہوگا۔

پھر اس تحقیق کا آخری خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

ومن ھنا قیل: ان الصوفی لا مذھب لہ [2]

اسی معنی میں کہا جاتا ہے کہ صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔

نواب صاحب مرحوم تاریخ وتراجم کے وسیع النظر عالم تھے اس لئے یہ تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ انہوں نے صوفیائے اسلام کے حالاتِ زندگی کا سرسری مطالعہ بھی نہیں کیا ہوگا ظاہر ہے کہ یہ سراسر تعصب ہی کا کام ہوتا ہے جو علمائے کرام کا قلم پھسل جاتا ہے اور لغو اور مغالطہ آمیز بات ان سے لکھوا تا ہے۔ تاریخ وتراجم کے مستند علماء لکھتے ہیں کہ امام غزالیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، شیخ نجم الدین کبریٰؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ

---

[1] التاج المکلل: ص ۲۰۔ ۴۰ المطبعۃ الہندیۃ العربیۃ ۱۳۸۳ھ [2] ایضاً: ص ۲۶۰

— آج معلوم ہوا کہ میر تقی میر نے جو شعر کہا تھا "کب کا ترک اسلام کیا" تھا، اصل میں اپنے اہلِ حدیث ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ، محمد بن عبدالوہاب اور حضرت شاہ اسماعیل شہید تو ... مرحوم نواب صاحب کی یہ تحقیق عالم وجود میں آنے سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

حضرت جنید بغدادی، میر سید علی ہمدانی، شیخ فریدالدین عطار رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر صوفیا، اور سالکین راہِ طریقت سب کے سب ائمۂ اربعہ میں سے کسی نہ کسی امام کے مقلد تھے۔ صوفیائے کرام کے سرخیل حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مقبولِ عام تصنیف: غنیۃ الطالبین میں جگہ جگہ اپنے مقلد ہونے کی طرف نہ صرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ مثلاً تراویح باجماعت کے باب میں لکھتے ہیں: قال امامنا احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ، ایام تشریق کے تکبیرات کے بارے میں اپنا مسلک "وھومذھب امامنا احمد بن حنبل" اور احناف کا "وھومذھب الامام الاعظم ابی حنیفۃ رضی اللہ عنہ" کہہ کر بیان کرتے ہیں۔ بلکہ اسی مقام پر صاف الفاظ میں لکھتے ہیں:

واھل السنۃ اجمعوا علی لسمع والطاعۃ لائمۃ المسلمین و اتباعھم۔	ائمۂ مسلمین کی دل و جان سے پیروی کرنے پر اہلِ سنت متفق ہیں

خود حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ جن کے قول پر نواب صاحب مرحوم نے اپنی نادر "تحقیق" پیش کی ہے، الفتوحات المکیۃ میں لکھتے ہیں:

اجمعنا علی تقریر حکم المجتہد وعلی التقلید العامی لہٗ فی ذلک الحکم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لانہٗ دلیل شرعی" (جلد اول)

ہمیں افسوس ہے کہ اس معاندانہ فکر اور متعصبانہ طرزِ تحریر نے نواب صدیق حسن خاں کی عظیم و وقیع کتابوں میں غیر معمولی نقائص کو جنم دیا ہے سو جس شاخ پر قرار حاصل کرنا چاہتے ہیں اسی کو غیر شعوری طور پر کاٹتے بھی ہیں اور بڑی بے پرواہی سے ایک ساتھ دو کشتیوں میں اترتے نظر آتے ہیں۔ ہم اس نوع کی بھی ایک مثال پیش کرتے ہیں:

نواب صاحب مرحوم و مغفور کو اعتراف ہے کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی عقائد اور احکام میں پختہ حنفی تھے بلکہ اپنی قوم "کے پاداش وہ حضرت محدث دہلویؒ کو علم حدیث

ہیں لیے بہرہ قرار دیتے ہوئے نہایت دلیری کے ساتھ اُن کی حدیث دانی اور ہندوستان میں اشاعت حدیث میں عظیم الشان خدمت کی اہمیت گھٹاتے ہیں۔ نواب صاحب فرماتے ہیں:

لم یکن یعرف علم الحدیث علی وجھہ بل علی جھة الاجازة و الاستجازة[1]

وہ علم حدیث کو علم کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے بلکہ اُن کی حدیث دانی اجازت لینے اور اجازت دینے تک محدود تھی۔

بہرحال نواب صاحب کو اعتراف ہے کہ حضرت شیخ دہلویؒ مقلد تھے۔ نواب صاحب کی مذکور الصدر تحقیق کے مطابق محدث دہلویؒ کو روحانی علو اور مدارج سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اپنی دوسری تصنیف میں نواب صاحب حضرت محدثِ دہلویؒ ہی کے بارے میں لکھتے ہیں:

بندۂ عاجز در دہلی بہ تربت شریف او رسیدہ نمی تواند گفتن کہ کدام روح و ریحانِ برکاتش مشاہدہ نمودہ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً[1]

جب میں دہلی میں حضرت شیخ رح کی قبر پر پہنچا، نہیں کہہ سکتا کہ ان کے فیض و برکات کی خوشبو کیسے مشاہدہ کی۔

یہ تقلید کی برکت کہیے یا حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کی کرامت کہ نواب صاحب ائمہ فقہا اور اُن کے پیرو کاروں پر ڈالی ہوئی گرد خود ہی جھاڑ دی۔[2]

---

[1] تقصار جیود الاحرار: ص ۱۱۲ و اتحاف النبلاء: ص ۳۱۴ [2] ائمہ و اکابر سے بغض و نفرت رکھنے میں بعض حضرات اتنے دلیر واقع ہوئے تھے کہ آج بھی اضطراب لاحق ہوتا ہے اسی التاج المکلل میں نواب صاحب مرحوم نے امام شعرانی کا تذکرہ بڑی عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ مگر کتاب کے حاشیہ نگار نے نواب صاحب کے بیان کو جھوٹ قرار دے کر امام شعرانی کو دجال و مکار ثابت کرنے کی لاحاصل سعی کی ہے۔

ان حالات میں ضروری تھا کہ مسلمانوں کو اس خانہ جنگی سے نجات دلانے کے لئے فقہ حنفی کا خالص علمی اور تحقیقی مطالعہ کیا جائے اور اس کے بارے میں دانستہ یا نادانستہ جو بدظنی اور نفرت پھیلائی جا رہی تھی اس کا ہمیشہ کے لئے ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس سے نہ صرف یہ کہ فقہ حنفی کی علمی خدمت ہو سکے بلکہ مسلمانوں میں اسلاف عظام کا تقدس، جس میں خطرناک زلزلہ آچکا تھا بحال ہو جائے اور ان کا قیمتی علمی و فکری اثاثہ تحقیر و توہین کی خاک میں مل جانے سے محفوظ رہ سکے، نیز اس کی برکت سے تقلید ایک مبغوض چیز کے بجائے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مفید و بامقصد ثابت ہو سکے جسے شاعر "ربطِ ملت" کا ہم معنی قرار دیتا ہے ع

معنیٔ تقلید ربطِ ملت است

یہ کام علمی اور اخلاقی اعتبار سے علمائے احناف ہی کے ذمہ نہیں تھا بلکہ کسی بھی تحقیق پسند کے ائمہ کا میں آسکتا تھا جیسا کہ اس سے قبل متقدمین میں سے کئی بزرگوں نے ایک خاص فقہی اسکول سے وابستہ ہونے کے باوجود اس فرض کو کسی نہ کسی پہلو سے انجام دیا تھا۔

علامہ انور شاہ کشمیری کا امتیاز

اس میں شک نہیں ہے کہ[لہ] جب ہندوستان میں تقلید کے مخالفین اپنے افکار و خیالات پھیلانے میں سرگرم ہوئے تو اس نے بہت سے علماء کو جھنجھوڑا۔ بعض حضرات نے ہزار ہا ہزار فقہ حنفی کے مسائل کی وسیع پیمانے پر تشہیر و اشاعت کی جس سے اردو زبان کا مذہبی لٹریچر بھی مالا مال ہوا۔ کئی سرکردہ علماء نے فقہ اور اصول فقہ کی کتابیں اس وقت کے مزاج کے مطابق ایڈٹ کیں اور ان پر قیمتی شروح و حواشی لکھے۔ ان میں حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی رح کی شخصیت خاص طور پر

لہ اس میں شک نہیں ہے کہ اپنے مسلک کی حمایت میں بعض حنفی اہل قلم بھی بہت پست سطح پر اتر آتے تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر ہی حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم دیوبندی مسلک و مشرب سے وابستہ ہونے کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہوئے تھے ع لٹھ کر امام ابو حنیفہ رح دوڑے

قابلِ ذکر ہے۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی تو وہ فقہ حنفی کی کہیں زیادہ وسیع وجلیل خدمت انجام دیتے۔ اسی طرح مختلف اداروں کے ذمہ دار مدرسین اپنے درسوں میں اس ذمہ داری سے غفلت نہیں برتتے تھے بلکہ مذہبِ حنفی کی حمایت میں پورا پورا اہتمام کرتے تھے[۱]

اِن سارے حقائق و واقعات کے باوجود حنفی مذہب کی علمی خدمت انجام دینے کے لئے چند ایسے محققین کی ضرورت تھی جنہیں نہ صرف فقہ حنفی کے اسفار و ذخائر پر ہی وسیع و عمیق نظر ہو

---

[۱] مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رح اپنے استاد اور ندوۃ العلماء کے سابق ممتاز شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اپنے مشاہدات میں لکھتے ہیں "مولانا رح کی محبت امام ابو حنیفہ رح کے ساتھ عشق اور عقیدت مذہبِ حنفی سے عقیدت کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ امام صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے کبھی کبھی اُن پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ اس محبت و عقیدت میں ان کی زبان سے کبھی کبھی امام صاحب اور ان کے ناقدین کے حق میں بعض تنقیدی الفاظ نکل جاتے تھے جن میں شکوہ و احتجاج کا رنگ صاف جھلکتا تھا۔ انہی میں امام بخاری بھی تھے جنہوں نے قال بعض النّاس کے پردہ میں امام صاحب پر بہت سے علمی اعتراضات فرمائے امام بخاری رح کی منفرد اور یگانہ روزگار کتاب الجامع الصحیح (جس کو امت نے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا لقب دیا ہے) کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس کی روایات بحث و تنقید اور اس کے رواۃ جرح و تعدیل سے بالاتر نہیں۔ ۔ ۔ ۔"

پرانے چراغ ج ا ص ۱۹۳ - ۱۹۴ مکتبہ فردوس لکھنو اسی طرح مولانا تقی الدین ندوی اپنے استاد اور مظاہر العلوم کے سابق شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رح کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"مذاہب ائمہ کی تحقیق اور ان کے دلائل خصوصاً مسلکِ حنفی کے دلائل کو تفصیل سے بیان فرماتے۔ اگر کوئی روایت بظاہر حنفیہ کے مسلک کے خلاف نظر آتی تو اس کی توجیہات اس طرح نقل فرماتے کہ مسلکِ حنفیہ حدیث سے اقرب نظر آنے لگتا۔"

"الفرقان" شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نمبر: ص ۲۳۸

بلکہ مسلمانوں کے پورے فقہی لٹریچر پر گہری نظر ہو جنہیں امام ابو حنیفہؒ کے فقہی اسکول پر معترضین کے اعتراضات، ان کے اسباب و علل، روح شریعت سے شناسائی، فکر و بصیرت کی اہمیت و مہارت، فقہاء کے طبقات، رجالی تحقیق، روایت و درایت کے اصول و قواعد میں ماہر کامل ہوں تاکہ احادیث و آثار میں جہاں تعارض و تخالف نظر آتا ہے وہاں تطبیق و توفیق کی صورت متعین کرنے میں کامیابی ہو، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان بزرگوں میں کسی قسم اور کسی درجہ کا بھی مسلکی تعصب نہ ہو اور دل ایمان و یقین کی دولت سے آباد و شاداب ہوں۔ ان اوصاف و کمالات سے متصف علماء میں دو عالم نمایاں طور پر مشہور ہوئے۔ ان میں ایک عرب کے علامہ محمد زاہد الکوثری اور دوسرے عجم کے علامہ محمد انور شاہ الکشمیری ہیں۔ علامہ کوثری تاریخ و رجال کے زبردست محقق اور مصنف تھے اور انھوں نے اس فن میں حنفی مذہب کی تائید و نصرت میں کئی چھوٹی بڑی محققانہ کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ انور شاہ صاحب نے اپنی تیس سالہ تدریسی زندگی میں حنفی مذہب کی مدافعت و حمایت سے معمولی لاپروائی بھی نہیں برتی۔ چونکہ وہ چند فطری صلاحیتوں سے غیر معمولی طور پر بہرہ مند تھے اس لئے اپنے مدعا میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ خود ایک بار فرمایا (بالفاظ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی)۔

"ہم نے اپنی پوری زندگی کے تیس سال اس مقصد کے لئے صرف کئے کہ فقہ حنفی کے موافق حدیث ہونے کے بارے میں اطمینان حاصل کیا جائے سو الحمد للہ اپنی اس تیس سالہ محنت اور تحقیق کے بعد مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی حدیث کے مخالف نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلے میں مخالفین احناف جس درجہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کم از کم اس درجہ کی حدیث اس مسئلے کے متعلق حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہے جس کے لئے وہ اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث

نہیں ہے۔" [1]

درس کے دوران علامہ کشمیری کس طرح مذہب حنفی کی صحت وارجحیت ثابت کرتے تھے؟ یہ موضوع تفصیل کا محتاج ہے اور اسے اُن کے ضخیم درسی تقاریر (امالی) کی روشنی میں اچھی طرح مرتب کیا جاسکتا ہے۔ زیر نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا ہے ہم یہاں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فاضلانہ مضمون کا ایک طویل اقتباس درج کرتے ہیں جو یہاں زیر بحث موضوع کی اطمینان بخش وضاحت کرنے کے اہل ہے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"آگے درس حدیث میں رنگِ تحدیث غالب تھا، فقہ حنفی کی خدمت اور تائید و ترجیح بلاشبہ ان کی زندگی تھی لیکن رنگ محدثانہ تھا، فقہی مسائل میں کافی سیر حاصل بحث فرماتے لیکن اندازِ بیان سے یہ کبھی مفہوم نہ ہوتا تھا کہ آپ حدیث کو فقہی مسائل کے تابع کر رہے ہیں اور کھینچ تان کر حدیث کو فقہ حنفی کی تائید میں لانا چاہتے ہیں، بھلا اس کا قصد وارادہ تو کیا ہوتا؟ بلکہ واضح یہ ہوتا تھا کہ آپ فقہ کو بحکم حدیث قبول کر رہے ہیں۔ حدیث، فقہ کی طرف نہیں لی جارہی ہے بلکہ فقہ کو حدیث کی طرف لایا جارہا ہے، وہ آرہا ہے اور کلیتہً حدیث کے موافق پڑتا جارہا ہے۔ بالفاظ دیگر گویا حدیث کا سارا ذخیرہ فقہ حنفی کو اپنے اندر سے نکال نکال کر پیش کر رہا ہے اور اسے پیدا کرنے کے لئے نمودار ہوا ہے۔"

مولانا طیب صاحب نے اس کے بعد علامہ انور شاہؒ کی اس تقریر کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے علامہ رشید رضا مصری کی دیوبند میں آمد پر ـــــ عربی میں برجستہ کی تھی اور جس میں انھوں

---

[1] حیاتِ انور ص ۲۳۵

نے مدرسۂ دیوبند کے اِس اہم علمی فریضہ ــــــ مذہبِ حنفی کا تحقیقی دفاع ــــــ کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ آگے تحریر فرماتے ہیں :۔

"بہر حال درسِ حدیث میں آپ کے یہاں محدثانہ رنگ غالب تھا اور حدیث کو فقہ حنفی کے مؤید کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے منشا کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا، اور ہاتھ در ہاتھ اس کے دلائل وشواہد سے اِس دعویٰ کو مضبوط بنایا جاتا تھا۔

متونِ حدیث کی معتمد کتابوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر الحدیث بالحدیث کے اصول پر کسی حدیث کے مفہوم کے بارے میں جو دعویٰ کرتے اُسے دوسری احادیث سے مؤید اور مضبوط کرنے کے لئے درس ہی میں کتب کھول کھول کر دکھاتے جاتے تھے اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہو جاتا تھا تو نتیجۃً وہی فقہ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث، فقہِ حنفی کو پیدا کر رہی ہے۔ یہ ہرگز مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ فقہ حنفی کی تائید میں خواہ مخواہ حدیثوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے یعنی گویا اصل تو مذہبِ حنفی ہے محض مؤیدات کے طور پر روایاتِ حدیث سے اسے مضبوط بنانے کے لئے یہ ساری جدوجہد کی جا رہی ہے۔ نہیں، بلکہ یہ کہ، حدیث اصل ہے لیکن جب بھی اس کے مفہوم کو اس کے فحویٰ اور سیاق وسباق نیز دوسری احادیثِ باب کی تائید ومدد سے مشخص کر دیا جائے تو اس میں سے فقہ حنفی نکلتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اِس لئے طلبائے حدیث حضرت ممدوح کے درس سے یہ ذوق لے کر اُٹھتے

لہ حیاتِ انور: ص ۲۴۷

تھے کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے درحقیقت حدیث پر عمل کر رہے ہیں اور حدیث کا جو مفہوم ابو حنیفہ نے سمجھا ہے وہی درحقیقت شارع علیہ السلام کا منشاء ہے جس کو روایت حدیث ادا کر رہی ہے بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ روایت حدیث سے امام ابو حنیفہؒ اپنا کوئی مفہوم پیش نہیں کرتے بلکہ صرف پیغمبر اسلام علیہ السلام کا مفہوم پیش کر رہے ہیں اور خود اس حدیث میں محض ایک جویا اور ناقل کی حیثیت رکھتے ہیں" لے

لے حیات انور ص ۲۲۷

تنقیدِ صحتِ الفاظ

از مولانا حفیظ الرحمان واصف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تمہید

تقریباً نو برس کا عرصہ ہوا، احقر کے ایک دوست سید بدر الحسن صاحب نے اُن الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی تھی جو اُردو میں غلط تلفظ یا غلط املا کے ساتھ رائج ہو گئے ہیں اور ان کی اصلاح کی کوشش کی تھی اپنی کاوش احقر کو انھوں نے برائے مشورہ و نظرِ ثانی دکھائی تھی۔

اُس وقت میں نے اُن سے عرض کر دیا تھا کہ بعض الفاظ غلط ہی سہی مگر غلط العام ہونے کی جہت سے فصیح ہیں۔ ان کی اصلاح مشکل اور غیر ضروری ہے تاہم چونکہ ان کا مقصد اظہارِ حقیقت تھا ان کے مسودہ پر نظرِ ثانی کی اور جہاں اُن سے سہو ہوا تھا اُن کو آگاہ کیا۔

اُن کی کتاب کا پہلا ایڈیشن "صحتِ الفاظ" کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ کتاب دیکھ کر معلوم ہوا کہ اس کے مسودہ میں میرے دیکھنے کے بعد کافی اضافہ ہوا ہے اور بہت سے مقامات پر انھوں نے میری رائے کو تسلیم نہیں کیا ہے خیر! کوئی گلہ نہ ہوتا، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ پیش لفظ میں احقر کا بھی حوالہ دیا گیا ہے یعنی اگر اُن سے کوئی سہو ہوا ہے یا انھوں نے کوئی اجتہاد فرمایا ہے تو اس کی ذمہ داری احقر پر ڈال دی گئی ہے۔

مجھے اس کا کوئی فکر نہ ہوتا لیکن ایک صاحب نے "صحت الفاظ" پر تنقید کرتے ہوئے مجھ پر طنز کیا ہے۔ پس میں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ سید بدر الحسن صاحب کی رائے یا غلطی کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ اور میں ان کے اکثر اجتہادات سے متفق نہیں ہوں۔

زیر تنقید کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۸ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کی ضخامت پہلے ایڈیشن سے زیادہ ہے۔ اس کے پیش لفظ میں بھی احقر کا نام موجود ہے۔ اس وقت یہی طبع دوم میرے سامنے ہے۔ اس میں جہاں مجھے اُن کی رائے سے اختلاف ہے اُردو کا ایک ادنیٰ خادم ہونے کی حیثیت سے اس کی نشاندہی بغرض معذرت ضروری سمجھتا ہوں۔

زبان کے بارے میں یا جس موضوع پر جو کچھ عرض کرتا ہوں اس کی بنیاد خلوص اور نیک نیتی پر ہے۔ اس کو قدامت پسندی کہا جائے یا تنگ نظری۔ اختیار ہے۔ ہر شخص کو اپنی مادری زبان سے محبت ہوتی ہے۔ مجھے بھی ہے۔ اس کی مظلومیت مجھے صاف گوئی پر آمادہ کرتی ہے۔ چاروں طرف سے اس پر یلغار ہو رہی ہے اور اس کی حمایت وحفاظت کے لیبل لگا کر ہو رہی ہے اور ہمارا یہ حال ہے کہ "تک تکے دیدم دم نہ کشیدم"۔

میرا گلہ شکوہ اہلِ زبان سے ہے۔ ان میں خود اعتمادی نہیں رہی۔ اپنی شیریں لطیف اور مرصع زبان کی قدر و قیمت اور معیارِ فصاحت کو بھول گئے۔ ہر ایک فلاسفر کو ادیب و شاعر اور ہر ایک کرسی نشین کو اُردو کا دیوتا تصور کرنے لگے۔ اَلْحَقُّ مُرٌّ گلہ شکوہ کا انداز ممکن ہے سخت ہو گیا ہو۔ اس میں مجھے معذور تصور فرمائیں۔ اصل مقصد و منشا کو پیشِ نظر رکھیں۔ احقر کی غلطی اور سہو و خطا سے آگاہ کریں اور برہم ہونے کے بجائے دلائل کا جواب دلائل سے دیں۔ وَالْعُذْرُ عِنْدَ كِرَامِ النَّاسِ مَقْبُوْلٌ۔

احقر حفیظ الرحمٰن واصف

اُردو بازار دہلی

بسم اللہ وبعونہٖ

فاضل مصنف نے جو عنوانات قائم کیے ہیں ان پر ترتیب وار نظر ڈال کر نمبر عنوان کا حوالہ دیکر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اگر کوئی لفظ نظر سے رہ گیا ہو تو تقاضائے بشریت سمجھیں۔ جس لفظ کی تحقیق لکھی گئی اگر آگے وہ دوبارہ آیا ہے تو مکرر لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

عنوان نمبر ۱

فاضل مصنف نے پہلا عنوان قائم کیا ہے "غلط بولے جانے والے الفاظ" ردیف وار لمبی فہرست ہے قابل غور الفاظ درج ذیل کرتا ہوں۔

اَبد۔ (بفتحتین) معنی لکھے ہیں، انتہا (آیندہ) یہ معنی غلط ہو گئے۔ اصل معنی ہیں، زمانہ آیندہ لاانتہاہی۔

اَجل۔ (بفتحتین) اصل معنی میعاد مقررہ یا وقت معینہ، موت کے معنی کنایۃً مراد لیے جاتے ہیں۔

اختلاج۔ (بکسر اوّل) کسی عضو (مثلاً آنکھ وغیرہ) کا غیر ارادی اور غیر معمولی حرکت کرنا۔ اُردو محاورے میں صرف دل کی غیر معمولی یا تیز حرکت کے لیے بولا جاتا ہے جو ایک قسم کا مرض ہے۔

اِذکار۔ (بکسر اوّل) یاد دلانا۔ ذکر (بکسر اوّل) کے معنی ہیں اللہ کو یاد کرنا یا تحمید و تسبیح۔ ذکر کی جمع اَذکار۔ (بفتح اوّل) اور اسم فاعل ذاکر۔ اذکار کا اسم فاعل مُذکِّر۔

ارتکاب۔ (بکسر اول) فعل ممنوع یا فعل قبیح کے لئے بولا جاتا ہے۔ اچھے کام کا ارتکاب نہیں ہوتا۔

ازل۔ (بفتحتین) اللہ کی ذاتِ واحد کے سوا ہر چیز کی ابتدا ہے۔ اللہ ازلی ابدی یعنی قدیم ہے۔ زمانہ کو لاانتہا ہی کہنا صرف افہام و تفہیم کے لئے ہے۔ فی الحقیقت زمانہ مخلوق ہے اور ہر شیٔ مخلوق فانی اور حادث ہے محاورہ میں ازل سے آفرینش کا پہلا دن مراد لے لیا جاتا ہے۔

اُستخوان۔ (بضم اوّل) تلفظ میں بھی واؤ شامل ہے۔ معدولہ نہیں ہے۔

اَصراف۔ (بفتح اوّل) صَرف بفتح اوّل کی جمع اَصراف نہ عربی میں ہے نہ اُردو میں عربی میں مَصرف کے معنی ہیں خرچ کرنے کی جگہ۔ اس کی جمع مَصارف ہے۔ یہی جمع اُردو میں صَرف کی جمع کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ صَرف کے معنی ہیں گردش، تغیر، تبدیلی۔ اس کی جمع صُروف (بضم اوّل) اُردو میں رائج نہیں ہے۔

اعتنا۔ (بکسر اوّل) پروا کرنا، قصد و اہتمام، توجہ و اشتغال

اَعراف۔ بفتح اوّل صحیح ہے جنّت و دوزخ کے درمیان کا طبقہ۔ (ادبی بھول بھلیاں میں مفصل بحث ہے)

اِقتباس۔ (بکسر اوّل) اصل معنی تھوڑی سی آگ مانگ لینا۔ مجازی معنی کسی سے علم حاصل کرنا۔ استفادہ کرنا۔ ضرورت کے مطابق دوسرے کا کلام اپنے کلام میں شامل کرنا۔

اِقلیم۔ (بکسر اوّل) اس کے اصل معنی ملک نہیں ہیں منطقہ ہیں۔ ایک منطقے میں کئی ملک ہوتے ہیں۔ یہ جغرافیہ کا اصطلاحی لفظ ہے۔ خطِ استوا سے شمال کی طرف ہر دس درجہ پر خطِ عرض البلد ہے اس کو منطقہ (بکسر اوّل) کہتے ہیں۔ سات شمالی منطقے آباد ہیں۔ یہی ہفت اقلیم اور ربع مسکون ہیں۔ اور دو منطقے منجمد غیر آباد ہیں۔ (خطِ استوا سے جنوب کی طرف آسٹریلیا وغیرہ اُس وقت تک دریافت نہیں ہوا تھا) حکما

کے معنی مجازاً مراد لئے جاتے ہیں۔

الحان۔ (بکسر اوّل) اچھی آواز سے پڑھنا یا گانا۔

مثال۔ (بفتح اوّل) مِثل بکسر اوّل اور مَثل بفتحتین دونوں کی جمع امثال بفتح اوّل آتی ہے۔

یاغ۔ (بفتح اوّل) پیالہ کو بجائے (ہ) کے الف سے پیالا لکھنا غلط ہے۔ یہ فارسی لفظ ہے اس میں اجتہاد درست نہیں۔

غل۔ یہ فارسی لفظ ہے اور بفتحتین ہے۔ اس کے معنی ہیں پہلو، بازو اور پسلیوں کے درمیان کا حصہ۔

فردا کہ واعظ می رسد تفسیر قرآں در بغل
من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل

پہلا مصرع یاد نہیں تھا، کچھ اپنی طرف سے اور کچھ یادداشت پر زور دیکر شعر لکھا ہے۔

(واصف)

اُردو میں بھی بغل بفتحتین بولتے ہیں۔ ذوق کہتے ہیں:۔

تم بیٹھے بغل میں جو رقیبِ دغلی کی
کی گرم بغل ہم نے بھی گور بغلی کی

(متفرقات یا صفحہ ۲۴۲)

عربی میں بَغل، بفتح اوّل و سکون دوم کے معنی ہیں خچر۔ اس کی جمع بغال بالکسر

ردگار۔ اس میں دال موقوف ہے مکسور نہیں۔

رائی۔ ایرانی ڈکشنری (سلیمان حییم) میں۔ تمام مشتقات ذال سے لکھے ہیں ہمیں ایسی کیا ضرورت پیش آگئی ہے کہ (ز) سے لکھیں۔ یہ دلیل کہ ذال فارسی میں نہیں ہے واقعۃً غلط ہے۔

اگر اہلِ ایران ذال کو بدیشی کہہ کر ملک بدر کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیا اہلِ ہند کے نزدیک (ز) بدیشی نہیں ہے؟ پھر بدیرائی میں (ز) کیوں گوارا ہے؟ اسی طرح اور بھی بہت سے حروف بدیشی ہیں۔ مثلاً ٹھاٹھا، جھاجھا، کھٹارا، ٹھٹھنا، چھینٹا، ٹھمنا۔ غرّانا، ودغلانا،

تڑاق پڑاق۔ وغیرہ کیا خ غ ق بدیشی نہیں ہیں؟ جواب دیجیے۔ اگر مدلل جواب نہیں ہے تو اپنی اس بھونڈی تجدد پسندی کو اس غریب اُردو پر نہ لادیئے۔

پوپچ۔ (بضم اول) اس کے اصل معنی ہیں کھوکھلا، بے مغز۔ اُردو میں بواو مجہول بولا جاتا ہے اور یوں ہی فصیح ہے پتا یہ صحیح نہیں ہے۔ مفرد بھی استعمال ہوتا ہے۔

تذرو۔ (بفتحتین) نقطہ والی ذال سے ہے۔ فارسی لفظ ہے۔ عربی نہیں۔ اور اہل لغت لکھتے ہیں کہ دال مہملہ سے لکھنا اور ترجمہ کبک یا چکور کرنا غلط ہے معنی ہیں خروس صحرائی۔

تعارض۔ مخالف ہونا۔ مقابل ہونا۔

تفرقہ۔ ایک دوسرے سے جدا کرنا۔ تفریق اور تفرقہ کے ایک ہی معنی ہیں۔

تنازع۔ آپس میں کھینچا تانی کرنا جھگڑا کرنا۔

ثابت۔ وہ ستارہ جو غیر متحرک ہو۔

ثبوت۔ ثابت ہونا۔ قائم ہونا۔ اور اصطلاحاً وہ چیزیں از قسم دلائل و شواہد جس سے دعویٰ کو ثابت کیا جائے۔

ثقافت۔ (بفتح اول) بالکسر صحیح نہیں

جدول۔ (بفتح اول) پانی کھیت میں پہونچانے والی نالی یا چھوٹی نہر۔ حاشیہ کو جدول نہیں کہتے۔ اصطلاحاً صفحے پر لکیریں جو عبارت کے چاروں طرف کھینچی جاتی ہیں۔

چغل۔ اُردو میں چغل کوئی لفظ نہیں ہے۔ یا تو چغلی ہے یا چغلخور۔ فارسی میں بضمتین ہے یعنی غماز۔ چغلی کے معنی غمازی۔ اُردو میں جس طرح بولا جاتا ہے وہی فصیح ہے چغلخور مخفف ہے چغلی خور کا۔

چوک۔ (بفتح اول) مرکزی مقام جو اکثر چوکور ہوتا ہے۔

چبلہ۔ یہ لفظ فارسی الاصل ہے یہاں مختفی سے صحیح ہے۔ اور مشہور و متعارف املا

بھی ہے۔

حبوب۔ (بضم اوّل) حب بفتح اوّل کی جمع۔ اس کے معنی ہیں دانہ مجازاً گولی (دوا کی ہو یا مٹھائی کی) ایک دانہ کے لئے حَبَّۃٌ اس کی جمع حَبّات۔ (عربی)

حس۔ (بکسر اوّل سین مشدد) قوتِ احساس۔ پانچ حاسّوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ سے معلوم کرنے کی صلاحیت۔

حواس خمسہ یہ ہیں:۔ باصرہ، ذائقہ، شامّہ، سامعہ، لامسہ چھونے کی تخصیص صحیح نہیں۔

حَشَم۔ (بفتحتین) اہل وعیال، نوکر چاکر، رعیت یہ لفظ بکسر اوّل نہیں ہے۔ یہ واحد وجمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں اس کی جمع بھی آتی ہے۔ اَحشام واضح ہو کہ حشم حشمت کی جمع نہیں ہے۔

حشمت: (بفتح اوّل وسکون ثانی۔ ایضاً بفتحتین) بمعنی حَشَم۔

حظ۔ (بفتح اوّل، ظ مشدد) حصہ یا نصیب۔ رزق عظمت۔ اس کے معنی لطف و مزہ نہیں ہیں۔

حلف۔ عہد وپیمان اور قسم کے معنی میں تین لغت آتے ہیں۔ بفتح اوّل وسکون ثانی۔ بفتح اوّل وکسر ثانی۔ بکسر اوّل سکون ثانی۔ اردو میں بفتحتین بولا جاتا ہے اور غلط العام فصیح میں داخل ہے۔

حماقت اصل لغت بفتح اوّل ہے مگر اردو میں بکسر اوّل فصیح ہے۔

حَوصَلہ۔ (بفتح اوّل وبفتح صاد) اصل معنی پرندے کا پوٹا یعنی معدہ۔ کولے کی ہڈی نہیں مجازی معنی جرأت وہمت۔

خاصیت۔ دراصل صاد بھی اور (ی) بھی دونوں مشدد ہیں

خجالت۔ اردو میں بکسر اوّل بھی فصیح ہے۔

خراماں۔ خرامیدن کا اسم فاعل سماعی ہے۔ ٹہلنے والا۔ بکسر اول ہے بالفتح نہیں۔

خیساندہ۔ بکسر اول بیائے معروف ہے۔ خساندہ (بغیر یا) صحیح نہیں۔

ذوالفقار۔ فقار بفتح اول۔ ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تلوار کا نام ہے۔ اس پر ہڈی کے مہروں کی طرح ابھار بنے ہوئے تھے۔ اس کا ترجمہ دو دھاری تلوار کرنا غلط اور خلاف واقع ہے۔

ذہانت۔ اصل میں بفتح اول ہے۔ اردو میں بکسر اول بھی فصیح ہے۔

رباط۔ بکسر اول ہے بالفتح نہیں۔ اسی کے معنی بندھن بھی ہیں اور مسافر خانہ بھی۔

رحل۔ بفتح اول ہے۔ بکسر اول نہیں۔ اس کے معنی منزل، سواری، مرجع وغیرہ۔ اسی سے تپائی مراد لی جاتی ہے۔

رحم۔ بچہ دانی کے معنی میں اس کے دو تلفظ ہیں۔ بفتح اول اور کسر ثانی اور بکسر اول و سکون ثانی۔ تیسرا تلفظ بفتح اول و سکون ثانی۔ اس کے معنی مہربانی۔ چوتھا تلفظ بفتحتین عربی میں نہیں ہے۔ فاضل مصنف نے یہ چوتھا تلفظ لکھ کر معنی لکھے ہیں چاولوں کی پنجیری۔ یہ محض اردو میں ہے اور شاذ ہے۔ عربی فارسی میں نہیں ہے۔

رستگاری۔ رہائی و براءت کے معنی میں بالفتح ہے۔ بالضم نہیں۔

رفاہ۔ لغتہً بفتح اول ہے۔ اردو میں بکسر اول بھی فصیح ہے۔

رقم۔ لغت میں بفتح اول و سکون ثانی ہے۔ اردو میں بفتحتین فصیح ہے۔ بمعنی لکھنا، نیز علامات اعداد وغیرہ۔

سفال۔ (بکسر اول) مٹی کا ٹھیکرا یا برتن۔

سرہانا۔ وہ جگہ جہاں تکیہ رکھا جاتا ہے۔ بالین تکیہ کو کہتے ہیں۔ سرہانے کو نہیں۔

سفید۔ لغتہً بکسر اول و دوم و یائے معروف ہے لیکن اردو میں بفتح اول و دوم و یائے مجہول فصیح ہے۔

سنون ۔ بمعنی منجن ۔ بفتح اوّل ہے بالضم نہیں ۔

شتم ۔ (بفتح اوّل) مصدر ہے بمعنی گالی دینا ۔ گالی کو عربی میں شتیمہ کہتے ہیں ۔

شجرہ ۔ کے معنی درخت ہے چونکہ نسب نامہ کو بطور زینت درخت کی صورت میں درج کرتے ہیں اس لئے اس کو شجرۂ نسب کہتے ہیں ۔ صرف شجرہ کے معنی نسب نامہ کے نہیں ہیں ۔

شمع ۔ بفتح اوّل وسکون ثانی ہے ۔ بفتحتین نہیں ۔

صلا ۔ (بفتح اوّل) یہ در اصل بالف مقصورہ ہے ۔ اس کے معنی وہ آگ جو مسافروں کی آگاہی اور راہ نمائی کے لئے خیمہ یا گھر کے باہر جلائی جائے ۔ یا ریگستان عرب کے بدویوں کی عادت اور معمول تھا ۔ اس کے مجازی معنی اذنِ عام ہیں ۔ بلاوا یا پکار یا دعوت نہیں ۔

ضلع ۔ اس کے اصل معنی پسلی کے ہیں بسکون لام و بفتح لام لغۃً دونوں طرح صحیح ہے ۔

عرض ۔ (بفتح اوّل وسکون ثانی) پیش کرنا ۔ التجا اور چیز ہے ۔

عروض ۔ (بفتح اوّل) علم عروض وہ علم ہے جس میں شعر گوئی کے قواعد و ضوابط اور اوزان و بحور وغیرہ کا بیان ہوتا ہے تقطیع بھی اس کا ایک شعبہ ہے ۔

عفونت ۔ بضمتین صحیح ہے بفتح اوّل غلط ۔

علیٰحدہ ۔ یہ دو لفظ ہیں ۔ علیٰ + حدہ ۔ دوسرا لفظ بکسر اوّل و فتح دوم بروزن صلہ و گلہ ۔ مادہ "وحد" حدۃ کے معنی منفرد ہونا مستثنیٰ ہونا ۔

علاقہ ۔ بکسر اوّل اور بفتح اوّل دونوں طرح صحیح ہے معنی ہیں تعلق ۔ عربی میں دونوں کے معنی میں ذرا سا فرق ہے ۔ بالکسر اوّل کے معنی تعلق ظاہری جیسے تسمہ سے باندھنا وغیرہ ۔ اور بالفتح کے معنی تعلق باطنی جیسے محبت یا عداوت ۔ مگر اردو میں یہ فرق نہیں ہے ۔

عوج بن عوق ۔ دونوں لفظ بضم اوّل ہیں بالفتح نہیں ۔

غدود ۔ عربی لغت میں غُدَّۃ (بضم اوّل و دال مشدد) بمعنی گلٹی ۔ اس کی جمع غُدَد

(بضم اوّل و فتح دوم) بروزن پُرچ ہے۔ اُردو میں غدود اسی کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

قرأت۔ بروزن عبارت صحیح ہے۔ بروزن عبرت غلط اور قابلِ ترک ہے۔ الف ساکن کے بعد ہمزہ مفتوح ہے۔ ہمزہ الف کے اوپر نہیں ہے۔

قوس قزح۔ اُردو میں اس کو دھنک کہتے ہیں۔

قہر۔ لغوی معنی ہیں دوسرے پر زبردستی سے غالب آنا۔ اُردو میں غیظ و غضب کے معنی میں بولتے ہیں۔

گروہ۔ اُردو میں بکسر اوّل فصیح ہے۔

گوارا۔ اُردو میں بفتح اول فصیح ہے۔

گھایل۔ صحیح لفظ بفتح یا ہے ہمزہ نہیں ہے۔ پایل بھی اسی قبیل سے ہے۔ قافیہ پھیل اور میل کے ساتھ درست ہوگا لیکن بعض شعرا نے قائل مائل کے ساتھ بھی قافیہ باندھا ہے۔

گٹھڑ۔ گٹھڑی کوٹھڑی پٹڑا پٹڑی کٹھڑا۔ اہل دہلی ڑائے ہندی سے بولتے ہیں۔ یوپی والے رائے قرشت سے بولتے ہیں۔ یہ علاقائی لہجے کا اختلاف ہے۔ ٹھیکرا اور ٹھیکری کو اہل یوپی ٹھیکڑا اور ٹھیکڑی کہتے ہیں۔

متعارف "جانا پہچانا" کے معنی میں بفتح را صحیح ہے۔

مجالست۔ صحیح معنی ہم نشین ہونا۔ مل بیٹھنا۔

مُرتہن۔ بکسرہ ہا۔ وہ شخص جو کسی کی چیز کو اپنے پاس بطور رہن رکھتا ہے اور بفتح ہا کے معنی وہ چیز جو رہن کے بدلے میں لی جائے۔ اور جو چیز گروی رکھی جائے وہ مرہون۔ گروی رکھنے والا راہن۔

مرچ۔ اُردو میں بکسر اول و فتح دوم فصیح ہے۔

مسل۔ سین سے غلط ہے۔ ث سے صحیح ہے۔ اس کے متعلق مفصل بحث اخبار "ہماری زبان"

مؤرخہ یکم دسمبر ۸۴ء میں شائع ہو چکی ہے۔

مُسوَّدہ۔ (بضم اول و فتح ثانی و تشدید واو مفتوح) بروزن مؤرخہ بھی صحیح ہے۔ اور بضم اول و سکون دوم دال مشدد مفتوح بروزن مُمتدّہ بھی صحیح ہے۔ البتہ اول الذکر زیادہ مشہور اور مستعمل ہے۔

مُشبِّہ۔ بکسر بائے مشدد کے معنی تشبیہ دینے والا۔ اور بفتح بائے مشدد وہ چیز جس کو تشبیہ دی جائے اور جس چیز سے تشبیہ دی جائے وہ مُشبَّہ بہ ہے۔

مُکحل۔ (بضم میم و فتح حا) آخر میں تائے مدوّر ضروری ہے۔ صحیح لفظ مُکحُلَۃ بضم اول وضم حا ہے۔ بمعنی سرمہ دانی۔ اور مِکحَلَۃ بکسر میم و فتح حا کے معنی ہیں سرمہ لگانے کی سلائی۔

مِنطَقہ۔ لغۃً اس کے معنی ہیں کمر کا پٹکا یا پیٹی۔ جغرافیہ کی اصطلاح میں دس درجہ کے خط عرض البلد کے اندر کرۂ زمین کا حصہ۔ خط استوا سے شمال کی طرف نوے درجہ میں سے ستر درجہ تک آبادی ہے یہی ہفت اقلیم کہلاتے ہیں۔

مَوسم۔ اصل کے لحاظ سے بکسر حرف سوم صحیح ہے لیکن غلط العام کے تحت بفتح حرف سوم فصیح ہے۔ وہ سب الفاظ جن کے مادہ میں حرف اول واؤ ہے (اس کو مثال واوی کہتے ہیں) اس کا اسم ظرف عربی میں بکسر حرف سوم آتا ہے لیکن اردو میں بفتح حرف سوم ہی بولا جاتا ہے۔ اور یونہیں فصیح ہے۔ جیسے مولد، موضع، موقع، موسم، مورد وغیرہ۔

مؤجّل۔ وہ امر جس کے لیے کوئی میعاد یا مدت مقرر کر لی جائے۔ اس کے معنی جلد نہیں ہیں جلدی کے معنی میں مُعجَّل (دوسرا حرف عین) ہے۔

نژاد۔ بکسر اول ہے۔ بالفتح نہیں۔ معنی اصل نسل نسب۔

ندامت کے معنی پچھتاوا۔ اور پچھتانا شرمندگی نہیں۔ (بفتح اول ہے)

نقض۔ اس کے معنی ہیں توڑنا۔ نقضِ امن کو توڑنا۔ فساد پیدا کرنا۔ (بفتح اول ہے)

نیت ۔ یہ تشدید یا اور تخفیف یا دونوں طرح صحیح ہے ۔

ورثاء ۔ وارث کی جمع ورثہ بفتحتین اور طالب کی جمع طلبہ آتی ہے ۔ وُرثاء اور طُلباء غلط ہے ۔

وزارت ۔ بفتح اول بھی صحیح اور بکسر اول بھی صحیح ۔

ہرج ۔ (بفتح اول وسکون ثانی) اس کے معنی ہیں فتنہ وفساد، مارکاٹ ۔ اور حرج (بجائے حطی) بفتحتین کے معنی ہیں گناہ یا باز پرس اُردو میں جس معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ حائے حطی سے ہے ۔ حرجہ خرچہ کا محاورہ بھی اسی سے بنا ہے ۔ یاد رکھیے اس کو بہائے ہوز لکھنا غلط ہے ۔ ہرج اور حرج دونوں لفظ عربی ہیں ۔ (ع میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا)

ایک محاورہ خواتین میں رائج ہے ۔ ہرج مرج ۔ اس کے معنی ہیں ۔ اضطراب تشویش گتھم گتھا فتنہ فساد ۔ یہ عربی محاورہ ہے ۔ اس کے دونوں جز خالص عربی ہیں ۔ (بفتح اول وسکون ثانی) جب کچھ رقم پس انداز کرتی ہیں تو کہتی ہیں ۔ ہرج مرج کے لئے لگا رکھی ہے ۔ بھئی ہرج ہے مرج ہے کیا خبر کسی وقت کیا ضرورت پیش آجائے ۔ اُردو میں دونوں لفظوں کا تلفظ بفتحتین ہے ۔ فرہنگ آصفیہ میں عربی لغات سے ان لفظوں کی تشریح نقل کر دی گئی ہے ۔ اُردو میں بطور محاورہ عام طور پر رائج ہے یہ نہیں کھولا ۔ یہ مؤلف کا سہو ہے فارسی میں یہ محاورہ آیا ہے ؎

از ہجوم ہرج مرج آزادگاں در فتنہ اند   وز دو فور جور و ظلم آئینہ ہا دار و غبار
من و خیالِ لبش، ہرج مرج دہر نگر   کہ گاہ بلک مگس می شود شکر زارے

(بہار عجم)

بعض لوگ تلفظ میں غلطی کرتے ہیں ۔ اس میں یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ دوسرے لفظ کو مرض خیال کر کے (ہرض مرض) ہرز مرز کہدیتے ہیں ۔ اس صورت میں "ہرز" کو تابع مہمل مقدم قرار دیتے ہیں ۔ یہ محض غلط فہمی ہے صحیح ہرج مرج ہی ہے ۔

اختلاف تلفظ سے تین لغت اور اُبھر آئے ۔ ہرض ۔ ہرز ۔ مرز عربی ہیں یہ تینوں

مادے ہیں۔ مگر ہمارے مضمون سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

عنوان نمبر ۲

اس کے بعد فاضل مصنف نے دوسرا عنوان قائم کیا ہے "الفاظ ذیل کے صرف پہلے حرف متحرک ہیں" یعنی حرف اوّل متحرک اور دوسرا ساکن ہے۔ اس عنوان کے تحت جتنے الفاظ ہیں اُن میں سے جو غلط درج ہوئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں :۔

برص۔ بفتحتین صحیح ہے۔ بسکون دوم غلط۔

سرف۔ عربی میں بیجا خرچ کرنے کے معنی میں بفتحتین ہے۔ مگر یہ لفظ اُردو میں استعمال نہیں ہوتا۔ اُردو میں اس کا باب افعال اسراف۔ بیجا خرچ کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ مسرف بضم اوّل اس کا اسم فاعل ہے۔

عمق۔ بضم اوّل وسکون ثانی۔ اور بضمتین دونوں طرح صحیح ہے۔

قطب۔ بضمتین بھی صحیح ہے اور بسکون ثانی بھی صحیح۔

لحد۔ اگرچہ صحیح بفتح اوّل وسکون دوم ہے۔ مگر اُردو میں غلط العام فصیح کے تحت آتا ہے۔ شعرا نے ابد اور صمد کے ساتھ اس کا قافیہ باندھا ہے۔

عنوان نمبر ۳

اس کے بعد فاضل مصنف نے تیسرا عنوان قائم کیا ہے "الفاظ ذیل میں دو حرف متحرک ہیں" ان میں سے مندرجۂ ذیل الفاظ قابل توجہ ہیں۔ (علاوہ ان کے جن کو پہلے لکھا جا چکا ہے)

خذف۔ (بفتح اوّل وسکون ثانی) کنکری پھینک کر مارنا۔ عربی لفظ ہے۔ اُردو میں رائج نہیں۔

خزف (بفتحتین) یہ بھی عربی لفظ ہے۔ پکائی ہوئی مٹی۔ ٹھیکرا۔ ٹھیکری۔

طرف۔ بیشک بفتحتین ہے۔ مگر اساتذہ نے بسکون دوم بھی باندھا ہے۔ قاآنی کا شعر ہے۔

لب غنچہ رخ لالہ بروں آوردہ تبخالہ ز بس باران انداں ژالہ بطرف گلشن وصحرا

اُردو میں بفتحتین ہی صحیح ہے۔

عنوان نمبر ۴

فاضل مصنف کا چوتھا عنوان ہے "الفاظ ذیل میں نون غنہ نہیں ہے" مندرجہ الفاظ میں مجھے اختلاف ہے پچ چلا، کوارا، کواری، کیچوا، گھاس۔ ان الفاظ میں بزبان اہل دہلی یقیناً نون غنہ ہے۔ اور یا نون غنہ فصیح ہے۔

عنوان نمبر ۵
"الفاظ کی غلط تانیث"

تازہ ۔ فرماتے ہیں کہ اس کی تانیث "تازی" غلط ہے"۔ حالانکہ مؤنث کے لئے تازی کا لفظ عام طور پر رائج ہے ۔ تازی روٹی، تازی ہوا، تازی چائے، تازی روشنائی، تازی مٹھائی وغیرہ ۔ اہل دہلی کے لہجے میں یوں بھی فصیح ہے ۔ (مزید وضاحت عنوان ۱۹ میں دیکھو)

ذرا ۔ اس کو فاضل مصنف نے زائے ہوز سے لکھا ہے اور اس کی تانیث (ذری) کو غلط قرار دیا ہے ۔ واضح ہو کہ یہ دونوں خیال سراسر غلط ہیں ۔ ذرا تبدیل شدہ تلفظ ہے ذرہ کا معنی مقدار قلیل ۔ کمتر، حقیر، اس معنی میں یہ لفظ اپنی اصلی صورت میں (بہ تشدید را و بہائے مختفی) متقدمین کے کلام میں موجود ہے ۔ دیکھو کلیات سودا مطبوعہ نولکشور ص ۲۲۴ و ۳۱۲ ۔

تا‌ئش سے زمین کے ذرہ جو اچک جائے عنان ۔۔۔ مالے جوں روئے زمین پشت فلک کو وہ کھندل

جامہ پہنے ہوں جس کے دامن کو ۔۔۔ ذرہ آلودگی کہیں سے نہیں

بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں :-

الطاف و کرم غیروں پہ رہتا ہے تمہارا ۔۔۔ تم جلتے ذرہ بھی نہیں مان کسی کا

سن لے او کافر بدکیش ذرا دھیان سے بات ۔۔۔ جھوٹ کہتے نہیں ہم کہتے ہیں ایمان سے بات

(دیوان اول)

(باقی آئندہ)

قسط ۲

حکومتِ برطانیہ کے پہلے قاضی القضاۃ

مولانا نجم الدین علی خاں علوی ثاقب کاکوروی

سعود انور علوی کاکوروی ۔ ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

مفتی حکیم الدین خاں: آپ مولانا قاضی القضاۃ کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے آپ نے بھی جملہ علوم کی تحصیل و تکمیل اپنے والد، ملا عماد الدین لبکنی اور مولوی فضل اللہ نیوتنوی سے کی حضرت شاہ محمد کاظم قلندر (م ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) سے بیعت کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمۂ ججی میں سر رشتہ دار ہوئے پھر صدر امینی کے عہدہ پر مامور ہوئے اس کے بعد عہدہ صدر الصدوری سے پنشن لے کر کاکوری میں مستقل قیام کیا۔ مطالعہ کا بہت شوق تھا ایسا کہ انتقال کے وقت بھی ہدایہ کی شرح فتح القدیر پاس موجود تھی ۱۰ جمادی الاول بروز شنبہ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء کو وفات پائی اور اپنی والدہ کے حظیرہ واقع محلہ کمہاری کنواں چاند محل کاکوری میں جانب مغرب دفن ہوئے۔

آپ کے صاحب زادے محی الدین خاں ذوق نے تاریخ کہی۔

الحق آں قبلہ دیں قدوۂ خاصانِ خدا زیں جہاں بارسفر بست سوئے دار بقا

۱۸۵۳ء ۱۲۶۰ف

کلک ما سال وفاتش بہ صد آلام نبشت روز شنبہ دہم از شہر جمادی الاولیٰ

سمبت ۱۹۰۹ ۱۲۶۹ھ

قاضی علیم الدین خاں خلف سوئم قاضی القضاۃ صاحب اپنے عہد کے ایک جید عالم تھے کتب درسیہ کی تکمیل اپنے والد ماجد، مولانا عبدالواجد خیرآبادی، مولوی فضل اللہ نیوتنوی اور ملا عماد الدین لکھنوی سے کی کچھ عرصہ عدالت میں مفتی رہے پھر قاضی ہوگئے جس وقت قضا کا محکمہ تخفیف میں آیا تو اپنی دیانتداری ذہانت وذکاوت، قوت استعداد کامل، سرعت انتقال ذہن اور حسن کارگذاری کے صلہ میں صدر اعلیٰ مقرر ہوگئے بیشتر وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا حضرت شاہ محمد کاظم قلندرؒ سے بیعت تھے۔ ۷ ار ماہ ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۲ء کو کاکوری میں وفات پائی اور اپنے بھائی مفتی حکیم الدین خاں کے پہلو میں دفن ہوئے۔[۲۵]

مفتی خلیل الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ خلف چہارم مولانا قاضی القضاۃ ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸-۹ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ بدو شعور سے بہت ذہین وطباع تھے کچھ درسی کتابیں اپنے والد ماجد سے اور متوسطات اور انتہائی کتب مولوی روشن علی جونپوری سے پڑھیں۔ اپنے والد کے ہمراہ کلکتہ میں بھی رہے جب قاضی القضاۃ صاحب نے کتاب الجنایات والجرائم فتاوی عالمگیری کی شرح بسیط گورنر جنرل کے حسب فرمائش مرتب کی تو آپ نے بھی ممبر کونسل مسٹر ہانگٹن کی فرمائش پر جو قاضی القضاۃ صاحب کے علوم عربیہ میں شاگرد تھے باب التعزیرات درالمختار کی شرح فارسی میں لکھی یہ دونوں شرحیں گورنر جنرل کے حکم سے طبع بھی ہوئی تھیں۔ عربی کی نثر نگاری میں بڑا ملکہ تھا سفر نامہ میں اس سے متعلق ایک دلچسپ قصہ بھی مذکور ہے۔

۲۴۔ سفر نامۂ لندن ص: ۳۷، تذکرہ مشاہیر کاکوری ص: ۱۳۲

۲۵۔ ایضاً ۳۷ " " : ۹-۲۸۷

علم حکمت وریاضی اور ہیئت میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے حکام اعلیٰ کی تحریک پر ٹھور ضلع کانپور میں عہدہ افتاد پر مامور ہوئے اپنی اقبال مندی کی وجہ سے ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ میں بعمر ۴۸ سالہ غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء) کے عہد میں پانچ ہزار روپیہ ماہوار پر عہدہ سفارت پر مقرر ہوئے بہت سے رفاہ عام کے کام کئے۔ باوجودیکہ حکیمانہ طبیعت تھی تقویٰ و زہد میں اپنے عہد میں یگانہ تھے۔ آپ کی تصانیف ہیں۔

۱۔ شرح باب التعزیرات درمختار بزبان فارسی

۲۔ رسالہ در تحقیق مرض ہیضہ بزبان عربی

۳۔ مراۃ الاقالیم قواعد فن ہیئت میں فارسی زبان میں غازی الدین حیدر کی فرمائش پر تحریر کی۔

۴۔ رسالہ دربیان جغرافیہ طرق وشوارع احاطہ اودھ بزبان فارسی

۵۔ رسالہ طول البلد و عرض البلد و غایۃ النہار

بیعت حضرت شاہ میر محمد قلندر (م ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸) برادر خورد حضرت شاہ محمد کاظم قلندر سے تھے۔

۱۵ ماہ جمادی الاول ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء کو ۸۷ سال کی عمر میں کاکوری میں وفات پائی اور خانقاہ کاظمیہ کے نزدیک اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔

قطعہ تاریخ وفات مولوی محی الدین خاں ذوق نے کہی۔

فغاں کامروز مولانا خلیل الدین ذوقا	نہادہ داغ حسرت بر دل آں عم جلیل ما
بسال رحلت آں تمام منزل زد رقم کلکم	بیلے گلہیں زاتوا رجنان آمد خلیل ما

۱۲۸۱ھ

---

۲۶ سفرنامہ لندن ص: ۲۰۵ تذکرہ مشاہیر کاکوری ص: ۵۱-۱۴۶

تصانیف : ۔ قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین علی خاںؒ نے درج ذیل تصانیف تحریر کیں ۔

۱۔ شرح کتاب الجنایات والجرائم فتاوی عالمگیری ۔ یہ بسیط شرح آپ نے نواب گورنر جنرل کی ایما و فرمائش پر لکھی تھی تمام انگریزی عدالتوں میں جس قدر فیصلے ہوتے تھے وہ سب اسی شرح کی بنا پر ہوتے تھے ۔ یہ شرح سرکار انگریزی کے حکم سے کلکتہ میں فارسی زبان میں طبع ہوئی تھی ۔

۲۔ رسالہ السنۃ الجبریہ فی الجبر والمقابلۃ : اس رسالہ میں اہم مسائل جبر و مقابلہ کا حل لکھا ہے اور خود ہی اس رسالہ کی فارسی شرح بھی لکھی جو معہ اصل متن کے کلکتہ سے طبع ہوئی ۔

۳۔ رسالہ دربیان تناسب اعضائے انسانی

۴ رسالہ دربیان سعد و نحس

۵۔ شرح اخلاقی جلالی

۶۔ رسالہ انساب

۷۔ کشکول موسومہ بہ بیاض رشک ریاض : یہ غیر مطبوعہ رہی ایسا کہ سفرنامہ کے مولف لکھتے ہیں کہ افسوس کہ یہ بیاض چھپ نہ سکی ہے ورنہ بڑی مفید عام تالیف ہوتی ۔ کیوں کہ اس میں متعدد علوم و فنون کے بہت بسیط مضامین و مباحث درج ہیں آپ کے عربی و فارسی اشعار اور قصائد بھی درج ہیں اس بیاض کو ۵ محافل پر منقسم کیا ہے ۔ مثلاً محفل اوّل علم تفسیر سے متعلق محفل دوم علم حدیث سے متعلق ہے الخ ۔

ان تصنیفات و تالیفات کے علاوہ معقولات کی کتابوں پر آپ کے حواشی بھی ہیں ۔

عربی نثر نگاری بھی بے تکلف کرتے تھے ۔ قارئین کی دلچسپی کے خیال سے نمونہ دو مثال معہ ترجمہ کے درج ہے جسے نواب رضا حسن خاں علوی کاکوروی (سنہ ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء تا سنہ ۱۲۶۶ھ ۱۸۵۰ء)

نے مطارح الاذکیا (عربی) میں نقل کیا ہے۔ درج ذیل عبارت سے جہاں آپ کی نثر نگاری پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں تاریخ گوئی میں ملکہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔

حامداً و مصلیاً و مسلماً توفی الادیب المحقق والادیب المدقق القسیس وحید دھرہ و فرید عصرہ سند الشعراء وابلغ الفصحاء صائغاً صوغ التبر الاحمر انشائہ الفائق المنیع وناظماً نظم الدر والجواھر شعرہ الرائق البدیع ناشراً لمن یحضرہ تحف النوادی لالی اشعار باللسان الفارسی والضادی الشیخ غلام قطب الدین العباسی الہ آبادی سلخ ذیقعدۃ المنسلکۃ فی شھور السنۃ السابعۃ والثمانین الواقعۃ فی المائۃ الثانیۃ من

بعد حمد و سلام کے واضح ہو کہ محقق ادیب مدقق فاضل جو اپنے زمانے میں یکتا اور منفرد تھے، شعرا کے لئے سند اور فصحا میں سب سے زیادہ بلیغ اور کندن کے مثل تھے۔ اُن کی نثر بہت بلند پرداز اور نظم موتی اور جواہرات کی طرح مرصع ہوئی ان کے اشعار بڑے نادر زمانہ ہیں وہ اُن لوگوں پر جو اُن کی مجلسوں میں حاضر ہوتے اپنے فارسی اشعار جو موتیوں کے مانند ہیں بکھرتے تھے۔ اُن کا نام شیخ غلام قطب الدین عباسی الہ آبادی تھا اُن کی وفات ذیقعدہ کی اخیر تاریخ ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۴ء کو اس وقت ہوئی جب کہ وہ اپنے

۲۷- نواب رضا حسن خاں سے متعلق احقر کا مضمون "ایک جواں مرگ گمنام فاضل اصل رضا حسن خاں علوی کاکوروی" ماہنامہ "برہان" ندوۃ المصنفین دہلی ماہ نومبر ۱۹۸۳ء ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۱۲

۲۸- شاہ غلام قطب الدین الہ آبادی ابن شاہ محمد فاخر بن شیخ خوب اللہ الہ آبادی یکم محرم ۱۱۳۸ھ / ۱۷۲۵ء کو پیدا ہوئے علوم ظاہری کی تعلیم مولوی برکت اللہ الہ آبادی کی خدمت میں رہ کر کی۔ اپنے والد کے مرید و خلیفہ تھے۔ مثنوی نان و قلیہ (در جواب نان و حلوہ) اور بستان الحنفیہ نیز ایک فارسی دیوان ان کی یادگار ہیں۔ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے قبہ کے داہنی جانب مدفون ہوئے۔

الالف الثانی من الهجرة
النبویة علی صاحبها الالف
الصلوٰة والتحیة بعد ما خرج
من وطنه المالوف مریدًا
لاداء حج بیت الله وزیارة
قبر نبیه ومصطفاه فی رفقه صلحاء
وتبعة اتقیاء وطے مراحل البرالی
ان قد قارب مرکب البحر فلما
وصل الی بلاد الحجاز ونزل
من ظهر ذلك الجماز ولم یکن
حینئذٍ آوان الحج واداء نسك
الحج ولج فی المکة المعظمة لیعتمر
فاما فیه شهورًا ثم سار فی
الطیبة الطیبة زادها الله تعالیٰ
بهاء ونورا حتی تشرف بتقبیل
عتبة النبی علیه الصلوٰة والسلام
وزیارة قبور بعض صحابته
واهل بیته المدفونین فی ذالك
المقام واذا اقترب الموسم فرجع
معادو الی ام القری فلحقه
فی جوف فنائها ومن الوبیل

وطن سے حرمین شریفین کی زیارت کے ارادہ
سے نکلے تھے بہت سے نیک اور متقی
حضرات ان کی ہم نشینی وہم سفری میں تھے
انھوں نے خشکی کے راستہ سے
سفر طے کیا جب وہ حجاز پہنچے اور اونٹ
کی پشت پر سے اُترے تو چونکہ
حج اور اس کے ارکان ادا کرنے کا
موقع و موسم نہ تھا لہٰذا وہ مکہ معظمہ
میں عمرہ کی نیت سے مقیم ہوئے۔
اور کئی ماہ بعد مدینہ طیبہ اللہ اس
کی قدر و منزلت میں اضافہ فرمائے
یہاں تک کہ آستانۂ روضۂ مبارکہ
صلی اللہ علی ساکنہ وسلم کو بوسہ دینے
سے اور ان صحابہ واہل بیت اطہار رض
کے مزارات کی زیارت سے جو وہاں
مدفون ہیں مشرف ہوئے۔ جب حج
کا زمانہ آیا تو مکہ مکرمہ واپس ہوئے
لیکن راستہ میں بدہضمی کے مرض میں
مبتلا ہوئے اور کوچ کا نقارہ بج گیا
خدائے برتر نے ان کو اسی سرزمین
مبارک میں موت عطا فرمائی

وضرب علیه طبل الرحیل
الی ان اماته الله فی تلك البقعة
المبارکة ودفن هناك اللهم
ارض عنه منتهی کرمك ورضاك
ولله دره وعلیه سبحانه اجره
حیث وقعت الآیة الکریمة
"ومن یخرج من بیته مهاجراً
الی الله ورسوله ثم یدرکه الموت
فقد وقع علیه اجره علی الله
وکان الله غفوراً رحیماً" للعه
التی نزلت فی جندب بن حمزۃ
حمله بنوه علی سریره متوجها
الی المدینة فلما بلغ التنعیم
شرف علی الموت فصفق
یمینه علی شماله فقال اللهم
هذه لك وهذه لرسولك و
بایعك علی ما بایع علیه رسولك
فمات حمیداً کما ذکر فی سیر
البیضاوی وغیر من کتب التفاسیر
مناسبة نشان ذلك العالم الهمام
لحبرالقمقام بل یخرج منها

اور وہیں دفن ہوئے۔ اللہ اُن سے اپنی انتہائی مہربانیوں کے ساتھ راضی ہو ان کی خوبی اللہ ہی کے لئے ہے اور وہی ان کو اجر دیگا اس آیت کریمہ سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے "جو اللہ اور اس کے رسول کی جانب ہجرت کرتا ہے ہوا نکلا پھر اُسے موت نے آلیا تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے"

جو جندب بن حمزہ رض کے حق میں نازل ہوئی تھی جب ان کے بیٹے انھیں پلنگ پر اُٹھاکر مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہوئے تھے لیکن جب مقام تنعیم میں پہنچے تو قضا آگئی انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھا اور کہا اے اللہ یہ تیرا ہاتھ ہے اور یہ تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ میں اس پر بیعت کرتا ہوں جس پر تیرے رسول ص نے بیعت کی تھی جیسا کہ بیضاوی اور دوسری کتب تفاسیر

تاریخ عام وفاته بصنعة غریبة
متعجبة الافهام وطریقه: انه
یقال فی معنی قوله تعالی ومن یخرج
من بیته ان لفظ من باعتبار عدده
الذی هو تسعون یخرج من عدد
لفظ بیته اربع مائة وسبعة و
عشرون مهاجراً الی الله ورسوله
والحال انه یهاجر مجموع ذلک
الی الله ورسوله من جهة اعداده
التی هی اربعمائة واربعة عشر
الی تلک الاعداد الباقیة بعد
الاخراج فتصیر سبعمائة وواحدا
واربعین ثم یدرکه الموت ای
یصله عدد لفظ الموت وهو
اربعمائة وستة واربعون
فالمجموع الف ومائة وسبعة
وثمانون الذی هی سنة ارتحال
ذلک العلام الی دار السلام و
لیعلم ان ذلک تقدیر العزیز العلیم
حیث ودع رکاز هذا البدیع فی زوایا
کلامه القدیم یستخرجه المعتصم

میں مذکور ہے۔ اُنھوں نے اچھی موت
پائی۔ اس بڑے عالم کے مرتبہ
کے لائق اس آیتہ سے ہی اُن کی
تاریخ وفات نکلتی ہے اس کا طریقہ
یہ ہے کہ مِن کے ۹۰ عدد بیتہ
کے ۴۱۷ میں سے نکال دیتے تو
۳۲۷ باقی بچے اور الی اللہ و
رسولہ کے ۴۱۴ عدد اس میں
جوڑ دیتے تو ۷۴۱ ہوگئے پھر اس کے
ساتھ موت کے عدد ۴۴۶ جوڑے
تو کل مجموعہ ۱۱۸۷ ہوگیا۔
اور یہی اس بڑے عالم کی
تاریخ وفات ہے اور یہ
پروردگار بزرگ و برتر کی
قدرت ہے کہ اس کے
کلام سے یہ عجیب تاریخ
دستیاب ہوئی جس کو
اس دین متین کی مضبوط
رسی پکڑنے والے محمد
نجیم الدین اللہ اور
اس کے ماں باپ کی بخشش

حبلہ الملتین عبدہ محمد نجم الدین فرمائے اور اس کے ساتھ
ں لہ ولا بوید واحسن الیہا اچھا سلوک فرمانے برآمد
الیہ[۲۹] کیا ہے۔

تعمیہ سے تاریخیں ایسی عمدہ تالیف کرتے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتیں۔

نمونتہً دو مزید درج ہیں:۔

آپ کے شیخ طریقت حضرت کلید عرفاں سیدنا شاہ باسط علی قلندر الہ آبادیؒ
ر ان کی اہلیہ صاحبہ کا وصال ایک ہی روز اور ایک ہی وقت ہوا[۳۰]
چنانچہ آپ نے فاسکن انت وزوجک الجنۃ ایدا سے
سنہ وفات ۱۱۹۶ھ نکالا۔ شاہ باسط علی قلندر الہ آبادیؒ اور اہلیہ صاحبہ کے
ار کے سراہنے یہی تاریخ بخط نسخ لکھی ہوئی ہے۔

حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کاکوروی آپ کے برادر طریقت کا ۱۲۲۱ھ میں
صال ہوا جس پر آپ نے بہ تعمیہ تاریخ نکالی ھو خالد افی الجنات[۳۱]

شاعری: قاضی القضاۃ نے اپنے صاحب زادوں اور مسبوق الذکر
لیفات کے علاوہ اپنا عربی و فارسی کلام بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے آپ کو عربی و فارسی دونوں
نوں میں یکساں قدرت حاصل تھی ذیل میں نمونتہً آپ کا عربی و فارسی کلام پیش کیا جارہا ہے
ہ قارئین کو موصوف کی علمی قابلیت، ذہنی صلاحیت، قوتِ فکر اور عبقریت کا اندازہ

۔ مطارح الاذکیاء و ہدیۃ الاحیاء ۔ رضا حسن خاں کاکوروی ص: ۸۰ ۔ ۷۷

ہ۔ سورۃ نساء رکوع ۱۴ آیۃ اخیرہ

تفصیل کے واسطے ملاحظہ ہو اذکار الابرار مولانا شاہ تقی حیدر قلندر علوی خانقاہ کاظمیہ کاکوری ص: ۲۰۸

۔ اذکار الابرار ص ۲۵۴

ہوسکے۔ آپ کا کلام شوخی، لطافت، رقت قلب، سلاست، برجستگی اور آپ کے ذوقِ سلیم کا ترجمان ہے، ذیل میں ایک مناجات درج ہے جو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رض کی طرف منسوب ہے اس کا مخمس آپ نے کیا ہے جس میں دستور کے موافق اول تین[۳] مصرعے آپ کے اور آخری دو[۲] حضرت رضی اللہ عنہ کے ہیں۔

ذھب النفس لی عن السدد اعجزتنی ولیس ملتحد
سوءھا ساقنی الی الاود یاحبیب الالٰہ خذبیدی
مالعجزی سواک مستندی

یارسولی مقامک ارفع انا داع ببابک فاسمع
قیلک فی شفاعتی انجع کن رحما لذلتی واشفع
یاشفیع الوریٰ الی الصمد

یوم للمرءِ شانہ یغنی یوم من حلیتی یفراحی
یوم عنی المنون لاتجزی اعتصامی سوا جنابک لی
لیس یا سیدی من الاحد

انا فی الابتلاء یالدائین انتجی باشقاء من ھاتین
علۃ الفقر والذنوب فاین عیوعں والک لیس فی الدارین
لعلیل ذلیل معتمد

من یکثر ایاھدی الکونین فادتجالی لان یقلب لین
صلوات علیک فازیدین صلوٰتی علیک فی الماوین
کان متجاوزاً عن المحدد

وعلی سیدۃ النساء قدراً بنت طہ کفی بھا فخرا
ثم سبطیہ طہراً طہرا وعلی اھل بیتہ طرا

وعلی آلہ الی الابد

ھم سماء الھدی لقد ازانوا بدلوا جھدھم وما آنوا

اھما عن ضلالۃ صانوا وعلی التابعین ھم کانوا

لخیام السداد کالوتد

وعلی خیر صحبۃ الاورع وعلی ذی الحیاء والاشجع

وعلی الاعدل الذی ابرع وعلی الصحب کلھم اجمع

ھم نجوم الھدی الی الرشد

یاکرام العلی انا افقر منکم استعین کی اظفر

سائل فی جنابۃ الاطھر استغیثوا العاجز مضطر

ثم واذا یلکم الی المدد

معاصرین علما کے نزدیک آپ کا کیا مقام تھا اس کا اندازہ شیخ احمد یمنی شیروانی کی اُس عبارت سے ہوتا ہے جو انھوں نے آپ کا نمونۂ کلام درج کرنے سے پیشتر لکھی ہے :-

" وھو ھذا قاضی القضاۃ الامجد محمد نجم الدین خاں نجم الھدایت الثاقب مظھر المکارم والمناقب غطمطم العلوم العقلیۃ والنقلیۃ وسفینۃ النجات لمن اھتدی یا نجم فضائلہ الجلیلہ، فثارہ تشذور العسجد ونظامہ من وقف علیہ لم یلھج بغیر الصلاۃ والسلام علی محمد فمن لطایقہ قولہ [32]

۳۲ - حدیقۃ الافراح : شیخ احمد الیمنی الشروانی ص :

قاضی القضات بزرگ محمد نجم الدین خاں رشد وہدایت کے نجم ثاقب ہیں مکارم ہند کے مظہر علوم عقلیہ ونقلیہ کے بحر ذخار اور ان کے لئے جو اُن کے فضائل جلیلہ کے ستاروں سے ہدایت چاہیں ہدایت اور نجات کا سفینہ ہیں ان کی نثر سونے کے بیش قیمت ریزوں کے مانند ہے ان کی نظم ایسی ہے کہ جو کوئی اس کو پڑھتا ہے وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجے بغیر نہیں رہتا" ان کے بہترین اشعار میں سے یہ بھی ہیں۔

لسلمی جمال کشمس الضحیٰ ... لہا جبہۃ قل ھلال یدیٰ

لقد فارقتنی بلا باعث ... وداع الی نقض ذالک لھویٰ

جریٰ من عیونی سیول الدما ... الی اللہ اشکو جری ما جریٰ

لہا قامۃ مثل سرو تمیل ... یداھا کاغصانہ بالصبا

وما لاحظت خدمتی کالعبید ... ولم توف اصلا عہود الحمیٰ

وکانت لہا حلۃ مع صفا ... عن القلب ما زال تجلو القدیٰ

ولی دونہا ھیئۃ الاضطراب ... کحوت عن الماء جاز الثریٰ

فیا ثاقب اصبر ولا تجزعن

لاءت النسا قل فیہا الوفی

تغزل، سلاست وروانی اور برجستگی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

صاد بالخال خلتی خلدی ... کدنی کیدھا فیا کمدی

احرقتنی بنار وجنتہا ... کلمتنی بہدبہا الاہدی

جاوز الصبر غایۃ یالیت ... جورھا ینتہی الی ابدی

نقضت عہدی یوم اذ وضعت ... کفہا بالوشام فوق یدی

واعدتنی زوارتی زورا ... لیلۃ ما رقدت فی الرصدی

فاذا اخلفتہ ثم شکوت ... انشدت فی الجواب بالعدد

قول سلمیٰ و من یضاہیہا　　فی المواعید غیر معتمد

مندرجہ بالا مثالوں سے قاضی القضاۃ صاحب کی قدرت کلام اور رقت قلب کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ درج ذیل فارسی کلام کے نمونہ سے اندازہ ہوگا کہ ان کا فارسی کلام بھی کس قدر لطیف اور اہلِ زبان کی طرح نوک پلک سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں کہتے ہیں :۔

نبی کہ خلق دو گیتی برائے آں باشد　　وجود کامل او ختم مرسلاں باشد
چناں کہ نامہ نویسند و بعد اتمامش　　کنند مہر کہ حجت بدیگراں باشد
نمود مہر نبوت خدا بہ ظہر شس ثبت　　کہ اختتام رسالت برو عیاں باشد

بر پشت فرس بر شدہ در خانۂ زیں باش　　با سیر و تماشائے جہاں خانہ نشیں باش
بر مائدہ اہل دول دست میند از　　از مکسب خود قانع یک نانِ جویں باش
کو ملحد بے باک کجا زاہد یا بس　　بگزیں وہ مشتاق نہ آں باش نہ ایں باش
بادل کہ ز من دوری صد مرحلہ جست　　گفتم کہ ز من دور زدلدار قریں باش
ثاقب بفغاں است ز مصراع نظیری　　بر غم زدہ خندہ زدم گفت حزیں باش

نگاریں پوش شاہ آمد ز تزئینے بہ تزئینے　　بہ شہر از گل رخاں بستند آئینے بہ آئینے
در ایام خزاں برخورد گلچینے بہ گلچینے　　بیاد گل ہم آغوش است غمگینے بہ غمگینے
بہ ترک چشم سازش کردہ کافر کیش زلف او　　پئے قتلم بہم گردید بیدینے بہ بیدینے
چہ خط بر داشتم از طالع مسعود خود دیشب　　چو ہم پہلو شدم در بزم رنگینے بہ رنگینے
چہ سحر آوردہ ثاقب کہ سخن سنجاں　　پیاپے می رسد در گوش تحسینے بہ تحسینے

اے دولت خانہ روشن ز فروغ ایماں بل سماء زہرت فیہ ذکاء العرفان

کہ کمالات ترا وصف تو انم گفتن قد تخلقت باخلاق جناب الرحمان

من ز طلبش بہرور سے بیوستم از دست کسے ندارم مطلب وستم

یک جذبہ ز دوست کار من کرد تمام المنۃ للہ کہ ز مطلب رستم

مراجع و مصادر کتب :-

(۱) "سفر نامہ لندن" یعنی تاریخ انگلستان۔ مولوی مسیح الدین خاں علوی سفیر شاہ اودھ (مخطوط) اُردو کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری

(۲) "بیاض" ڈپٹی امیر حسن صدیقی کاکوروی (مخطوط) اُردو کتب خانہ انوریہ۔ خانقاہ کاظمیہ

(۳) "شجرات الانساب" مولوی ممتاز الدین حیدر کاکوروی (مخطوط) اُردو۔ کتب خانہ انوریہ

(۴) "باقیات الصالحات" مولوی ممتاز الدین حیدر کاکوروی (مخطوط) اُردو

(۵) رپورٹ بابتہ مسائل تعلیم مسلمانانِ ہند۔ مولوی مسیح الدین خاں علوی سفیر شاہ اودھ۔ مخطوطہ۔ سرسید اکاڈمی سرسید ہاؤس مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۶) "نفحۃ الیمن فیما بزدل بذکرہ الشجن"۔ شیخ احمد الیمنی الشروانی عربی (مطبوعہ)

(۷) "حدیقۃ الافراح" " " " " "

(۸) "نزہتہ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر"۔ علامہ سید عبدالحی الحسنی " "

(۹) " مطارح الاذکیا، و ہدیتہ الاحیار"۔ نواب رضا حسن خاں علوی " "

(۱۰) "تذکرہ علمائے ہند" - مولوی رحمٰن علی فارسی (مطبوعہ)

(۱۱) "تذکرہ مشاہیر کاکوری" مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر کاکوری اُردو "

(۱۲) "مفتاح التواریخ" طامس ولیم بیل فارسی "

(۱۳) "آئینہ اودھ" سید شاہ ابوالحسن اُردو "

(۱۴) "تذکرہ صبح گلشن" نواب علی حسن خاں سلیم فارسی "

(۱۵) "اذکار الابرار" مولانا شاہ تقی حیدر قلندر کاکوروی اُردو "

ایک افسوسناک خبر

مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو کراچی (پاکستان) میں حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر ماہنامہ برھان دہلی کی موت کی خبر سُنکر ایک دم سنّاٹا چھاگیا۔ اس دُنیا سے مجھ کو اکیلا چھوڑ کر چل دیئے۔ اور مجھے داغِ مفارقت دے گئے۔

(نوٹ) ان کی موت سے ماہنامہ رسالہ برھان دہلی کے تعمیری کاموں کو ایک زبردست گہرا جھٹکا پہنچا ہے۔ بہرحال یہ صدمہ ہم دونوں خاندانوں کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔

نوٹ:۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی موت سے جو اچانک اس ادارہ ندوۃ المصنفین میں یہ خلا پیدا ہوا ہے، اُس کو کوئی پُر نہیں کرسکیگا ایصالِ ثواب کریں اور مغفرت کی دُعا فرمائیں۔

خادم

عمید الرحمٰن عثمانی۔ صاحبزادہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی

اسلام کا خود مکتفی عائلی نظام

(سلسلہ کے لئے برہان اپریل ۱۹۸۵ء دیکھیے)

اس آیت میں مومنین سے قرآن کا کھلا مطالبہ ہے کہ اگر وہ اللہ اور یوم آخرت کی جوابدہی پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر ان پر واجب ہے کہ اپنے متنازعہ فیہ مسائل میں قرآن و سنت کو ماخذ قانون قرار دے کر انصاف رسانی کی خدمات انجام دیں۔ اولی الامر سے یہاں قاضی مراد ہے۔ اسی طرح البقرہ کی (۲۲۹) ویں آیت میں فَإِنْ خِفْتُمْ کے مخاطب زوجین نہیں بلکہ شخص ثالث ہے۔ فقہی اصطلاح میں اس شخص ثالث کو قاضی کہا جاتا ہے۔ قضاء کی خدمات تو دارالقضاء کے فرائض ہی میں ہیں لیکن مختلف حالات میں ایسی ہی خدمات "جماعت المسلمین العدول" مسلم آربیٹریشن بورڈ یا فریقین کے مقرر کردہ ثالثوں کی جماعت کے ذریعہ بھی انجام دی جاسکتی ہیں۔

آل عمران کی آیات نمبر (۱۰۴) اور (۱۱۰) میں جہاں امر و نواہی کو امت مسلمہ کا فریضہ حیات اور زندگی کا مشن قرار دیا گیا ہے وہیں وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ میں دعوت اسلامی کے فرائض انجام دینے کے لئے مختلف تنظیموں کے قیام اور ان تحریکوں کے استقرار و استمرار کی طمانیت کے لئے ان کی مختلف شکلوں میں ادارہ سازی کا کھلا اشارہ بلکہ حکم ملتا ہے۔ ان میں خلافت اسلامیہ بھی ہے۔ وضع قوانین اور تدوین فقہ کی سرکاری و غیر سرکاری مجالس بھی ہیں، عاملانہ خدمات کے مختلف محکمے بھی ہیں اور اسی طرح عدلیہ کی خدمات کی سربراہی کے لئے دارالقضاء کے ادارے بھی ہیں۔ یہ سب ادارے داعی الی الخیر ہیں اور انہی کے وساطت سے ملت اسلامیہ اپنے آپ کو "خیر امۃ" ثابت کر سکتی ہے۔ اگر

ان اسلامی اداروں کو قائم کرنے میں مسلمان کامیاب نہ ہوں یا ان کے ادارے معطل ہو کر رہ جائیں تو اوامر و نواہی کا فعال مشن بھی وعظ و نصیحت کی محض ایک اصلاحی تحریک بن کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ کا وعدہ تو یہی ہے کہ اس کے متقی بندے اپنے جہد مسلسل اور سعی پیہم سے اقامتِ دین کا بیڑا اٹھالیں تو دینِ حق تمام ادیان پر غالب ہو کر رہے گا۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

قرآن میں جہاں بھی عائلی قوانین کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہاں بار بار مسلمانوں پر بہت سی باتیں فرض کر دی گئی ہیں جن میں بعض انفرادی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض اجتماعی زندگی سے۔ جہاں بھی اجتماعی زندگی کے مسائل سے بحث ہوگی وہاں امارت اسلامیہ کے اداروں کا وجود ضروری ہے مثلاً قرآن کے ان مطالبات و احکام پر نظر ڈالئے۔

كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ (۴: ۲۴) كُتِبَ عَلَيْكُمْ (۲: ۱۸۰) يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ (۴: ۱۱) وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ (۴: ۱۲) تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ (۴: ۱۳) حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ (۲: ۲۳۶) حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۲: ۲۴۱) نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴: ۷) فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ (۴: ۱۱)

اسی طرح ان قرآنی وعیدوں اور انتباہی آیات کا بین السطور مطالعہ کیجئے:

وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ (۲: ۲۲۹) تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۝ الطلاق (۶۵: ۱)

قرآن کی ان آیات میں جو احکام و تلقینات دیے گئے ہیں یا وعدہ و وعید کی جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اسلامی نظامِ حیات کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہیں اور ان کا تحفظ قوتِ قاہرہ اور آمرانہ خدمات ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان احکام کی تعمیل مختلف اداروں ہی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ خاندانی اور معاشری دائرۂ زندگی میں پرسنل لا کی تعمیل کے لئے اسلام کے عائلی نظام کے اندر ہی ایسے مخصوص ادارے موجود ہیں کہ جن کے رواج و قیام کے ذریعہ شریعت کے مطابق انصاف رسانی کا بطریق احسن اہتمام ہو سکتا ہے دارالقضاء کے علاوہ دو مخصوص ادارے اس سلسلہ میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک ادارہ "جماعت المسلمین العدول" ہے اور دوسرا "طلاق التفویض" کا وثیقہ ہے۔

اگر مسلمان کسی ایسے ملک یا مقام پر رہتے ہوں کہ جہاں انھیں اپنے باہمی نزاعات طے کرنے کے لئے دارالقضاء کی سہولتیں حاصل نہ ہوں تو شریعت نے ان کے لئے یہ سہولت رکھی ہے کہ فریقین اپنی مرضی سے تین یا تین سے زیادہ ایسے مسلمانوں کا انتخاب کر سکتے ہیں جو عالم و فاضل، متقی اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوں۔ بتراضی طرفین ایسی جماعت کا قیام عمل میں آنے کے بعد فریقین اس معاہدہ کے ساتھ اپنے متنازعہ فیہ مسائل سپرد ثالثی کر سکتے ہیں کہ اس جماعت کا جو بھی متفقہ فیصلہ ہوگا وہ اس کے پابند رہیں گے۔ ان کا فیصلہ شرعی اعتبار سے قضائے قاضی کے حکم میں ہوگا۔ اگر کسی مقام پر اراکین جماعت کے انتخاب میں فقہ حنفی کا معیار بہت بلند نظر آئے اور وہاں اس معیار کے لوگ مل نہ سکیں تو اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے تلفیق کی مدد سے مالکی فقہ سے مدد لی جا سکتی کہ جس میں اراکین جماعت کے معیار قابلیت میں اتنی [illegible] ایسی صورت میں اصولی تلفیق کی رو سے پورے شرائط کے ساتھ مالکی [illegible] ہوگا۔ اگر ہم شریعت کے اندر مہیا کردہ ان سہولتوں سے استفادہ کرے [illegible]

رہیں تو پھر کبھی بھی اور کہیں بھی نہ حرج کی کیفیت رونما ہوگی اور نہ قضائے قاضی کا مسئلہ پیدا ہوگا۔

خلع تابع طلاق نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کو بعض صورتوں میں اپنے شوہروں سے خلع کے ذریعہ طلاق لینے میں بڑی رکاوٹوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جس کی بنا پر بسا اوقات حرج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور عورتیں معلق زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اگر مستقبل میں کبھی بھی ایسی صورتیں رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کے سد باب کے لئے شریعت میں "طلاق التفویض" کا طریقہ ہے۔ یہ طریقہ ایک ایسے وثیقہ سے عبارت ہے جس کے ذریعہ مرد اپنا اختیار طلاق اپنی بیوی کو منتقل کر سکتا ہے۔ یہ اختیار مطلقاً بھی دیا جا سکتا ہے اور مشروط طور پر بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر اختیار مطلق ہو تو عورت بلا قید مکان و زمان کسی بھی وقت اپنے آپ پر طلاق نافذ کر کے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے اور اس کی شرح ریکارڈ کر لی جاتی ہے جب یہ اختیار طلاق مرد کی طرف سے مشروط کر دیا جاتا ہے تو کابین نامہ میں ان مخصوص باتوں کا اندراج کر دیا جاتا ہے کہ جن کے وقوع پذیر ہونے پر گواہوں کی اس امر پر توثیق ہونے کے بعد ہی بیوی کو اس اختیار کو استعمال کرنے کا حق پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسی صورت میں اپنے آپ پر طلاق نافذ کر کے شوہر سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے۔ عدت بہر صورت لازمی ہے طلاق التفویض کا نامہ بوقت عقد نکاح بھی تکمیل پا سکتا ہے اور کسی بھی وقت بعد میں بھی۔ ملیشیا میں اس کو تعلیق کہتے ہیں۔ اس تعلیق سے طلاق کا مفوضہ اختیار ہی معلق رہتا ہے عقد نکاح پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تفویض کا یہ طریقہ ملیشیا کی اسلامی مملکت میں عام اور لازمی ہے لیکن ہندوستان کے قدیم معاشروں میں اس کو ایک بدشگونی کی علامت سمجھا جاتا ہے کہ عقد کی مسعود

تقریب میں نکاح نامہ کی خوش آئند دستاویز کے ساتھ طلاق التفویض کا ایک الگ وثیقہ بھی لگا دیا جائے۔ ہندوستان کے قدامت پسند ماحول میں اس کو لازمی قرار دینا مناسب نہ سمجھا جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے کہ مخصوص صورتوں میں اس شرعی سہولت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ایسے دولہے جو بغرض اعلیٰ تعلیم یا تلاش روزگار کے لئے ولایت غیر جانا چاہتے ہوں تو ان جیسے لوگوں سے "طلاق التفویض" کا مشروط وثیقہ تحریر کروالینا پیش آئند احتمالات کے خدشات کو کم کرنے یا واقعی ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس سے مقابلہ کرنے کے لئے ایسے وثائق اچھا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

برسوں سے ہم ایسے واقعات دیکھتے آرہے ہیں کہ مختلف اسباب کی بنا پر بیویاں عورتیں مردوں کی زیادتیوں کا شکار ہو کر معلق زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور ان حالات سے گلو خلاصی کے لئے جب وہ فدیہ دے کر یا مہر معاف کر کے خلع مانگتی ہیں تو ان کے شوہر طلاق دینے سے انکار کر دیتے اور ایام جاہلیت کی طرح ان کو یونہی لٹکائے رکھ کر اپنے انتقام کی پیاس بجھاتے رہتے ہیں۔ قرآن نے صریحاً مسلمانوں کو ایسی جاہلانہ حرکات سے روکا ہے۔ اس کا رہنما اصول تو بس اِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ہے سورۂ بقرہ اور طلاق میں یہ صریح آیات موجود ہیں:

فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (۲: ۲۲۹)

پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقہ سے رخصت کر دیا جائے

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (۲: ۲۳۱)

یا بھلے طریقہ سے ان کو روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (۶۵: ۲)

یا بھلے طریقے سے روک رکھو یا بھلے طریقہ پر اُن سے جدا ہو جاؤ۔

قرآن کے ان احکام کے باوجود عورتوں کی زندگی میں تعلیق کا مسئلہ نہ صرف مہذب افراد کے لئے سوہانِ رُوح ہے بلکہ اسلامی معاشرہ کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔ غیر ذمہ دار مردوں کی اسلامی تعلیمات کے خلاف یہ جسارتیں محض قضائے شرعی کے فقدان کی وجہ سے بڑھ گئی ہیں اور کتنی ہی معصوم عورتوں کی زندگیاں مفقود الخبر شوہروں کے فراق یا ظالم مردوں کی اذیتوں سے عذاب جان بنی ہوئی ہیں:

شریعت کے نظام ہی میں قضائے شرعی کے حصول کی مختلف صورتوں میں سہولتیں ہونے کے باوجود ملتِ اسلامیہ ہند میں قضائے قاضی کا مسئلہ اسی لئے پیدا ہو گیا ہے کہ خود مسلمان ہی ان اداروں کے قیام میں مانع و مزاحم بن جاتے ہیں۔ نزاعات رُونما ہونے کے بعد اگر کوئی ایک فریق مسلم ثالثی کے ذریعہ ان کا تصفیہ کرانے سے انکار کر دے، یا جماعت المسلمین کے قیام ہی سے اتفاق نہ کرے اور طلاق التفویض کا وثیقہ لکھنے پر انکار کرتا رہے تو ان کی خود غرضانہ شرارتوں سے شریعت کی مہیا کردہ تمام سہولتیں اور رعایتیں کالمعدوم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ افسوس و ندامت اس بات پر ہے کہ شرعی طریقے اختیار کرنے میں خود مسلمانوں کی طرف سے مزاحمت ہوتی ہے۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

بہرحال ہماری کوتاہیوں نے سماجی زندگی میں اتنی تنگی اور گھٹن پیدا کر دی ہے کہ معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جب بھی متنازعہ مسائل رُونما ہوتے ہیں تو انصاف کی عدم دستیابی کی وجہ سے گنجلک شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ قاضی کی خدمات خلع کو فسخ نکاح میں بدلنے کی حد تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اور بھی مسائل جیسے مفقود الخبر

شوہر کا پتہ لگاتے، اور پتہ نہ لگنے پر اس کی موت کا اعلان کرتے اور اس کا عقد نکاح فسخ کرکے بیوی کو تعلیق کی حالت سے نجات دلانے کے لئے بھی ضروری ہیں۔ اسی طرح اگر شوہر لمبی مدت کے لئے قید کر دیا جائے، لاعلاج امراض شنیعہ میں مبتلا ہو گیا ہو یا نامرد ثابت ہو یا اپنی بیوی کو نان و نفقہ کی ادائیگی میں مسلسل کوتاہی کر رہا ہو یا نشہ کی حالت میں مار پیٹ کرنے کا عادی ہو تو ان تمام صورتوں میں بیوی کے لئے خلع کی وجہ جواز تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن وجوہ جواز کی توثیق اور فسخ نکاح کا فیصلہ کرنا تو بہر حال قاضی ہی کا کام ہے۔ اسی طرح تقسیم وراثت کے مسئلہ میں الجھنیں یا بددیانتی کی شکلیں پیدا ہو جائیں یا محجوب الارث پوتوں اور نواسوں کے ساتھ وصیت کی مد سے صلہ رحمی کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو تو اس کے لئے ثالثی کی خدمات ضروری ہوتی ہیں اور مسلم جج کے فیصلہ کے بغیر متروکہ کی شرعی انداز پر تقسیم کا مسئلہ امر محال بن جاتا ہے۔ ملک میں متصفہ کے اسلامی ادارے موجود ہوں تو ہماری عائلی زندگی کے تمام ہی مسائل مسلم پرسنل لا کی رو سے بآسانی طے ہو سکتے ہیں لیکن موجودہ ماحول میں دارالقضاء کی عدم موجودگی کے باعث یہی عائلی مسائل ایسی گنجلک اور بھیانک شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں کہ ان کی وجہ سے ظلم و زیادتی، ناانصافی اور مختلف قسم کی معصیتیں ہماری سماجی زندگی میں گھر کر گئی ہیں اور نسلاً بعد نسل سے پرورش پا رہی ہیں۔ اگر ان اسباب کا سد باب نہ کیا جائے اور ہمارے مسائل یونہی لاینحل بنے رہیں تو حرج کے ان حالات میں مختلف مفاسد سر نکالتے رہیں گے ہم برسوں سے ان معصیتوں میں مبتلا ہیں اور اغماض کرتے چلے آ رہے ہیں۔ جیسا کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی مشہور تصنیف "الحیلۃ الناجزہ للحلیلۃ العاجزہ" میں بیان کیا ہے سماجی زندگی کے ایسے مایوس کن حالات میں مجبور عورتوں کی زندگی بسا اوقات مردوں کے استحصال اور معصیتوں کا شکار ہو جاتی ہے بلکہ بعض وقت گلو خلاصی کے لئے بات ارتداد

تک چلی جاتی ہے۔ اس غیر اسلامی ماحول کو اگر ہم علی حالہٖ برقرار رکھنے پر مصر رہیں اور شریعت نے ہمیں اپنے عائلی نظام میں انصاف وقضاء کی جو سہولتیں عطا کی ہیں اُن کو قائم کرنے کا آئینی و قانونی اختیار رکھنے کے باوجود اپنے معاشرے میں انصاف رسانی کے اسلامی اداروں کے قیام میں ناکام رہیں، تو یقیناً ہم کل اللہ کے پاس اپنی ان کوتاہیوں اور ناکامیوں کے لئے جواب دہ ہوں گے۔ قرآن نے اس منظر سے پہلے ہی ہمیں آگاہ کر دیا ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ۝ النساء ۴: ۴۱-۴۲

ترجمہ: پھر سوچو کہ یہ اس وقت کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیںگے اور ان لوگوں پر تمہیں (یعنی آنحضورؐ کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے رسول اکرمؐ کی بات نہ مانی تھی اور نافرمانی کرتے رہے تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے چھپا نہ سکیں گے۔

تکلیف شرعی کے اس احساس کے ساتھ حیدرآباد دکن کے چند ذمہ دار حضرات نے سیکولر ہندوستان میں قضائے شرعی کے فقدان کے مسئلہ پر غور وخوض شروع کیا اور مزید سوچ و بچار کے لئے صدر مجلس علمائے دکن اور جمیعۃ العلماء آندھرا پردیش کے زیر اہتمام ایک وسیع مجلس ترتیب دی جو علماء، دانشور اور قانون داں

حضرات کے علاوہ مختلف مکاتبِ خیال اور جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل تھی مختلف
اجلاس میں ان حضرات نے مسئلہ کے شرعی، سماجی، سیاسی اور قانونی پہلوؤں پر خوب
غور و فکر سے کام لیا اور کافی بحث و نظر کے بعد چند متفقہ نتائج اخذ کرتے ہیں کامیاب
رہے ہے مسئلہ دراصل قوت نافذہ کا تھا جو فی الوقت ہماری سیکولر عدالتوں کے ہاتھ
میں ہے۔ ان عدالتوں کے فیصلوں کے مسلمانوں پر شرعاً عدم نفاذ کے متفقہ فقہی حکم کو
کسی نے بھی چیلنج نہیں کیا اور مسلم قضاۃ کے لئے ان اختیارات کا مطالبہ کرنا یوں ناممکن
الحصول قرار دیا گیا کہ اس سے پہلے تو متوازی عدالتوں کے قیام کا تصور پیدا ہوتا ہے،
اور دوسرے یہ کہ کوئی بھی مملکت، خواہ وہ سیکولر ہو نا مسلم اپنی عدلیہ کا نظام رکھتے
ہوئے دوسری عدلیہ کے قیام کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اسی طرح مسلمانوں کے
عائلی مقدمات کی سماعت و انفصال کے لئے مسلم ججس کے تقرر کے مطالبہ پر بھی غور
کیا گیا۔ شرعی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کا یہ مطالبہ کتنا ہی صحیح اور روا ہی مانا جائے لیکن
مختلف مذاہب کی سیکولر مملکت میں ایسے مطالبہ کو فرقہ وارانہ رنگ دے جانے
کا قوی احتمال محسوس کیا گیا۔ ایک عدلیہ کے لئے کہ جس کے دروازے سبھی کے لئے
یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں ہر فرقہ کے لئے علیحدہ علیحدہ ججس کا تقرر یقیناً ایک بارِ گراں
ثابت ہوگا۔ پارسی ایکٹ کی نظیر پر ایک اور صورت یہ بھی غور طلب رہی کہ عائلی
مقدمات کی سماعت کے لئے مسلم جیوری سسٹم کا مطالبہ کیا جائے۔ اس مطالبہ میں
بھی یہ سقم محسوس کیا گیا کہ گو مسلم جیوری مسلمانوں کے مقدمات کی سماعت میں بحیثیت
مشیر شریک رہے گی لیکن فیصلہ بالآخر کسی غیر مسلم جج ہی کے قلم سے ہوگا اور ایسا فیصلہ
شرعاً مسلمانوں پر نافذ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس مطالبہ کو بھی بے سود سمجھا گیا۔ بعض اراکین
تو اپنے اس خیال پر اڑے رہے کہ حکومت سے مسلمان قضاۃ کے لئے قوت نفاذ کا مطالبہ
کرنا عدلیہ سے دریوزہ گری کرنے کے مترادف اور اگر ایسا مطالبہ منظور اور قابلِ حصول

ہو بھی جائے تو اس سے یہ اندیشے کم نہیں ہوتے کہ اس رعایت وعنایت کے ساتھ ہمارے دینی معاملات میں حکومت کی مداخلت کی راہیں بھی کھل جائیں۔ دینی معاملات میں حکومت کی مداخلت مسلمانوں کے لئے ہمیشہ سے ناپسندیدہ رہی ہے۔ ان تمام صورتوں کے امکانات، اشکالات اور احتمالات پر خوب غور وخوض کرنے کے بعد خود شریعت اسلامیہ کے نظام کے اندر ہی اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی تجویز رکھی گئی۔ ایک تدبیر سب سے زیادہ کارگر نظر آئی کہ خود مسلمانوں کو اس امر کا پابند کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ اپنی عائلی نزاعات مسلم ثالثی یا دار القضاء سے رجوع کرنے اور اس کے فیصلوں کو ماننے کے پابند رہیں گے اور ان مسائل کی حد تک سیول کورٹ جانے سے قطعی احتراز کریں گے اس مقصد کے حصول کے لئے تجویز پیش کی گئی کہ عقد نکاح کے وقت ہی سیاہے میں عاقدین کا یہ معاہدہ بھی مندرج کرا دیا جائے کہ خدانخواستہ ان کے مابین آئندہ کسی بھی وقت کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو تو وہ دار القضاء سے رجوع ہوں گے اور اس کے فیصلہ کے پابند ہوں گے۔ یہ معاہدہ بطور وثیقہ کے دار القضاء کو مقتدر بنانے یا مسلم ثالثی کو مؤثر بنانے کے لئے وقت ضرورت کام آویگا۔

حکومت کا آربٹریشن ایکٹ پہلے ہی سے موجود ہے ثالثی کا انعقاد فریقین مقدمہ کی اتفاق رائے سے عمل میں آئے اور اراکین ثالثی بھی قانون کی پوری متابعت میں اپنا فیصلہ صادر کریں تو نہ صرف عدالت ایسے فیصلوں کو از روئے قانون جائز قرار دیتی ہے بلکہ فریقین کی درخواست پر ان فیصلوں کو عدالتی ڈگری میں بھی بدل دیتی ہے۔ اس طرح دار القضاء کے فیصلے ہوں مسلم آربٹریشن بورڈ کے ہوں یا جماعت المسلمین العدول کے فیصلے ہوں ان سبھی فیصلوں کو مذکورہ بالا ایکٹ کے تحت عدالتی فیصلوں کے مماثل بنایا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ کار کو اختیار کرنے سے ہماری عائلی زندگی کی نزاعات بھی ٹھیٹ شرعی طریقے سے طے ہو سکتی ہیں اور ثالثی یا دار القضاء کے

فیصلوں کو عدالتی ڈگری میں تبدیل کرنے سے وہ خلا بھی پُر ہو جاتا ہے جو قوت قاہرہ یا اختیار نفاذ نہ ہونے کی وجہ سے ہماری معاشرتی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ مسلم پرسنل لا، جو ۱۹۳۷ء کے ایکٹ کی بنا پر ملکی قانون ہے مگر قضائے شرعی کے فقدان کے باعث مفلوج نظر آتا ہے اور بعض صورتوں میں بے اثر معلوم ہوتا ہے، مذکورہ بالا طریقے اختیار کرنے پر ایک جاندار اور موثر قانون محسوس ہونے لگے گا۔

اس احساس کو عام مسلمانوں کے قلوب میں جاگزیں کرنے کے لئے یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ ہر صوبہ کے مستقر پر ایک مرکزی دار القضاء کا قیام عمل میں لایا جائے اور ایک مجلس نظمار کے ذریعہ اس کے تمام انتظامی و دفتری امور چلائے جائیں۔ ان کی شاخیں اضلاع پر قائم کی جائیں۔ دار القضاء میں اعلیٰ قابلیت اور بلند کردار کے مستقل قاضیوں کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ اس کے علاوہ شہر کے مشہور علماء، قانون داں، دانشور اور موظف جیس اور عہدیداروں کا ایک پینل بھی تیار کیا جائے تاکہ وقت ضرورت ان کی خدمات سے استفادہ کیا جا سکے۔

اگر ہم ملک کے طول و عرض میں قضات کے ایسے ادارے قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ملتِ اسلامیہ کی عائلی زندگی میں شریعت کے مقدس قوانین کی تنفیذ و تعمیل میں بڑی سہولتیں پیدا ہو جائیں گی اور عمل صالح کے لئے ایک بڑا میدان فراہم ہو جائے گا۔ حقوق الزوجین اور وراثت کے مسائل میں شریعت سے گریز اور بے اعتدالیاں بسا اوقات فساد کے ایسے سنگین نتائج پیدا کر دیتی ہیں کہ جن سے عائلی و معاشرتی زندگی میں نفرت و عناد کی فضاء پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ فضاء اسلام کی بامروت و محبت آمیز فضاء کے بالکل مغائر ہے۔ مسلمانوں کی سماجی زندگی کو غیر اسلامی فضا کی آلودگیوں سے روکنے کا یہی طریقہ ہے کہ ایسی رائے عامہ تربیت دی جائے کہ جب بھی مسلمانوں میں مناقشات و نزاعات رونما ہوں تو شریعت

کے مطابق دارالقضاء سے اپنے معاملات کے تصفیہ کرانے کے پابند ہیں۔ عام مسلمان یہ محسوس کریں کہ دارالقضاء وہ ادارہ ہے جو ان کے شرعی حقوق کے تحفظ کا ضامن ہے۔ گویا مسلمان مسلم پرسنل لا کے محافظ و امین ہیں اور دارالقضاء ان عائلی قوانین کے مطابق انصاف رسانی کا ضامن ہے۔ فقط

عمید الرحمٰن عثمانی کو گہرا صدمہ

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر و پبلشر ماہنامہ رسالہ برہان کو گہرا صدمۂ داغ

ابھی ابھی والدۂ ماجدہ کے بالکل تازے غم سے دوچار ہوئے چند یوم ہی گزرے تھے
کہ اچانک تیسرے صدمے نے مجھے لپیٹ لیا۔ ایک سال میں میرے حضرت والدِ ماجد
مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اور پھر ان کے بعد والدہ محترمہ کے انتقال نے مجھ کو
کافی بوسیدہ کر دیا تھا جو یہ تیسرا جھٹکا اور مجھے لگا ——— نہایت رنج و غم کے ساتھ
میں یہ اطلاع دیتا ہوں کہ میرے ماہنامہ رسالہ برہان دہلی کے مدیر مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء
مطابق ۳ رمضان المبارک کو سخت علالت کے بعد کراچی (پاکستان) میں انتقال فرما گئے۔ موصوف سب سے
پہلے اس رسالے کے ایڈیٹر چنے گئے یہ واقعہ ۱۹۳۸ء کا تھا میرے والد ماجد حضرت
مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے ان کا انتخاب بڑی سوجھ بوجھ سے فرمایا تھا۔
جنہوں نے ماہنامہ رسالہ برہان کی خدمت میں ایک تعمیری مثال قائم کی اس خلاء کو
جو مستقبل میں اور موجودہ دور میں کوئی پُر نہیں کر سکتا بہرحال وہ میرے لئے محسن اور سرپرست
تھے اس تنہائی میں جو مجھے گہرا دلی صدمہ پہنچا ہے اس کیسے برداشت کیا جائے۔

میرے لئے آپ لوگ صبر وتلقین کی دعا کریں میری یہ کوشش رہے گی کہ رسالے کا معیار اور وقار اسی انداز سے قائم رہے۔ اس میں، میں اپنی طرف سے کوئی فرق نہیں آنے دوں گا۔ میں آپ سے اس سلسلے میں خصوصی تعاون کی درخواست کرتا ہوں۔

میرے کارکنان ادارہ اور برادران حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی موت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں۔

ہندوستان میں ان کے بعد تاریخ کا ایک باب ختم ہوگیا۔

نوٹ:۔ انتقال کی یہ خبر مجھے بذریعہ تار ملی۔ خاص طور پر حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر رسالہ برہان دلی کے لئے ادارہ ندوۃ المصنفین دلی میں اہتمام کیا گیا۔ اس میں شہر کی اہم اور عظیم ہستیوں نے شرکت کی اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے سب نے مجھ سے اظہارِ رنج کیا۔

نوٹ:۔ ویسے کئی برس سے مولانا اپنی اہلیہ کے وفات کے بعد بہت کمزور ہو چکے تھے اور تقریباً ڈیڑھ برس سے رسالے کے کاموں سے صاحبِ فراش تھے لیکن اس کے باوجود رسالے کے نظم میں کوئی کمی نہیں پائی جا سکی مجھ پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان وکرم اور فضل رہا ہے۔

عمید الرحمٰن عثمانی

آپ مضمون نگاروں اور مقالہ نگاروں سے میں یہ استدعا کرتا ہوں کہ اپنے مضامین جو متفرق عنوانات پر ہوتے ہیں رسالہ برہان کی عظمت اور معیار کے مطابق ہی بھیجیں۔ جو محض تحقیقی، ادبی، مذہبی و دینی ہوں جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کی پوری کوشش فرمائیں کہ کسی طرح کا اس میں جھول یا معیار کی گراوٹ نہ ثابت ہو پائے۔ کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا اور عالم ادیب حضرات کی طرف سے مجھے سخت ہدایات موصول ہوئی ہیں۔ آپ کا بے حد مشکور و احسان مند ہوں گا کہ اس کے احترام کی پابندی پوری طرح فرمائیں۔

فقط

عمید الرحمن عثمانی

پرنٹر و پبلشر رسالہ برہان دہلی

فہم قرآن

مؤلفہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی
ایم - اے

قرآنِ مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اور قرآنِ مجید کا صحیح منشاء معلوم کرنے کے لئے شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے۔ احادیث کی تدوین کس طرح ہوئی؟ کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ مثلاً ابوہریرہ رضؓ اور حضرت ابنِ عباس رضؓ کے سوانح حیات اور محدثین کرام کی بے لوث خدماتِ علم و مذہب کو بھی اثر انگیز پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے فہم قرآن ایک خاص رنگ کی علمی تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے جو خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے رجحانات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے فتنۂ انکار حدیث کے اس دور میں اس کتاب کا مطالعہ بصیرت افروز ہوگا صفحات ۲۵۰ قیمت ۲۰/- مجلد

ندوۃ المصنفین - جامع مسجد دہلی

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم صدیق اکبر، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم۔ انقلاب روس، روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔ تاریخ گجرات جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب سرور کونین۔

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ - ۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط۔ اسلامی کتب خانے، عرب و دنیا۔
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم۔ تاریخ روہیلکھنڈ، سرکشی ضلع بجنور۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم، رموز عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبدالحئی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر۔ انتخاب الترغیب والترہیب۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان